سلسلہ مطبوعات ادارہ طاقِ بستان آرہ

(نمبر ۴)

مقام محمود

مرتبہ

عبدالمالک آروی

Marfat.com

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

Marfat.com

Marfat.com

سلسلہ مطبوعات طاق بستان آرہ

نمبر (۳)

مقامِ محمود

یعنی

جناب عبدالمالک آروی کے تاریخی، ادبی

اور انتقادی مقالات کا پہلا مجموعہ

ملنے کا پتہ

منیجر طاق بستان آرہ (بہار)

مطبوعہ جمال برقی پریس دہلی

قیمت ۲/۲

ذخیرہ محمد

Marfat.com

136955

جملہ حقوق

ادارۂ طاق بستان آرہ

کے حق میں محفوظ ہیں

Marfat.com

فہرست مضامین مقام محمود

ابتدا .. .. ۵—۶

دیباچہ .. .. ۷—۸

ادبیات

دہلی اور لکھنؤ اسکول کی شاعری .. .. ۱۰—۵۸

صفیر بلگرامی .. .. ۵۹—۸۰

بہار کا ایک دل والا شاعر قعر گمنامی میں .. .. ۸۱—۹۴

غالب کی اخلاقی کمزوریاں .. .. ۹۵—۱۱۲

آرہ کے دور ادبی کی ایک مختصر تاریخ .. .. ۱۱۳—۱۳۴

تاریخ و اساطیر

عہد ظفر کے تاریخی و سیاسی حالات .. .. ۱۳۶—۱۶۵

دولت خلجیہ کا آخری نظارہ .. .. ۱۶۶—۱۸۵

عہد طاہریہ کی دفاکیش حسینہ .. .. ۱۸۶—۱۸۹

بنی فاطمہؓ کی سیاسی تحریکیں .. .. ۱۹۰—۲۰۸

زاہد فریب جوگن .. .. ۲۰۹—۲۲۶

سلاطین آستانۂ فقرا پر .. .. ۲۲۷—۲۳۱

غربا تخت شاہی پر .. .. ۲۳۲—۲۴۲

خاتون صحرا .. .. ۲۴۳—۲۸۸

Marfat.com

تاریخ طبع مضامین

اردو کے دورِ ادبی کی ایک مختصر تاریخ	مخزن اکتوبر ۱۹۲۹ء
عہد ظفر کے تاریخی و سیاسی حالات	نگار جنوری ۱۹۳۰ء
زاہد فریب جوگن	انکشاف نومبر ۱۹۳۰ء
دولت خلجیہ کا آخری نظارہ	صوفی جنوری ۱۹۳۱ء
بنی فاطمہ کی سیاسی تحریکیں	نگار اکتوبر ۱۹۳۲ء
سلاطین آستانۂ فقرا پر	آئینہ دسمبر ۱۹۳۲ء
غربا تخت شاہی پر	مساوات مارچ ۱۹۳۳ء
بہار کا ایک دل والا شاعر گمنامی میں	ساقی سالنامہ ۱۹۳۳ء
عہد طاہریہ کی وفاکیش حسینہ	مساوات اپریل ۱۹۳۴ء
صغیر بلگرامی	نگار فروری ۱۹۳۴ء
دہلی اور لکھنؤ اسکول کی شاعری	نگار جون جولائی ۱۹۳۸ء
غالب کی اخلاقی کمزوریاں	نگار مارچ ۱۹۳۹ء
خاتون صحرا	تنویر فروری تا اگست ۱۹۳۹ء

Marfat.com

اھداء

ڈاکٹر سید محمود صاحب مدظلہٗ ادب و سیاست دونوں میں جس امتیاز کے مالک ہیں وہ عہدِ حاضر کی ہندوستانی تاریخ کا ایک ایسا صفحہ ہے جس کا پیہم تعارف و مطالعہ کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مختصر سے دورانِ وزارت میں جس وسعتِ قلب اور پاکیزگی ذوق کا ثبوت دیکر علمی خدمت کرنیوالوں کے قلوب پر اپنے خلوص و کرم کا غیر فانی نقش چھوڑا، اس کا اندازہ آسانی سے نہیں کیا جا سکتا۔ مدت ہوئی آپ اپنے منصب سے سبکدوش ہو چکے، لیکن وہ زمانہ ایک یاد بن کر دل پر چھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک لائق وزیر کی حیثیت سے یقیناً اپنا فرض ادا کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ اپنے احساس فرض کے ماتحت طاق بستان کو درخور اعتنا نہ سمجھتے تو آج یہ ادارہ اس منزل پر نہ ہوتا جہاں ہے، طاق بستان کے لئے سابق وزراء سے بھی تحریک کی گئی تھی لیکن اس وجہ سے کہ قدرت کی طرف سے ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر ہے، حکومت نے توجہ نہ کی، لیکن ڈاکٹر صاحب کا یہ بلند احساس فرض تھا جس نے طاق بستان کی ایک ہی آواز پر آپ کو ایک مجہول اور گمنام ادارہ کی سرپرستی پر مجبور کر دیا اس سے جہاں ڈاکٹر صاحب کی فرض شناسی اور بلندی اخلاق پر روشنی پڑتی ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے آپ کو کافی ملکہ عطا کیا ہے کہ کام کرنے

Marfat.com

داؤں کو بھانپ لیں۔ اس وقت ادارہ کے سامنے بہت سے مفید لوائح عمل ہیں، دقتیں حائل ہیں لیکن جو کچھ ہو رہا ہے وہ ڈاکٹر صاحب کے اسی سابق التفات اور ادب نوازی کا منت کش ہے سنہ ۱۹۳۶ء میں بھی آپ نے طاق بستان کو میرے مضامین کا مجموعہ شائع کرنے کے لئے ۲۵ روپے دیئے تھے، اب یہ کتاب "مقام محمود" کے نام سے شائع ہو رہی ہے، خدا کا شکر ہے کہ وزارت مستعفی ہو چکی ہے اور آج میں ایک بے غرض محبت کیش کی طرح ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اپنا ہدیۂ محبت پیش کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں "مقام محمود" ہمارے ولولہ انگیز دورِ حیات کی بہترین یادگاروں میں سے ہے۔

طاق بستان۔ ملکی محلہ آرہ
مورخہ ار جون سنہ ۱۹۴۱ء

عبدالمالک آروی

Marfat.com

دیباچہ

طاق بستان محض چند افراد کی ذاتی کوششوں کی بدولت معرض وجود میں آیا تخیل میں تو اس کی تخلیق مدت سے تھی، لیکن عملی کام ۱۳۴۸ھ سے شروع ہوا ادارہ نے کام کی ابتدا جس طرح کی وہ ایک دلچسپ اور حیرت انگیز افسانہ ہے۔ ہم ان نجی دشواریوں اور عملی راہ کی صعوبتوں کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتے علم نے بے سروسامانی کی فضا میں بھی اپنے تاریخی نقوش چھوڑے ہیں گو اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ علم نے حکومت اور دولت ہی کی آغوش میں نشوونما پائی۔ یہ محض طاق بستان کے مخلص کام کرنے والوں کی جگر کاویوں کا ثمرہ ہے کہ ادارہ بلاکسی معقول سرپرستی کے کام کرتا رہا ہے اور جب تک اس کے ان سر گرم کام کرنے والوں کے دم میں دم ہے کوئی وجہ نہیں کہ اس کا قدم آگے نہ بڑھتا جائے۔

ہم یہاں حکومت بہار اور ریاست حیدرآباد کا شکریہ ادا کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ ادارۂ طاق بستان کو آٹھ سو کی رقم ملی، ڈاکٹر سید محمود صاحب، سرحیدر نواز جنگ (سر اکبر حیدری مدظلہٗ)، علیہ حضرت بیگم صاحبہ مظہر الحق مرحوم اور ہز اکسلنسی صدر (حیدرآباد) نے جس مخصوص توجہ سے کام لے کر ادارہ کے کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی، اس نے ہمارے اندر نئی روح اور نئی اُمنگ پیدا کردی۔

ملک کے ان مشہور اداروں کا بھی شکریہ ادا کرنا ہمارا فرض ہے جنھوں نے مطبوعات طاق بستاں کے نشر و اشاعت میں زبردست حصہ لیا۔ مکتبہ دانش (لاہور)

Marfat.com

ندوۃ المصنفین (دہلی)، مکتبہ جامعہ، کتب خانہ علم وادب (دہلی) صدیق بکڈپو، نگار بک ایجنسی (لکھنؤ) مکتبۂ ابراہیمیہ (حیدرآباد دکن) ایوان اشاعت (گورکھ پور) شاد بک ڈپو (پٹنہ) نے کافی تعداد میں ہماری مطبوعات منگائیں، خصوصیت کے ساتھ اول الذکر پانچ اداروں نے ہماری مطبوعات کے کئی کئی سو نسخے لئے، یہاں تک کہ ڈیڑھ ہزار نسخے بہت قلیل مدت میں ان اداروں ہی کی بدولت ملک کے طول وعرض میں پھیل گئے۔

خصوصیت کے ساتھ حضرت نیاز مدظلہ نے غیر معمولی طور پر لطف و توجہ سے کام لیا اور "نگار" نے طاق بستان اور اُس کی مطبوعات کی اشاعت میں بڑی اعانت کی ان تمام حوصلہ افزائیوں ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم ادارہ کی چوتھی کتاب "مقام محمود" شائع کر رہے ہیں یہ کتاب مجموعہ ہے جناب عبدالمالک آروی کے مضامین کا، اس مجموعہ میں صرف ادبی، تاریخی اور انتقادی مقالات ہیں۔ دوسرا مجموعہ بھی مرتب ہو چکا ہے جو علمی اور فنی مقالات پر مشتمل ہے اور بہت جلد شائع ہو جائے گا۔ تیسرا مجموعہ، جو مذہبیات سے متعلق ہے وہ بھی مستقبل قریب ہی میں غالباً مکتبہ برہان (دہلی) سے شائع ہوگا۔

محمد امیر

رکن ادارہ طاق بستان

Marfat.com

اَدبیّات

Marfat.com

دہلی و لکھنؤ اِسکول کی شاعِری

فلسفہ کے مختلف مسالک، تصوف کے مختلف خانوادوں، فن مصوری و موسیقی کے مختلف اسکول کی طرح شاعری کے بھی بہت سے اسکول گزرے ہیں۔ اور جب تک فطرت انسانی میں تنوع اور طبائع میں اختلاف و تضاد قائم ہے۔ اسی طرح مسلک و اسکول کی تخلیق بھی ہوتی رہے گی۔ صرف فلسفہ یونان کی تاریخ میں سالیس ملیطی سے لیکر فلاطینوس تک تقریباً ایک درجن فلسفہ کے مختلف مسالک کی ہنگامہ آرائیاں رہیں کبھی پیروان زینو فن کو فروغ رہا، کبھی سوفسطائیہ کو کبھی اکادمیین مشائین اور رواقیون کی سرگرمیاں رہیں کبھی ایپیکوریین متشککین اور اشراقیون کی گہرائیاں، ہندوستان میں بھی فلسفہ ویدانت، وسانکھیہ مذاہب جین اور بودھ اسی اختلاف نظر و فکر کی پیداوار ہیں، تصوف کی دنیا میں آئیے وہاں بھی وجود و فنا، عرفان و حضور کے نظریوں کا اختلاف نظر آئے گا ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ قادریہ و چشتیہ سہروردیہ و فردوسیہ کے خانوادے معرض وجود میں آتے، مصوری کی تاریخ میں بھی آپ کو طاؤسی، ایرانی راجپوت و مغل، چینی و جاپانی آرٹ کی رنگینیاں نظر آئیں گی، موسیقی کا بھی یہی حال ہے، مولدات بصرہ اور قینات حجاز اسلامی موسیقی کی تاریخی حقیقتیں ہیں پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ شاعری کی دنیا اس کلیہ سے ممتاز رہتی، چنانچہ

Marfat.com

یہاں بھی آپ کو طرز و ادا کا یہی اختلاف مختلف اسکول کی شکل میں نظر آئے گا، اس وقت میں صرف اُردو شاعری سے بحث کروں گا۔

تاریخ و تذکروں میں اُردو شاعری کے صرف دو اسکولوں کا نام لیا جاتا ہے یعنی دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول، لطف یہ ہے کہ اگر صرف دہلوی اور لکھنوی تذکروں میں یہ تخصیص و تعیین پائی جاتی تو تعجب کی بات نہ تھی، کیونکہ بہار اور دکن اُردو کے ان مرکزی مقامات سے اس قدر دور واقع ہوئے ہیں کہ میر و قائم گردیزی، و میر حسن سو یہ توقع کرنا درست نہیں کہ وہ بہار و دکن کی خدمات اُردو کو اس عہد میں جس وقت ذرائع رسل و رسائل میں اتنی آسانیاں نہ تھیں۔ بہ وضاحت بیان کرینگے متوسلین تذکرہ نگاروں میں مصحفی نے البتہ بہار کی طرف کافی توجہ کی، دکنی تذکرے بالخصوص خواجہ خان حمید اورنگ آبادی کا تذکرہ ،،گلشن گفتار،، خود دہلوی شعرا کے حالات سے بڑی حد تک تشنہ ہے، ،،چمنستان شعرا،، شفیق کا بھی یہی حال ہے، گو ،،گلشن گفتار،، کی ایجاز و اختصار کے بدلے اس میں تفصیل و اطناب پایا جاتا ہے۔ بہاری تذکروں میں سے اکثر طبع ہی نہ ہوئے اور جو طبع بھی ہوئے وہ اب ناپید ہیں۔ انجمن ترقی اُردو دکن اور مولانا عبدالحق صاحب کا ملک کو ممنون ہونا چاہیے کہ ان کی کوششوں کی بدولت اہم اور مفید تذکرے شائع ہوئے انھیں میں تذکرۂ گلزار ابراہیم (نواب ابراہیم خاں خلیل) اور تذکرہ ،،گلشن ہند،، (مرزا علی لطف) ہیں۔ خلیل نے آغوش بہار میں نشو و نما پائی لطف بہاری نہیں ہیں، لیکن ،،گلشن بیخار،، شیفتہ کی روایت کے مطابق وہ کچھ دنوں نواح عظیم آباد

Marfat.com

میں بھی رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ علی لطف نے اپنے تذکرہ میں جو گلزار ابراہیم سے ماخوذ ہے۔ بہاری شعراء کے حالات لکھے ہیں، ان تذکروں کے علاوہ بہار کے مشہور تذکرے، تذکرۂ عشقی، تذکرۂ شورش، تذکرۂ روز روشن و "معراج الخیال" جبرتی بہار کے محققین کے علاوہ دہلی، لکھنؤ اور دکن کے ارباب فکر و ذوق کی نظروں سے ناپید ہیں، بہار کے دور متاخرین میں بعض شعرا نے مفید تذکرے لکھے اور وہ طبع ہو کر اطراف ملک میں پہونچے بھی مثلاً شوق نیموی کا تذکرہ "یادگار وطن" شاد کی "نوائے وطن" اور "حیات فریاد" صفیر کا تذکرہ "جلوۂ خضر" نواب امداد امام اثر کی "کاشف الحقایق" شوق اور شاد کے تذکروں میں عموماً معاصرین کے حالات ہیں جلوۂ خضر اور کاشف الحقایق بہت بسیط تذکرے ہیں۔ لیکن بہار کے چند شعرا کے کمالات کا اعتراف کرنے کے علاوہ ان میں کوئی بہاری شاعری کی خصوصیات سے بحث نہیں کرتا، صفیر نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ زبان اردو کا عروج، دہلی اور لکھنؤ تک محدود ہے[۱]۔ لیکن میری یہ تحقیق ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کی طرح دکن اور بہار کے بھی مخصوص اسکول ہیں جس طرح حکومت کی سرپرستی ایرانی صوفیہ و شعرا کی آمد اور مقامی اثرات نے دہلی و لکھنؤ اسکول کی تخلیق کی انھیں اثرات کے ماتحت بہار اور دکن میں بھی اردو شاعری کو عروج ہوا۔

سب سے پہلے یہ غور کرنا ہے کہ دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کی تخلیق جن اثرات کے ماتحت ہوئی بہار اور دکن پر وہی اثرات مترتب ہوئے یا نہیں محض اس بنا پر

---

[۱] جلوۂ خضر جلد (۲)، صفحہ (۱۳)

Marfat.com

بہار یا دکن میں دہلی اور لکھنؤ سے شعرا گئے اور انھوں نے وہاں اپنا اثر پیدا کیا۔ بہار اور دکن کے اسکول شاعری کو دہلی اور لکھنؤ کا پرتو نہیں کہا جا سکتا۔ بیشک بہار میں دہلی سے کثیر تعداد میں شعرا آئے قائم و میر حسن نے اپنے تذکروں میں ان کا حال لکھا ہے مصحفی نے تذکرہ "ہندی گویان" میں اور خلیل نے "گلزار ابراہیم" میں ان کے نام گنائے ہیں ان تذکرہ نگاروں کی روایات کے مطابق فغاں، فدوی، ضیا، عشق دہلی سے بہار میں آکر بہت دنوں رہے، اور ان میں بعض یہیں سپرد خاک ہو گئے، شاہ رکن الدین عشق تو بہت پھولے پھلے۔ آپ صوفی سجادہ نشین تھے، مریدوں کا حلقہ ہو گیا، آج بھی پٹنہ میں آپ کی خانقاہ "تکیہ شریف" کے نام سے موجود ہے جہاں سالانہ عرس ہوا کرتا ہے۔

:

بہار کے مشہور غزل گو شیخ غلام علی راسخ (متوفی ۱۲۳۸ھ) میر سے جا کر ملے[1] شاد کہتے ہیں یہ ملاقات لکھنؤ میں ہوئی اسکی وجمال نے خواجہ میر درد سے شرف نیاز حاصل کیا[2]۔ لکھنؤ سے مرزا دبیر و میر انیس اور ان کے برادران و عزیزان باکمال بارہ سال تک مسلسل ہر سال ہفتوں تک پٹنہ میں مہمان رہتے[3] اور دبیر نے تو آرہ کو بھی رونق بخشی، امیر مینائی ۱۳۰۵ھ میں عظیم آباد میں تشریف لائے اور لوگوں کو اپنے کلام سے محظوظ[4] فرمایا، محض اس آمد و رفت سے بہار کو دہلی یا لکھنؤ کا زلہ ربا نہیں کہا جا سکتا ورنہ پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ دہلی اسکول کی تخلیق دکن نے کی، اور لکھنؤ اسکول دہلی کی پیداوار ہے

---

[1] تذکرہ آبحیات [2] حیات فریاد [3] جلوۂ خضر جلد ۲ صفحہ ۲۶۲ [4] جلوۂ خضر جلد ۲ صفحہ ۲۸۹

Marfat.com

تذکروں میں مذکور ہے کہ ولی دکنی کا دیوان دہلی میں آیا تو لوگوں نے ریختہ گوئی کی طرف توجہ کی۔[1] اسی طرح دہلی سے میر و سودا، ضاحک و انشا، ضیا و حسن، مصحفی و جرأت وغیرہ کا لکھنؤ میں آ کر سکونت اختیار کرنا تذکروں میں موجود ہے، ان واقعات کے ہوتے ہوئے اگر دہلی اسکول کی اصلیت تسلیم کی جاتی ہے، اور لکھنؤ اسکول کو دہلی اسکول کا پرتو نہیں کہا جاتا، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ صفیر بلگرامی کی طرح اُردو زبان کی ترقی و عروج کو دہلی اور لکھنؤ تک محدود کر دیا جائے، اور بہار و دکن کو اس کا خوشہ چیں سمجھ لیا جائے۔

دنیا میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک ہی قسم کے اثرات و احول نے چند مسالک کی تخلیق کی، فلسفہ و مذہب دونوں کی تاریخیں اس حقیقت سے مالا مال ہیں یہودی فلسفہ اسکندریہ اور فلسفۂ اشراقی دونوں ایک ہی دور کی چیزیں ہیں، سابق الذکر کے علمبردار "فیلو" (Philo) اور آخرالذکر کے بانی فلاطینوس (Plotinus) دونوں کے افکار میں مماثلت پائی جاتی ہے بعض سطحی اہل قلم نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے اثر و تاثر، فعل و انفعال کا نتیجہ بتایا لیکن محققین کے نزدیک یہ نظریہ حقیقت سے دور ہے واقعہ یہ ہے کہ یہودیوں سے یونانی بُت پرست نفرت رکھتے تھے، اور اس لئے یہ کبھی ممکن نہ تھا کہ ان میں باہم اثر و تاثر کی کارفرمائیاں ہوتیں اس لئے اہل نظر و تحقیق نے یہ فیصلہ کیا کہ فلسفہ کے ان دونوں اسکولوں نے ایک ہی اثر کے ماتحت

---

[1] مخزن نکات صفحہ ۱۔ تذکرہ جلوۂ خضر جلد ۱ صفحہ ۷۹-۸۰

Marfat.com

خودمختارانہ ترقی کی، ابُدھ وجین مذاہب کی تاریخ میں بھی اس قسم کی شہادت ملتی ہے قدیم علمار کا خیال تھا کہ یہ دونوں ایک ہی مسلک کے دونام ہیں۔ یا پھر جین مذاہب بُدھ مذہب کا پرتو ہے درانحالیکہ اس کو واقعہ سے کوئی سروکار نہیں جین مذہب بُدھ مذہب سے بہت قدیم ہے۔

یہی حال بہار و دکن کے اسکولوں کا ہے۔ ہرچند اس وقت وضاحت کے ساتھ اس پر بحث نہیں ہوسکتی، کہ دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ اور کیا یہی اجزائے ترکیبی بہار اور دکن اسکول کی تخلیق میں معاون ہوئے پھر بھی ایجاز و اختصار کے ساتھ عرض کیا جائے گا۔

دہلی اسکول کی تخلیق میں ایرانی شعرا و صوفیہ کی آمد، اور سلاطین و امرا کی ادب نوازی و بارش کرم کو بڑا دخل ہے، چنانچہ محمد مقیم ہروی (صاحب اکبرنامہ) اور بدایونی (صاحب منتخب التواریخ) نے سیکڑوں شعرا کے تذکرے لکھے ہیں، جو عہد اکبری میں وارد ہندوستان ہوئے، عبدالباقی نہاوندی نے عبدالرحیم خانخاناں کے نام سے "مآثر رحیمی" لکھی، اور خانخاناں کی سخاوت دریادلی اور علم دوستی کے بے شمار واقعات سپرد قلم کئے۔ عرفی، ظہوری، نظیری، ملک قمی سیکڑوں شعرا اس کے خوان کرم کے ریزہ چیں تھے۔ اس کے بعد جہانگیر سے لیکر اورنگ زیب تک برابر شعرائے ایران کی آمد رہی۔ صائب، رکنائے کاشی، ابوطالب کلیم، طالب آملی، مرزا موسوی خاں فطرت اسی دور میں آئے، تذکرہ کلمات الشعرا سرخوش

Marfat.com

اس دور کی ادبی سرگزشت کی، مختصر مگر جامع تاریخ ہے اس کے بعد سلطنت مغلیہ کا سب سے خطرناک، لیکن علمی و ادبی حیثیت سے نہایت تابناک دور محمد شاہ کے عہد حکومت سے شروع ہوتا ہے، یہیں سے فارسی اُردو میں منتقل ہوتی ہے، اور یہیں سے دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کے فرق و امتیاز کی بنیاد پڑتی ہے۔ عہد متاخرین کے مشہور فارسی اور اُردو کے اکابر شعرا اسی دور کی پیداوار ہیں، اس عہد میں والہ داغستانی علی حزیں ہندوستان میں آئے، آزاد بلگرامی اور خان آرزو کا یہی دور تھا۔ اسی عہد کے مستند علمی خیالات "ریاض الشعراء" (والہ داغستانی) "مجمع النفایس" (خان آرزو) "سرو آزاد" (غلام علی آزاد بلگرامی) اور "تذکرۃ الاحوال" (شیخ علی حزیں) میں ملتے ہیں۔ میر تقی، قایم اور گردیزی نے شعرا ریختہ کے حالات میں اپنے تذکرے کسی قدر تقدم و تاخر کے ساتھ اسی عہد میں لکھے ان تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ فارسی شعرا تیزی کے ساتھ ریختہ کی طرف رجوع کرتے جاتے تھے، الغرض ایرانی شعرار کی آمد، فارسی و ہندوستانی زبان کے میل جول اور سلاطین و امرار کی علمی و ادبی سرپرستی نے اُردو شاعری میں دہلی اسکول کی بنیاد ڈالی، اب آئیے ہم بتائیں کہ ہمارے دکن میں انھیں اثرات نے خود مختارانہ اُردو کو نشو ونما دی، دکن کے متعلق صرف اشارے کروں گا، عہد بہمنیہ میں حافظ و جامی کو بلانے کے لئے ایران میں دعوت نامہ جاتا ہے، حافظ شیرازی ہورمز تک آتے ہیں لیکن پھر وطن واپس چلے جاتے ہیں، جامی خواجہ محمود گاواں وزیر اعظم سے معذرت کر لیتے ہیں، شیخ آذری اسفرائنی احمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں دکن میں آتے ہیں، فیروز شاہ بہمنی خود بڑا شاعر تھا، تاریخ فرشتہ میں اس کے

Marfat.com

اشعار بہت ہیں عروجی تخلص کرتا تھا، آدان عادل شاہیہ میں بھی سلاطین نے شاعری کی، یوسف عادل شاہ یوسف اور اسمٰعیل عادل شاہ وفا بلند پایہ شعراگزرے ہیں، قطب شاہی حکومت کا بانی سلطان قلی قطب شاہ خود ریختہ کا شاعر گزرا ہے، قائم کی روایت کے مطابق محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ میں ریختہ گوئی کو بڑا عروج تھا اسی زمانہ میں استرآباد سے میرمومن تشریف لائے ان کو حکومت کے معاملات میں بھی درخور تھا۔شفیق دکنی نے اپنے تذکرہ ,,شام غریباں،، میں ان ایرانی شعرا کو جمع کر دیا ہے جو ہندوستان میں آئے۔ بہار میں بھی شعرائے ایران اور صوفیہ کی آمد رہی۔ تذکرۂ صبح صادق میں ان کثیر ایرانی شعراء کے حالات مذکور ہیں جو عظیم آباد میں مقیم رہے۔ خان آرزو نے مجمع النفائس میں شیخ علی حزیں کے ورود عظیم آباد کا حال لکھا ہے ——— عہد عالمگیری کے مشہور ایرانی شاعر معز فطرت بھی عظیم آباد کے حاکم مقرر ہو کر گئے تھے، ان کا ایک فارسی اردو مخلوط شعر نکات الشعرا، مخزن نکات اور جلوۂ خضر (جلد اصفحہ ۱۰۷) میں مذکور ہے۔عظیم آباد میں ایرانی شعراء کی اس آمد کا سلسلہ شاد کے زمانہ تک جاری رہا، چنانچہ انھوں نے بھی ملا حاجی بابا کا ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو حیات فریاد صفحہ ۱۳۲)، بہار نے جوشش، راسخ اور شاد پیدا کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اس کا بھی ایک مخصوص اسکول ہے اور خود ہمارے عہد کے مایۂ ناز مفکر حضرت نیاز کا یہ قول کہ ,,شاد کا مثل نہ تو دہلی اسکول میں کوئی شاعر ہوا اور نہ لکھنؤ اسکول میں،، اس حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے۔ خیر یہاں تک تو ایک ضمنی بحث تھی، اب آیئے غور کریں کہ اصطلاحات دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کی کیا تعریف ہے؟ عام طور پر جذبات کی شاعری کو دہلی اسکول

Marfat.com

کی شاعری اور صنائع بدائع اور لفظی تکلفات کو لکھنؤ کی شاعری سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی لحاظ سے دہلی اسکول کی شاعری میرؔ سے شروع ہو کر غالبؔ پر ختم ہوتی ہے اور لکھنؤ اسکول کا دور ناسخؔ سے شروع ہو کر امیرؔ وغیرہ پر تمام ہوتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ میرؔ سے قبل اُردو شعراء، خان آرزوؔ، شاہ حاتمؔ، آبروؔ کو کس اسکول کی طرف منسوب کیا جائے گا، میں شاکر ناجیؔ، یکرنگؔ وغیرہ کو نظر انداز کر دیتا ہوں، حالانکہ یہ لوگ بھی سلسلۂ ارتقا کی کڑی کے لحاظ سے اپنی جگہ سنگین حقیقتیں ہیں، میں یہ تقسیم ماننے کے لئے طیار نہیں کہ جس مقام اور ماحول میں افراد کے اندر انقلاب ہو اور وہ افراد کوئی سیاسی یا ادبی شاہراہ اختیار کریں تو اس سیاست و ادب کو اسی مقام اور ماحول کی طرف منسوب ہونا چاہئے۔ غالبؔ کے بعد دہلی میں کون شاعر ہوا جس نے دہلی اسکول کی صحیح علمبرداری کی۔ بعض اصحاب نسیمؔ اور داغؔ کا نام لیں گے لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں، داغؔ کی زبان دہلوی تھی، لیکن ان کے جذبات پر اودھ ہی کے تخیلات کام کر رہے تھے، وہ دہلی اور لکھنؤ اسکول کے امتزاج و اختلاط کا حقیقی آئینہ ہیں، یہی وجہ ہے یو۔پی کے مشاہیر شعراء ریاضؔ[۱] نے داغؔ کے دامن تربیت میں پناہ لی، داغؔ کے رجحان و ذوق پر اودھ کی رنگینیاں اثر انداز تھیں، اسی ہمرنگی نے یو۔پی کے اور شعراء کو بھی داغؔ کی طرف متوجہ کر دیا۔

---

[۱] ریاضؔ خیرآبادی نے کبھی داغؔ سے اصلاح نہیں لی۔ ریاضؔ فی الحقیقت اسیرؔ کے شاگرد تھے بعد کو امیرؔ مینائی سے بھی کچھ دنوں استفادہ کیا۔ (نیاز)

Marfat.com

یہ حقیقت ہے کہ لکھنؤ اسکول، غازی الدین حیدر سے قبل کوئی چیز نہ تھا، میں نے ابھی ابھی ظاہر کیا ہے کہ دور محمد شاہی سیاسی اعتبار سے بہت زیادہ نازک تھا لیکن ادبی اعتبار سے صد درجہ انقلاب آفریں گزرا ہے، اسی عہد یعنی ۱۱۳۳ھ میں سلطان محمد شاہ رنگیلے کی طرف سے سید محمد امین کاظمی اودھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے، یہ نیشا پور کے رہنے والے تھے، یہی سلطنت اودھ کے بانی گزرے ہیں، انھوں نے شیخ زادوں کو نکال کر لکھنؤ پر قبضہ کیا، ان کے بعد ان کے داماد ابوالمنصور صفدر جنگ صوبہ دار اودھ ہوئے جب ۱۱۶۶ھ میں ان کا انتقال ہو گیا تو شجاع الدولہ کو صوبہ داری ملی، یہ بھی ۱۱۸۸ھ میں رہرو ملک بقا ہوئے ان کے بعد نواب آصف الدولہ نے صوبہ کی حکومت سنبھالی آصف الدولہ خود بڑے پائے کے شاعر تھے آصف تخلص کرتے تھے، دہلی میں شاہ عالم آفتاب شعر کہتے تھے، اسی زمانہ میں کسی قدر تقدم و تاخر کے ساتھ، میرزا مظہر، خان آرزو، میر اور سودا گزرے ہیں۔ آصف الدولہ نے ۱۲۱۲ھ میں رحلت کی۔ نواب سعادت علی خاں نے صوبہ داری کا نظم و نسق شروع کیا، اسی عہد میں انشا اور خلیل نے مشترکہ سعی سے اردو کی مایۂ ناز کتاب ”دریائے لطافت“ لکھی ۱۲۲۹ھ میں نواب سعادت علیخاں نے وفات کی، اور غازی الدین حیدر نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی، اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا، انگریزوں نے غازی الدین حیدر کو مطلق العنان بادشاہ بنا دیا اور حکومت کی تبدیلی کے ساتھ زبان میں بھی تبدیلی ہوئی۔ ابھی تک لکھنؤ دہلی اسکول کا تتبع تھا۔

Marfat.com

نیر و میرزا، ضاحک و ضیا، انشا و جرأت شعرائے دہلی کا دور دورہ تھا کہ قدرت نے اُردو شاعری میں انقلاب کی ضرورت سمجھی اور اسی نے ناسخ کی تخلیق کی۔ ... ماننسخ من آیۃ او ننسہا نات بخیر منہا او مثلہا، ناسخ نے زبان کی اصلاح کی طرف توجہ کی دہلی اسکول میں نیر و مرزا نے بھی اصلاحیں کی تھیں، لیکن ناسخ کی اصلاحات و اصولِ زبان نے اُردو کی کایا پلٹ دی، دہلی اسکول میں مومن کے زمانہ تک اُردو کا وہ انداز نہ تھا، جو ناسخ نے ان سے بہت قبل لکھنؤ اسکول میں جاری کر دیا تھا۔ ناسخ نے زبان اُردو پر جو احسانات کئے ہیں وہ لسانیات کی نہایت اہم چیزیں ہیں، اس سلسلہ میں صفیر بلگرامی کی جلوۂ خضر (جلد ۲ صفحہ ۴۲-۱۰۴) قابل مطالعہ ہے۔ ناسخ کے عہد میں لکھنؤ کے اندر خواجہ آتش بھی تھے۔ ایک طرف ناسخ اور ان کے تلامذہ رشک، برق، وزیر، بحر، آباد سحر، شہید، آبتر، کوثر اور مسیحا لکھنؤ اسکول کو چار چاند لگا رہے تھے، دوسری طرف اُنکے ہم چشم خواجہ آتش اور ان کے تلامذہ اصغر، اعظم، افضل، اوج، بسمل وغیرہ یا بقول صفیر "۳۰ ماہ اوج کمال" اپنی ضیا باریوں سے لکھنؤ اسکول کے نخل کی آبیاری کر رہے تھے ناسخ اسکول نے بہار پر بھی بہت اثر ڈالا تھا۔ چنانچہ اسی خانوادہ کے مشہور چشم و چراغ شمشاد نے شوق، نیموی، قیس آروی، تمنا پھولواروی اور بدر آروی پیدا کئے لیکن زمانہ نے اتنی کروٹیں بدلیں، زبان و طرز بیان میں اتنا انقلاب ہوگیا کہ اب نہ تو دہلی اسکول ہی باقی ہے اور نہ لکھنؤ اسکول، اور نہ صرف اودھ بلکہ بہار میں بھی ناسخ اسکول کے چند بے کیف اور بے مایہ مقلدین سسک رہے ہیں، یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ زبانِ اُردو

Marfat.com

اس قدر آگے بڑھ گئی ہے کہ اب نہ تو دہلی اسکول کوئی قابل قدر چیز رہ گیا ہے اور نہ لکھنؤ اسکول جس کو متاخرین نے چوٹی، کنگھی، مسی، جوبن کے مزخرفات سے بدنام کر رکھا تھا ناسخ نے زبان میں جو انقلاب پیدا کر دیا تھا، ان کو اُن کے تلامذہ نے تکمیل تک پہونچا دیا اب ان کی باقیات محض سعی لاطایل سے کام لے رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ صوبہ اودھ کے مشہور بلاد موہان، مراد آباد، کاکوری، بدایوں، میرٹھ اور اکبر آباد سے ایک جدید اسکول پیدا ہوا جس کو نہ دہلی سے واسطہ ہے نہ لکھنؤ سے حالی پر جو عہد حاضر کے نظم نگاروں کے اوّلین اُستاد ہیں غالب کا کافی اثر تھا لیکن صرف تغزل میں، ان کی نظم نگاری انقلاب زمانہ کی پیداوار ہے۔ حالی کے بعد پنجاب کے فرزند اقبال نے اسکو بہت بڑی ترقی دی، اس پر مغربی ادب وخیال کا اضافہ کیا۔ اب یو۔ پی میں جوش، سیماب دکن میں علی اختر، بہار میں ڈاکٹر عظیم جمیل شمس، ارمان اس اسکول کو فروغ دے رہے ہیں۔ بہرحال عہدِ حاضر میں اُردو زبان کے اندر تغزل ونظم نگاری کے اعتبار سے جو انقلاب ہوگیا ہے، اس کو میں محض دہلی اسکول کی طرف منسوب کرنے کے لئے تیار نہیں ہاں صوبۂ اودھ کے اس دور کی شاعری کو "لکھنؤ اسکول کی انقلابی شاعری" سے تعبیر کرتا ہوں۔ اب آیئے فرداً فرداً اودھ کے اُن باکمال شعرا کے کلام پر کسی قدر مفصل تبصرہ کیا جائے۔

حسرت۔ حسرت کی شاعری پر نقد وتبصرہ کا حق جلیل احمد قدوائی نے جس بصیرت اور نکتہ رسی کے ساتھ ادا کیا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں، اس انتقاد نے خود

Marfat.com

جلیل صاحب کی زندگی کے بعض نقوش نمایاں کر دیئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ذوقِ سلیم کے ساتھ جب تک راہ عشق سے آگہی نہ ہو جلیل صاحب کی طرح کوئی حسرت کی شاعری کے حقایق و نکات کو سمجھ بھی نہیں سکتا یہ اُردو زبان کی خوش نصیبی ہے کہ اسے حسرت جیسا شاعر نصیب ہوا، اور حسرت کو ممنون ہونا چاہیئے جلیل کا جنھوں نے صحیح معنی میں دنیا سے ان کا تعارف کرایا۔ جلیل صاحب کے نقد و تبصرہ کے بعد حسرت کے متعلق کچھ خامہ فرسائی کرنا تحصیل حاصل ہے لیکن آہنگِ تسلسل کو قایم رکھنے کے لئے مجبوراً چند سطور لکھنا ہی ہیں

سب سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حسرت کی شاعری کے محرکات کیا ہیں ؟ جلیل صاحب کی طرح میرا بھی ایمان[لہ] ہے کہ حسرت کی شاعری کا اولین محرک اُن کا دولہ عشق ہے، جسے زمانہ نے ہمیشہ محروم کامرانی رکھا، خود حسرت کا اعتراف ہے۔

یاد ایام کہ ہم جوشِ جنوں میں حسرت   خوار پھرتے تھے پریشان بیابانوں میں

شاعر نے دشت نوردی کی ہو یا نہیں لیکن یہ بالکل حقیقت ہے کہ اس نے شاعرانہ مبالغہ سے کام نہیں لیا، یقیناً وہ میر کی طرح "جوشِ جنوں" کے دور سے گزرے اور اسی

لہ آپ اور جلیل دونوں کا "ایمان" غلط ہے۔ حسرت میں کبھی وہ دولۂ عشق پیدا نہیں ہوا جس کی محرومی و ناکامی ایک شخص کو شاعر بنا سکتی ہے حسرت شاعر پیدا ہوا تھا جو بغیر عشق کئے بھی شعر کہہ سکتا تھا۔ حسرت کی شاعری عشق سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ اس کی شاعری نے اُسے عاشق مزاج بنایا۔ فاضل مقالہ نگار نے ثبوت میں جو شعر پیش کیا ہے وہ درست نہیں، کیونکہ حسرت بیابانوں میں کبھی خوار نہیں پھرا، زندانوں میں گرفتار ضرور رہا ہے۔ اس نوع کے ادعائے شاعری سے کسی شاعر کی سیرت پر حکم لگانا مناسب نہیں۔
(نیاز)

13 6955

Marfat.com

عشقبازی نے ان کے اخلاق و کردار پر گہرا اثر ڈالا، فرماتے ہیں:-

گئے عیب سب عشقبازی میں حسرت　　نہ بغض و حسد ہے نہ غصہ نہ کینہ

بے اختیار ہمیں اس وقت ظہوری ترشیزی کا یہ شعر یاد آرہا ہے۔

شدہ است سینۂ ظہوری پُر از محبت یار　　برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

حسرت کی شاعری میں نہ کوئی فلسفیانہ پیام ہے، نہ کوئی شاعرانہ معنی آفرینی و نکتہ سنجی بلکہ وہ سیدھے سادے الفاظ میں اپنی کیفیات عشقیہ کو بیان کر دیتے ہیں انھوں نے جس معصومانہ اور پاکبازانہ انداز میں عشقیہ معاملات پر روشنی ڈالی ہے، وہ ہمیں خسرو اور اطالوی شاعر ڈانٹے (Dante.) کی یاد دلاتے ہیں، اس میں شک نہیں اسی عشق نے گوئٹے سے "آلام ورتھر" (Sorrows of Werther) لکھوایا اور نواب مرزا شوق سے "زہر عشق"، لیکن گوئٹے اور شوق دونوں کے یہاں غم عشق ولولہ انگیز ہوا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماہرین نفسیات کی تحقیق کے مطابق ان کے عشق کے اندر جذبۂ جنسی (Sexual Instinct) کی کارفرمائیاں ہیں۔ اسکے برخلاف خسرو، ڈانٹے اور حسرت ہمیں محبت افلاطونی کی طرف رہنمائی کرتی ہیں خسرو کی شاعری بھی متشائم (Pessimistic) ہو لیکن اسمیں میر، ضیا، قائم اور فانی کی قنوطیت نہیں پائی جاتی کیونکہ ان کے یہاں غم سرمایۂ نشاط بن جاتا ہے، اس کے برخلاف خسرو اور حسرت کے یہاں غم و یاس، دل و جگر میں ایک جانکاہ ہوک پیدا کر دیتے ہیں۔ خسرو کا شعر ہے

شادباد ات گلستانِ جوانی ہر روز　　گرچہ با خسرو از و برگ و نوائے نرسید

Marfat.com

حسرت فرماتے ہیں:۔

آہ وہ یاد کہ جس یاد کو ہو کر مجبور　　دل مایوس نے مدت سے بھلا رکھا ہے

دونوں شعروں کو پڑھیے اور پھر سوچیے کہ خسرو اور حسرت سپردگی وفتادگی اور حسرت سنجی وناکامی کے اعتبار سے کس قدر ایک دوسرے سے قریب ہیں۔

حسرت کا دیوان ہمیں بے طرح ڈانٹے (Dante) کی یاد دلاتا ہے، جو بقول اطالوی نقاد ادب میزینی ڈانٹے کے عنفوان شباب کی خوشبو ہے، ڈانٹے نے اپنی زندگی کے اٹھائیسویں برس نظم ونثر دونوں میں "بیٹرس" (Beatrice) کے ساتھ اپنے عشق کا حال لکھا، ڈانٹے نے جہاں پر اپنی محبوبہ کی رحلت کا تذکرہ کیا ہو وہاں طرز وبیان کے اندر ایسی عظمت وکشش پیدا ہو گئی ہے کہ میزینی بول اُٹھتا ہے کہ اس کا ترجمہ یا تو شیلی (Shelley) کر سکتا تھا یا پھر عہد حاضر میں اس کا حوصلہ کسی عورت ہی کے دل ودماغ کو ہو سکتا ہے، ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ حسرت کی شاعری میں فلسفیانہ وحکیمانہ پیام نہیں، بلکہ وہ خسرو اور ڈانٹے کی طرح اپنی عشقیہ کیفیات، سوگ اور بروگ کا حال بیان کرتے ہیں، ان کا شعر ہے:۔

علم وحکمت کا جنھیں شوق ہو آئیں ادہر　　کچھ نہیں فلسفۂ عشق میں حیرت کے سوا

اس سلسلہ میں اُنھوں نے محبت وسرفروشی کے اسرار ونکتے بیان کئے ہیں کہ رہ عشق کا ایک بے خبر انسان حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے، میں نے اگلے سطور میں اشارہ کیا تھا کہ حسرت کے عشق میں جوانی کی ہوس رانیوں کو دخل نہیں اُنھوں نے بالکل سچ کہا ہے

Marfat.com

دیارِ شوق میں ماتم بپا ہے مرگِ حسرت کا   وہ وضع پارسا اُس کی وہ عشق پاکباز اُس کا

اور یہیں سے عشق افلاطونی (Platonic Love) کا سراغ ملتا ہے، عشق افلاطونی کیا ہے؟ ایک پاکباز محبت! گوشت پوست کی دنیا سے مجرد، ایک معصومانہ تخیل۔ یہاں ایک غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے۔ میں حسرت کی شاعری کو اسی دنیا کی چیز سمجھتا ہوں۔ وہ فلسفۂ اشراقی (Neo Platonism) کے نفس کل اور وحدت و کثرت کے مسائل نہیں بیان کرنے لگتے! اور نہ ان کا محبوب ماورار آب و گل کوئی چیز ہے، بلکہ ان کا معاملہ عشق اسی دنیا کے ایک پیکر مادی کے ساتھ وابستہ ہے، لیکن اس کے اندر جوانی کی سرمستیوں اور جذبۂ جنسی کے داعیات کا پتہ نہیں۔ ان کے سارے کلام میں ان کی "وضع پارسا" اور "عشق پاکباز" کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔

حسرت نے اپنے کلام میں نسیم، مومن و میر کے ساتھ اپنی ارادت و عقیدت کا اظہار کیا ہے اور اپنے خیال میں خود کو ان کا ہم رنگ بتایا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے مفصلہ ذیل اشعار قابلِ ذکر ہیں:-

حسرت تری شگفتہ کلامی پہ آفریں   یاد آگئیں نسیم کی رنگیں بیانیاں

حسرت یہ وہ غزل ہے جسے سن کر سب کہیں   مومن سے اپنے رنگ کو تونے ملادیا

شیرینیٔ نسیم ہے سوز و گداز میر   حسرت ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

مگر حسرت صاحب مجھے معاف فرمائیں گے مجھے ان سے اتفاق نہیں اور میرے خیال میں انھیں فارسی شعرا کی روش پر مقطعات میں اس نوع کی شاعرانہ رائے زنی کا حق

Marfat.com

تو مزدر تھا، خواجہ حافظ، خواجو و ظہیر کی سیادت تسلیم کرتے ہیں۔ رومی: "ما از پئے سنائی و عطار آمدیم" لکھتے ہیں، غالب ظہوری کے تتبع پر نازاں ہیں :-

غالب بہ شعر کم ز ظہوری نیم ولے　　　عادل شہ سخن رس دریا نوال کو

حسرت کو بھی یہ حق حاصل تھا، ان سے کوئی مواخذہ نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حسرت کو نسیم و مومن سے دور کا بھی واسطہ نہیں، اور میر کے نشاط انگیز غم کا حسرت کے یہاں باوجود کوشش بھی پتہ نہیں لگتا، میر کے یہاں غم سرمایۂ لذت ہے، اس پر میر کے محاسن شعری متنزاد ہیں۔ میر کا شعر ہے :-

مناں مجھ مست بن پھر خندۂ قلقل نہ ہوویگا　　　مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا

اس نوع کی شاعری کا حسرت کے کلام میں کہیں پتہ نہیں، یا پھر میر کا یہ شعر پڑھئے :-

قاصد جو واں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا　　　بیچارہ گریہ ناک دگریباں دریدہ تھا

اس طرح کے تخیل شعری اور شاعرانہ معنی آفرینی سے حسرت کو کوئی لگاؤ نہیں، اور انھوں نے خود اعتراف کیا ہے

شعر میرے بھی ہیں پُر درد ولیکن حسرت　　　میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

ہاں ان کا یہ ادعائے سخن ایک حد تک صحیح ہو سکتا ہے :-

قائم ہے ترے دم سے طرز سخن قائم　　　پھر ورنہ کہاں حسرت یہ رنگ غزلخوانی

لہ حسرت کا یہ دعویٰ کہ ان کے کلام میں مومن، نسیم اور میر تینوں کا رنگ پایا جاتا ہے بالکل صحیح ہی جیسا ہے کہ عبدالمالک صاحب حسرت کے یہاں مومن کا رنگ نہیں پاتے (بقیہ نوٹ ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ)

Marfat.com

بعض مستثنیات کے ساتھ میر، ضیا اور قایم ایک ہی سرچشمۂ انوار کی کرنیں ہیں، میر حسن
نے قایم کو طالب آملی کا ہمرنگ بتایا ہے یہ بالکل بے جوڑ سی بات ہے، پھر بھی اس سے
کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، کہ حسرت کے کلام میں میر کا سوز و گداز اور قایم کی سوختہ سامانی
دونوں پائی جاتی ہیں۔ اب آیئے ان کے اشعار پر مختصر سا تبصرہ کریں۔

بھولے سے وہ ادھر بھی جو آنکلے تھے کہیں اس دن کا بھولتا ہی نہیں ماجرا مجھے

جلیل صاحب نے بھی مقدمہ میں یہ شعر لکھا۔ اور اس پر اپنے خالص معصومانہ انداز میں
روشنی ڈالی ہے۔ یہیں سے مجھے سراغ ملا کہ جلیل صاحب بھی حسرت کی طرح "حریف بادہ
پیما" ہیں، حقیقت یہ ہے کہ "انتخاب شعر" سے بھی انسان کبھی "رسوا" ہو جایا کرتا ہے۔

جلیل صاحب نے مقدمہ میں حسرت کا یہ شعر بھی دیا ہے:۔

...م سے ہر چند وہ ظاہر میں خفا ہیں لیکن کوشش پرسش حالات چلی جاتی ہے

حسرت نے اس شعر میں جس غائبانہ احساس و پندار کا اظہار کیا ہے وہ انھیں کا
حصہ ہے، عشقیہ معاملات کے نکتے انھوں نے اس عمق نظر کے ساتھ بیان کئے ہیں کہ بعض
اوقات ہم حیران رہ جاتے ہیں اور حسرت کے کشف و کرامت کا اقرار کرنا پڑتا ہی، لیکن
کشف و کرامت سے آپ یہ نہ جان لیں کہ میں حسرت کو صوفی صافی سمجھتا ہوں، گو اپنی

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۸) درآنحالیکہ کلام حسرت میں طرز مومن کی مثالیں بہ کثرت ملتی ہیں، اسی طرح
...م کا رکھ رکھاؤ بھی حسرت کے یہاں بہت پایا جاتا ہے۔ البتہ میر کا رنگ بیشک پھیکا ہے اور وہ
...ی لفظی حیثیت سے معنوی حیثیت سے نہیں۔
(نیاز)

Marfat.com

بلندی اخلاق اور پاس وضع کے لحاظ سے وہ کسی بڑے سے بڑے زاہد برگزیدہ سے کم نہیں کیا شعر کہے ہیں :-

نہ بھولے گا وہ وقت رخصت کسی کا　　مجھے مڑ کے پھر اک نظر دیکھ لینا
وہ شرمائی صورت وہ نیچی نگاہیں　　وہ بھولے سے ان کا ادھر دیکھ لینا

مصر کے مشہور نقاد ادب ڈاکٹر زکی مبارک نے، نقد شعر وادب کے سلسلہ میں صو شعریہ، کو بڑی اہمیت دی ہے، ،،صوریہ شعریہ،، یہ ہے کہ ہم کسی منظر، یا کیفیت کو ا طرح بیان کریں کہ منظر کی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے، یا وہ کیفیت خود ہ اندر طاری ہو جائے، حسرت کے اشعار بالا پڑھئے اور غور کیجئے اگر مرقع چغتائی کی طر کبھی کسی مصور کے موئے قلم نے اس کو نقش کیا تو دیکھنے والوں کا کیا حال ہوگا۔ غالب کا مش شعر ہے :-

نگاہ بے محابا چاہتا ہوں　　تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

حسرت کہتے ہیں :-

ہو وہاں شان تغافل کو جفا سے بھی گریز　　التفات نگہ یار کہاں سے لاؤں

الغرض حسرت اپنے ادائے بیان اور شعریت کے اعتبار سے ایک مخصوص انفر رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری منطق ومطالعہ کی مرہون منت نہیں بلکہ اس کے اندر محض دا کی کارفرمائیاں ہیں۔

اصغر - اصغر کی شاعری پر کچھ روز ہوئے "نگار" میں ہمارے محترم حضرت نیاز مدظلہ

Marfat.com

نقد و تبصرہ کیا تھا، میں حضرت موصوف کو محض ادیب و شاعر نہیں جانتا بلکہ میں ان کو عہد حاضر کا سب سے بڑا مفکر اور پیامبر سمجھتا ہوں، ممکن ہو لوگوں کو اس میں فرط ارادت کی کار فرمائیاں نظر آئیں اور وہ میری اس نیاز کیشی کو (NegativeSelf-feeling) کا نتیجہ سمجھیں، لیکن اس اعتقاد کے لئے میرے پاس دلائل و براہین ہیں جو ،، نیاز نامہ ،، کی صورت میں بہت جلد ملک کے سامنے آئیں گے، بہرحال باوجود اس ارادت کے میں ان کا مقلد نہیں اور میں ان کی اصابت رائے کا پیہم تجربہ رکھنے کے باوجود ان کی ہر رائے سے پہلے بلا ذاتی تحقیق کے اتفاق نہیں کرتا حالانکہ میری ذاتی تحقیق و کاوش بھی اکثر و بیشتر اسی نتیجہ پر پہونچاتی ہے، اصغر کے متعلق بھی میں نے ذاتی تحقیق کی اور مجھے صاف گوئی کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس معاملہ میں مجھے حضرت نیاز سے اتفاق نہیں۔

نیاز صاحب اصغر کی شاعری کو بہ حیثیت مجموعی اچھی چیز ضرور سمجھتے ہیں لیکن انکے صوفیانہ رنگ کو وہ پسند نہیں کرتے، ان کے نزدیک تغزل کے اندر صوفیانہ افکار کا اختلاط مستحسن نہیں، مجھے یہیں سے نیاز صاحب سے اختلاف ہے، یہ اختلاف ذوق و وجدان کا ہے اس لئے یوں بھی اس کے لئے دلیل و برہان کی ضرورت نہیں، لیکن پھر بھی کچھ کہنا ہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب عورت و محبت، حسن و رنگ، لذت و الم، حیات و موت ہمارے جذبات کے اندر برانگیختگی اور عضلات میں ہنگامہ پیدا کر دیتے ہیں، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ تصوف جو نام ہے ایک پاکباز محبت کا اور کثرت کے اندر وحدت کی جلوہ آرائیوں

Marfat.com

کا، انسان کے اندر شعرگوئی کی صلاحیت پیدا نہ کردے، یہی وجہ ہے کہ تصوف، فلسفہ اور شعریت کے امتزاج سے دنیا میں بڑے بڑے شعرا پیدا ہوئے، شوپنہار اور ابن سینا فلسفہ کے ساتھ شاعری کا بھی بلند ذوق رکھتے تھے۔

ابن عربی، رومی، میر، درد کی صوفیانہ شاعری، بالخصوص صوفیانہ رنگ تغزل سے کس کو انکار ہوسکتا ہے، ترجمان الاشواق اور دیوان شمس تبریز ہیں اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ مادی محرکات عشق نے میر، کیٹس، نظیری اور ابن ابی ربیعہ پیدا کئے تو روحانی محرکات عشق نے بھی اس دنیا میں کچھ کم خدمتیں انجام نہیں دیں، جس طرح تخیلات و تصورات ایک اسکول سے دوسرے اسکول، ایک عہد سے دوسرے عہد میں منتقل ہوتے ہیں اسی طرح صوفیانہ شاعری کے تخیلات دوسری صدی ہجری سے برابر شعرائے متاخرین کو اثر پذیر کرتے رہتے ہیں۔ درد و غالب دونوں کے کلام پر اس رنگ کا اثر پڑا، دونوں نے ادائے بیان میں مختلف اسلوب اختیار کئے ہاں یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ سنائی و عطار، رومی و عراقی کے کلام میں بے ساختہ پن ہے اور صوفیانہ افکار ان کی شاعری پر نفسیاتی ابتہاجیت کے طور پر چھائے ہوئے ہیں لیکن متاخرین میں صوفیانہ شاعری کے اندر تقلیدی رنگ غالب ہے وہ محسوسات کی دنیا سے الگ ہوکر اصول و ضابطہ کے ماتحت صوفیانہ شاعری کرتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے اشعار فلسفۂ اشراقی کا مسئلہ بن جاتے ہیں، غالب کے یہاں یہ بدعت زیادہ ہے۔ اصغر نے اس کی تقلید کی، بہرحال اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ (Suggestivity) کے اندر جاں کسی کے اندر کسی شخص کی

Marfat.com

برتری و فوقیت کا احساس ہوتا ہے وہاں "تعاون تفارنت"، کو بھی بڑا دخل ہے، ہمارے عہد میں بہت بڑے بڑے علمار وادب موجود ہیں لیکن ہم کسی ایک سے زیادہ اثر پذیر ہوتے ہیں اس کی وجہ وہی ہے کہ اس کے افکار ہمارے نفسیاتی "حال" کے زیادہ مطابق ہیں، اصغر کا بھی یہی حال ہے کہ صوفیانہ شاعری بالخصوص غالب کے تتبع میں انھوں نے اپنے تغزل کی بنیاد تصوف پر رکھی[۱]۔

---

[۱] میرے متعلق اکثر لوگوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے کہ میں شعر میں "رنگ تصوف" پسند نہیں کرتا اور اسی لئے میں اصغر کی شاعری کا معترف نہیں ہوں۔ تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کا موقع تو یہ نہیں ہے، تاہم چونکہ بات "سخن گسترانہ" آپڑی ہے، اس لئے مختصراً کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔

"تصوف" کا مفہوم دنیا نے جو کچھ قرار دیا ہو، مگر میں اُسے اتنی بلند چیز سمجھتا ہوں کہ اگر ریگزار مذہب میں اس کا وجود نہ ہو تو پھر مذہب میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ ریاضی و طبیعیات کی طرح کوئی ایسا علم نہیں ہے جو نظریات و اصطلاحات کا محتاج ہو وہ بالکل اخلاقی دنیا کی چیز ہے اور اس کا تعلق انسان کے وجدان سے ہے۔ مثلاً یہ محسوس کرنا کہ تمام افراد نوع انسان ایک ہی چیز ہیں اور ان سب کو باہم کر محبت وہمدردی کی زندگی بسر کرنا چاہئے، یقیناً تصوف ہے۔ لیکن اس احساس کی صداقت وحقانیت کے ثبوت کے لئے چیز اصلی، مظہر کلی، ناہو، اناہو وغیرہ کی اصطلاحات وضع کرنا اور "ذات وصفات"، کے جھگڑے پیدا کرنا قطعاً تصوف سے خارج ہے۔ میں شاعری میں وجدانِ تصوف کے آثار و علائم دیکھ کر بہت لطف اندوز ہوتا ہوں لیکن اصطلاحات تصوف کا استعمال بری طبیعت کو مکدر کر دیتا ہے اور میں ایسا محسوس کرنے لگتا ہوں کہ میری وجدانی کیفیت کم ہوتی جا رہی ہے اور ایسا ہونا چاہئے کیونکہ اس صورت میں ذہن معنویت کی طرف سے خارج کی طرف منتقل ہوتا ہے (بقیہ نوٹ صفحۂ آئندہ پر)

Marfat.com

اب آیئے اس تمہیدی بیان کے بعد اصغر کی شاعری پر بحث کریں، اصغر کی شاعری کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ میرا خیال ہے کہ غالب کی صوفیت اور مومن کی معنویت دونوں

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۳) اور شاعری بالکل منطق کا مسئلہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ شاعری میں نعت گوئی سب سے ادنیٰ درجہ کی چیز سمجھی جاتی ہے، لیکن میں اس سے بھی لطف اٹھاتا ہوں اگر واقعی کوئی کیفیت اس میں پائی جائے۔ صمالہ آبادی کا شعر ہے:-

اے مدینہ میں خدائی کے بلانے والے
منتظر اور بھی دو چار ہیں آنے والے

میں اس شعر کو تمام کلیات محسن پر ترجیح دیتا ہوں، کیونکہ اس میں صرف جذبات ہیں اور یہاں سوائے تکلفات شاعری کے اور کچھ نہیں۔ شہیدی کا ایک شعر تصوف کے رنگ میں ملاحظہ ہو:-

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

اس کے مقابلہ میں غالب کے اس شعر کو پڑھیئے:-

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اور خود فیصلہ کیجئے کہ ان میں کونسا شعر اپنا اثر چھوڑ جاتا ہے۔
میں شعر میں تصوف کا رنگ بہت پسند کرتا ہوں، لیکن صرف اسی حد تک کہ شعر کی شعریت باقی رہے اور ہمارے وجدان کو اصطلاحات تصوف میں الجھا کر تباہ نہ کیا جائے۔
اصغر کے یہاں تصوف کا رنگ اکثر و بیشتر یہی ثقیل صورت اختیار کر لیتا ہے اور اسی لئے میں اسے پسند نہیں کرتا
(نیاز)

Marfat.com

کو ملا دیجئے اصغر کی شاعری کا ہیولیٰ بن جائے گا۔[۱] جس طرح مومن کے اشعار ہمیں دعوت غور وفکر دیتے ہیں اسی طرح اصغر کا کلام بھی ہمیں فوراً لطف اندوز نہیں ہونے دیتا، میر وحسرت کی طرح آپ اس کے کلام کو سنتے ہی سر دھننے لگیں ممکن نہیں، یہ شعر گوئی اچھی ہے یا بری یہ طبائع کے ذوق و وجدان اور امعان نظر پر موقوف ہے نیاز صاحب جب مومن کی شاعری کو پسند کرتے ہیں، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اصغر کی یہ دقت پسندی اُن کو ناگوار گزرے[۲]

اصغر غالب کے صوفیانہ افکار سے پوری طرح اثر پذیر ہیں، سر سپرد نے اصغر کے کلام پر نہایت بصیرت افروز طریقہ سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

---

[۱] مجھے اس تجزیہ سے اختلاف ہے۔ مومن کی تو اصغر کو ہوا بھی نہ لگی تھی اور غالب کے تصوف سے بھی انھیں کوئی واسطہ نہ تھا، اصغر کی شاعری کے اجزائے ترکیبی میری رائے میں تین ہیں غالب کی دقت پسندی، اقبال کی گہرائی اور خود اُن کا ذاتی "صوفی پن" سو اپنی کم علمی کی وجہ سے وہ غالب و اقبال کے رنگ کو تو نباہ نہ سکے، رہ گئی ان کی صوفیت، سو چونکہ وہ بھی اصطلاحی قسم کی مستعار صوفیت تھی، اس لئے "شاہد و مشہود" کے خشک استدلالات سے آگے نہ بڑھ سکی۔

اصغر بہت ذہین شخص تھے اور فطرت کی طرف سے انھیں سوچنے کا اچھا سلیقہ عطا ہوا تھا؛ لیکن افسوس ہے کہ مافی الضمیر کے اظہار کے لئے ان کو مناسب الفاظ نہ ملتے تھے۔ لیکن اگر کسی جگہ وہ اس میں کامیاب ہوگئے ہیں تو اس میں شک نہیں کہ بے مثل شعر کہہ گئے ہیں (نیاز)

[۲] کجا مومن کی دقت آفرینی اور کجا اصغر کی اہمال پسندی، مومن "محذوفات" سے فنی اشارے (Artistic Suggestion) پیدا کرتا ہے اور اصغر "زوائد" سے مفہوم کو مسخ اور انداز بیان کو غیر شاعرانہ بنا دیتے ہیں "دشتان بین خل وخمر" "شراب سرکہ میں کچھ تو فرق کرنا چاہئے" (نیاز)

Marfat.com

”حکیمانہ خیالات کو جن میں جذبات کی شدت و لطافت بھی ہو، شعریت کے رنگین و پُر کیف لباس میں پیش کرنا جناب اصغر کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جسے ان کے ہر ناقد نے تسلیم کیا۔ (مقدمہ ”سرودِ زندگی“ صفحہ ۸)

موصوف کی رائے اپنی جگہ پر بالکل قطعی ہے، اصغر کہتے ہیں :-

میں ہوں ازل سے گرم روِ عرصۂ وجود　　میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے

اس شعر کے پڑھنے کے بعد ہم کسی قدر سوچ میں پڑجاتے ہیں کیا واقعۃً اصغر نے جو تخیل اپنے شعر میں پیش کیا ہے اس پر ان کا اعتقاد بھی تھا، اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو ان کے شعر سے فلسفہ کا ایک خاص مسلک ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

جرمنی کے شہرۂ آفاق فلسفی ”ہیگل“ کی طرح اسی سرزمین کا ایک اور مفکر ”ہیکل“ (Haeckel) گزرا ہے وہ کہتا ہے کہ حدوث کے سوا کوئی شے مستقل و پائدار نہیں، صرف ”جوہر“ قدیم اور ناتغیر پذیر ہے، خواہ ہم اس جوہر کو فطرت یا ہیولیٰ سے تعبیر کریں یا خدا یا روحِ عالم سے۔ ”جوہر“ کا قانون ہمیں سکھاتا ہے کہ وہ ہمارے سامنے لامتناہی انواع و اقسام کی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کی مخصوص صفات مادہ اور قوت مستقل ہیں، جوہر کے تمام انفرادی اشکال و صور برباد ہو جانے والے ہیں اصغر نے بھی ہستی کی گرم روی کا جو فلسفہ بیان کیا ہے وہ ہیکل سے ملتا جلتا ہے[1]۔

---

[1] اسی قسم کے مباحث شعر کو مکردہ بنا دیتے ہیں اور تصوف کا یہی وہ پہلو ہے جس نے تصوف کو لغو اور بیکار کر دیا۔ (نیاز)

Marfat.com

اصغر کے کلام پر غالب کا کافی اثر ہے، اُن کے بعض خیالات، صوفیہ (بالخصوص رومی) کے افکار سے اثر پذیر معلوم ہوتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

نظامِ دہر کیا بیتابیوں کے کچھ مظاہر ہیں
گدازِ عشق گویا روح ہے اجزائے عالم کی

شعاعِ مہر خود بیتاب ہی جذبِ محبت سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

اس سلسلہ میں رومی کی وہ غزل پڑھئے جس کے دو شعر یہ ہیں :۔

تن من چو ماہ ماند کہ زعشق می گدازد
دل من چو زنگ زہرہ کہ گسستہ دار بادا

بہ گداز ماہ منگر بہ گسستگی زہرہ
تو حلاوت غمش بیں کہ یکے ہزار بادا

اصغر فرماتے ہیں کہ "نظام دہر جسے تم کہتے ہو، وہ کوئی نظام ہے تھوڑا ہی، دہر ایک تماشاگاہ بیتابی ہے، عالم کے اجزائے ترکیبی ہی میں عشق کی گھلاوٹ ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ آفتاب بھی کشش عشق کی بنا پر شبنم کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، ورنہ بیچاری شبنم میں جو اُڑنے کی طاقت ہے وہ ہمیں اور آپ کو معلوم ہی ہے، رومی کہتے ہیں کہ میرا جسم عشق سے اسی طرح گھلا جارہا ہے جس طرح چاند گھل گھل کر گھٹتا ہے، اور میرا دل چنگ زہرہ کی طرح گسستہ تار ہے پھر فرماتے ہیں کہ چاند کی گھلاوٹ اور زہرہ کی گسستہ تاری پر نہ جاؤ، بلکہ انکی حلاوت غم پر غور کرو، کہ جس نے ایک شے کے مختلف اجزا کر دئے"۔ اصغر نے جہاں فلسفیانہ اشارات اور صوفیانہ رموز پیش نہیں کئے وہاں اُن کے کلام میں اور زیادہ کیفیت پیدا ہوگئی ہے، فرماتے ہیں :۔

بہائے درد و الم درد و غم کی لذت ہے
وہ ننگ عشق ہے جو آہ ہو، اثر کے لئے

Marfat.com

ان کا یہ شعر مجھے بیحد پسند ہے:-

نہ میں دیوانہ ہوں اصغرؔ نہ مجھ کو شوق عریانی
کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

"جیب و گریباں" پر کسی صاحب نے اعتراض کیا تھا جس کا جواب نیاز صاحب نے دیدیا ہے

جگر۔ جگر کا کلام "شعلۂ طور" کے نام سے میرے پیش نظر ہے، اس کی ورق گردانی کرنے کے بعد جو عجیب و غریب چیز نظر آئی وہ جناب سید سلیمان ندوی کا تعارف ہے۔ سید سلیمان صاحب میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں بعض خطرناک یا تکلیف دہ قسم کی کمزوریاں بھی ہیں، سید صاحب اپنے استاد مولانا شبلی کی طرح علم و ادب کے ہر شعبہ پر کچھ نہ کچھ اپنا تصرف ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ شبلی مرحوم تو (Genius) تھے، نباہ لے گئے، ہر چند اس زمانہ میں مشکل ہی سے ان کی کوئی تصنیف ہوگی جو محققین کی ایراد و اعتراض سے پاک ہو، ان کے حوارین کہہ سکتے ہیں اعتراض تو قرآن پر بھی ہوتا ہے، لیکن میں کہونگا کہ ایسا اعتراض نہیں بلکہ المبرد کی طرح جس نے، ابو نواس کے چند شعروں پر اعتراض کیا تھا اور جسے اس نے اپنی کتاب العقد میں درج کیا ہے۔ ابن خلکان "وفیات الاعیان" میں اپنا ایک خواب لکھتے ہیں، جس میں المبرد ظاہر ہوتا ہے اور آپ معترضین کے اقوال نقل کرتے ہیں جو ابو نواس کے سلسلہ میں اس کے ایراد پر لوگوں نے کئے ہیں، وہ خواب میں بھی اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہے، شبلی مرحوم اگر زندہ ہوتے تو اُن کو سیرۃ النبی، سیرۃ النعمان، شعر العجم کی خامیاں اور غلطیاں ماننا ہی پڑتیں مگر ہمارے سید صاحب کہ قدرت کی طرف سے شبلی جیسا ذہن بھی نہیں لے کر آئے ہیں اس پر آپ کی یہ اپج حد درجہ حیرت انگیز ہے، انسان بھی ذوق نمود سے بعض اوقات کس

Marfat.com

حد تک مجبور ہو جاتا ہے۔ نتیجہ وہی ہوا کہ ارض القرآن، سے لیکر آپ کی کل تصنیفات پر لوگوں نے اعتراضات کی بھرمار کر دی اور آج تک آپ کسی کا شافی جواب نہ دے سکے ممکن ہو کسی کا جواب دیا ہو، میری نظر سے نہیں گزرا، بہرحال شعلہ طور کا تعارف بھی سید صاحب کی اس جابرانہ تصرفات کی قسم کی چیز ہے، اس سے پہلے جناب نیاز صاحب نے "نگار" میں آپ کے ذوق شعری پر تبصرہ کیا تھا، ابھی تک آپ کا وہ مقدمہ داغ جگر نظر سے نہیں گزرا، میں آج تک سمجھے بیٹھا تھا کہ نیاز صاحب نے سنجیدہ شوخی کی، اور پھر کبھی فرط ہیجان میں وہ ایسا کر بیٹھتے ہیں گو جب وہ شوخ سنجیدگی پر اتر آتے ہیں تو اپنی مثال نہیں رکھتے۔

سید صاحب کا "تعارف" پڑھنے کے بعد میں دنگ رہ گیا۔ کیونکہ آج تک مجھے صرف یہ خبر تھی کہ لوگ ان کی علمی تحقیقات اور ادبی ذوق کے منکر ہیں میرے اندر کبھی بھولے سے بھی یہ بدعقیدگی نہیں پیدا ہوئی کہ سید صاحب کے اخلاق و سلوک کی طرف سے بھی کبھی شک وارتیاب ہو سکتا ہے۔ اگر میں نے شعلہ طور "میں" تعارف "کے یہ چند سطور پڑھے تو آپ یقین مانئے کہ خلاف معمول میری طبیعت میں سخت قسم کی برہمی پیدا ہوئی فرماتے ہیں:-

"اس وقت حاضرین میں، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبدالسلام صاحب ندوی اور دوسرے کمرے میں جہاں آواز جا سکتی تھی، پروفیسر عبدالباری صاحب ندوی تھے اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر سخن فہمی کا مدعی اور موجودہ شعرا کے عیب و ہنر سے واقف۔ ان عنایت فرماکے اس تعارف نے گدگدی پیدا کی اور جی چاہا کہ شاعر صاحب سے کچھ سُنا جائے اور ان کے اس دعوی سخن وری کا امتحان لیا جائے، سب کی نظریں

Marfat.com

ایک خاص نگاہ تبسم کے ساتھ شاعر کے چہرے کی طرف اُٹھیں، مگر اس نے اس ماحول سے بے پروا ہو کر ایک عجیب درد انگیز ترنم مست لہجہ اور سرشارانہ انداز میں ایک غزل کا ترانہ چھیڑا ایک دو شعر پڑھے تھے کہ سب کو سنبھل جانا پڑا، ذہن کی رو کو ظرافت سے متانت کی طرف پھیرنا پڑا تبسم کی نگاہ میں تحیر ہوا" (شعلۂ طور صفحہ ۲-۳)

میں نہیں کہہ سکتا مولویانہ بطون کی اس سے بڑھ کر کوئی افسوسناک تشہیر ہوسکتی ہے میں پوچھتا ہوں، یہ نووارد شاعر جگرؔ تھے، اُنھوں نے شبلی ہال کے ڈنگل میں سب کو پچھاڑ دیا، اگر کوئی معمولی درجہ کا انسان ہوتا، تو کیا آپ اپنے زعم کمال میں اس طرح کنکھیاں چلاتے، اس طرح پھبتیاں کرتے، یہ حال ہے اُس جماعت کا جو جلوۂ محراب و منبر کے وقت زور و کر "ان الذین اجرموا کانوا من الذین آمنوا یضحکون واذا مروا بھم یتغامزون واذا انقلبوا الی اھلھم انقلبوا فکھین" کا وعظ کہا کرتی ہے جو اپنے ظاہری تقدس اور مصنوعی ریزش جبیں کے صلہ میں قوم سے دست بوسیوں کی طلبگار رہے ؎

گرنہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

گر ہمیں بداں دیدہ کا ینجا نہ شود گریاں

آپ ہی جیسے حضرات کی کرامت نے تو علما کی شان برقرار رکھی ہے، سچ ہے صومعہ سے نکل کر جب کوئی مولوی صنم خانہ اور میکدہ میں پہونچتا ہے تو اُس کی گرم نگاہیاں اور دست درازیاں بڑے سے بڑے کہنہ مشق شاہد بازوں، اور بلا نوش میخواروں کو بھی شرما دیتی ہیں۔ اسی "تعارف" کے سلسلہ میں ہمارے مولانا فرماتے ہیں:۔

"آخر اعظم گڈھ اور شبلی منزل کی یہی تحسین و آفرین تھی، جو داغ جگر کی دل پذیرہ

Marfat.com

شکل میں ملک کے سامنے آئی اور سب نے جگر کو جگر جانا "میں اس پر صرف اس جملہ کا اضافہ کر دینا چاہتا ہوں کہ شبلی منزل کی اس جگر نوازی کی اشاعت میں حضرت نیاز نے بھی بہت بڑا حصہ لیا ورنہ دنیا جگر کے محاسن شعری کا احساس تو کبھی نہ کبھی ضرور کرتی مگر شبلی ہال کا ذوق سخن فہمی پردۂ کتمان ہی میں رہ جاتا سید صاحب جگر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں "جگر مست ازل ہے اس کا دل سرشار الست ہے، وہ محبت کا متوالا اور عشق حقیقی کا جویا، وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بتخانے کی گلی سے کعبہ کی شاہراہ کو اور خمخانہ کے بادۂ کیف سے خود فراموش ہو کر بزم ساقی کوثر تک پہونچنا چاہتا ہے:

جی ہاں، مولانا سچ کہا وہ تو جگر نے خود ہی فرمایا ہے:۔

قدم ڈگمگائے نظر بہکی بہکی
جوانی کا عالم ہے سرشاریاں ہیں

اس وقت مجھے جناب نیاز کے یہ جملے بے طرح یاد آرہے ہیں کہ "جگر کی شاعری پر نقد و تبصرہ کرنے سے سید سلیمان ندوی کا مقصود یہ کچھ تھوڑا ہی تھا کہ جگر کے محاسن شعری پر روشنی ڈالی جائے، بلکہ خیال یہ تھا کہ اپنے ذوق سخن فہمی پر مہر توثیق ثبت کردی جائے"۔

اور میرے خیال میں سید صاحب نے یہ کر ڈالا، "فبای حدیث بعدہٗ یومنون"۔ اب آئیے جگر کی شاعری پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جگر نے اصغر کی تربیت و اصلاح سے استفادہ کیا جس کا اعتراف خود انھوں نے شعلۂ طور میں کیا ہے، جگر کے بہت سے اشعار میں اُستاد کے رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے، لیکن ہر جگہ جگر کی انفرادیت بھی قائم ہے، جگر نے اصغر کی طرح غالب و مومن کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

Marfat.com

ان کے بعض اشعار سے جگر کے کلام کا توارد ہو گیا، جگر کا شعر ہے:-

عشق کو مطمئن نہ رکھ حسن کے اعتماد پر　　وہ تجھے آزما چکا تو اُسے آزمائے جا

غالب کا مشہور شعر ہے:-

حسن اور اُس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم　　اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

دونوں شعر ایک ہی مرکزی تخیل کے پرتو ہیں۔

مومن کہتے ہیں:-

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

جگر کا شعر ہے:-

وہ ہمارے قریب ہوتے ہیں　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس سے معلوم ہوتا کہ غالب و مومن کے مطالعہ نے جگر کے تخیل پر اپنے کافی نقوش چھوڑے ہیں، اس حد تک کہ بعض اوقات وہ غیر شعوری طور پر اُن کے کلام کو اپنا کلام سمجھنے لگتے ہیں۔

سید سلیمان صاحب ندوی نے "تعارف" میں ضمناً حافظ، خیام اور ابن یمین کا نام لیا ہے، لیکن یہ نہیں لکھا کہ اردو میں حافظ کے رنگ کا کوئی شاعر ہو سکتا ہے تو وہ جگر ہے وہی سرشاری، وہی میخواری، وہی رنگینی و شاہد بازی جس پر تصوف کا دھوکہ ہو جائے جگر کے یہاں بھی ہیں، خواجہ حافظ کی شاعری نشاط و ابتہاج، رجائیت و تفاول (Optimism) کی شاعری ہے ان کے یہاں آرزو و تمنا کی ربوبیت بدرجہ اتم

Marfat.com

یہاں تک کہ جب وہ اپنے شاہد کو "حبیب بادہ پیما" کے ساتھ بادہ نوشی کے لئے مستعد پاتے ہیں تو بھی "بہ یاد آر حریفانِ بادہ پیمارا"، کہہ بیٹھتے ہیں جو رجائیت کی انتہا ہے۔

جگر کی غزلیں پڑھنے والے کے دل و دماغ پر ایک کیف و سرمستی پیدا کر دیتی ہیں، ان کی بعض غزلیں جو بحر طویل میں ہیں حد درجہ اثر آفریں ہیں، ان کا شعر ہے:۔

عجب انقلاب زمانہ ہے مرا مختصر سا فسانہ ہے

یہی اب جو بار ہے دوش پر یہی سر تھا زانوئے یار پر

پوری غزل پڑھ جائیے، اس کا ہر شعر ایک کیفیت و اثر میں ڈوبا ہوا ہے اسی طرح ان کی وہ غزل بھی بہت دلآویز ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے:۔

اسے حال و قال سے واسطہ نہ غرض مقام و قیام سے

جسے کوئی نسبت خاص ہو ترے حسن برق خرام سے

فانی۔ جس طرح شبلی اپنے عہد بلکہ اپنی صدی کے سب سے بڑے غزل گو کی حیثیت سے ہمیں میر سے قریب نظر آتا ہے، اسی طرح فانی اسکاٹ لینڈ کے مشہور ترین غزل گو رابرٹ برنس کے مثل معلوم ہوتے ہیں۔ اہل نظر ان کو عہد حاضر کا میر کہتے ہیں میرا خیال ہے ضیا اور فانی اور بڑی حد تک قائم میں بھی میر ہی کا سوز و گداز پایا جاتا ہے، ضیا تو بقول مصحفی، میر کے شاگرد ہی تھے، (تذکرہ ہندی گویان ذکر ضیا) فانی کے اندر میر کی شاعرانہ رفعت خیال تو نہیں لیکن والہانہ جذبات وہی ہیں، میر ہی کی طرح ان کے یہاں بھی غم سرمایہ نشاط بن جاتا ہے۔ فانی کے مشہور اشعار ہیں:۔

Marfat.com

چلے بھی آؤ یہ ہے قبر فانی دیکھتے جاؤ — تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ
سُنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے — کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

حسرت اور فانی میں فرق یہ ہے کہ حسرت کی غمناکیوں کے اندر ایک جانکاہ کیفیت ہو اس کے برعکس فانی کے یہاں غم میں بھی ایک ولولہ ہے، وہ اس سے بھی ایک لذت انگیز کیفیت حاصل کرتے ہیں، فانی کا دوسرا شعر غالب کے اس خیال سے مل جاتا ہے

زمن بہ جرم تپیدن کنارہ میکردی — بیا بہ خاک من و آرمیدنم بنگر

یہ فخر صوبہ یوپی کو حاصل ہے کہ ہندوستانی ادب اور مسلمانوں کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کرنے کی خدمت اسی سرزمین کے ہونہار فرزندوں نے انجام دی۔ گو حالی نے اردو ادب میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی اور اُن کا مسدس اُردو ادب کا ایک غیر فانی شاہکار ہے لیکن اسمٰعیل میرٹھی نے بھی کم خدمت نہیں کی ہے۔ ان کی اخلاقی، قومی اور اصلاحی نظموں اور اکبر کی فوخ تنقیدوں نے نہ صرف مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں ایک عالمگیر آگہی و بیداری پیدا کر دی بلکہ وہ اقبال، جوش، سیماب جیسے باقیات صالحات بھی چھوڑ گئے جنھوں نے ان کے مشن کو ترقی دی، اور نہیں کہا جا سکتا ارتقار کا یہ سلسلہ کس سطح پر جا کر تمام ہوگا۔ یہ بات لطف سے خالی نہیں کہ اُردو ادب کی اس نئی صنف کو ترقی دینے میں یو۔پی ہی کے نوجوانوں اور پختہ کاروں نے زیادہ حصہ لیا، گو اُردو نظم کے بانی مولانا حالی پنجاب کے رہنے والے تھے، لیکن اسمٰعیل، جوش، سیماب اور احسان کا وطن یوپی ہی ہے۔

Marfat.com

جوش نے تغزل کی طرف سے گویا منہ موڑ لیا ہر چند ان کی کتاب "شعلہ و شبنم" میں ان کی قدیم غزلوں کے ساتھ جدید غزلیں بھی چھپی ہیں، اب انھوں نے نظم نگاری ہی کو اپنا طرۂ امتیاز بنا لیا اس صنعت پر ان کی قابل قدر کتابیں "نقش و نگار" "شعلہ و شبنم" اور "فکر و نشاط" وغیرہ شائع ہو چکی ہیں ان کے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ حالی نے اردو ادب میں جس صنف کی داغ بیل ڈالی تھی، اور جسے اقبال نے مغربی ادب کے امتزاج سے چمکایا، جوش بھی اسی نخل کی آبیاری کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جوش ابھی حکیمانہ ارشاد و پیام کے لحاظ سے اقبال کی سطح سے بہت نیچے ہیں اقبال نے یورپ جاکر اس صنف کا گہرا مطالعہ کیا اور جرمن اور انگریز شعراء سے کافی طور پر استفادہ کیا، اقبال اپنی علمی استعداد کے اعتبار سے انگریز شاعر گولڈ سمتھ اور ندرت فکر کے اعتبار سے گوئٹے کی ہمنوائی کرتے ہیں پھر اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ جوش کی نظموں میں اقبال سے زیادہ ادبی شگفتگی اور کشش پائی جاتی ہے۔ الغرض اقبال کے بعد نظم نگاروں میں اول درجہ جوش ہی کا ہے ان کی کتاب "شعلہ و شبنم" بہت سی اخلاقی اور قومی نظموں کی حامل ہے شعلہ و شبنم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بائرن (Byron) سے بہت قریب ہیں۔ بائرن کی ہنگامہ زائیوں نے اسے عرفی کی طرح وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا میزینی (Mazzini) کا بیان ہے کہ قریب تھا کہ یورپ سے اس کو نکالا جائے، جوش کی نظمیں "نازک اندامان کالج سے خطاب" اور "ذاکرے خطاب" اسی نوع کی چیزیں ہیں۔

جوش کے بعد سیماب کے کارنامے نظر آتے ہیں آپ کی کتابیں "کلیم عجم" اور

Marfat.com

"کارامروز" چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، اقبال کی طرح داغ ہی سے تلمذ حاصل ہے۔

سیماب کی کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں تخلیقی (Productive) سے زیادہ (Reproductive) رجحان کا غلبہ ہے "کلیم عجم" اور "کار امروز" میں ان کی بہت سی نظمیں ہیں لیکن ان میں بیشتر تقلیدی رنگ پایا جاتا ہے، آپ کی ایک نظم گوتم بودھ پر ہے اس میں فرماتے ہیں :-

روشنی جس کی نہ ہوگی ماندہ وہ مشعل ہے تو　　　سرزمینِ ہند کا عرفانی اول ہے تو

پہلے تو "عرفانی اول" کی ترکیب ہی کچھ غیر مانوس سی ہے، اس کے علاوہ آپ کا یہ دعویٰ بھی واقعات کے اعتبار سے صحیح نہیں گوتم بودھ سے پہلے جین مذہب کے چوبیس "تری تھنکر" پیدا ہو چکے ہیں اور یہ سب بہت بڑے زاہد مرتاض اور عارف باللہ گزرے ہیں خود گوتم بودھ کے معاصر مہاویر جی جن کا مولد صوبہ بہار کا ایک مقام "کنڈ گام" ہے۔ "بودھ" سے زیادہ معمر تھے، اور گوتم سے پہلے مر گئے[1]۔

سیماب صاحب نے "مولد غالب" پر ایک نظم لکھی ہے، فرماتے ہیں :-

مولدِ غالب کی یہ ویرانیاں مٹ جائیں گی　　　نغمۂ سیماب اس پر زندگی برسائے گا

ویرانیوں کا مٹ جانا کچھ عجیب سی بات ہے[2] آثار باقیہ البتہ مٹا کرتے ہیں، اس سے

---

[1] The comparative study of Religion مرتبہ فارلنگ

[2] کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ شاعر کا مقصود یہی ظاہر کرنا ہے کہ میں اپنے نغمے سے اسکی ویرانیاں مٹا دوں گا۔　(نیاز)

Marfat.com

مقصود یہ نہیں کہ میں سیاب کی شاعری پر ایراد کروں بلکہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ شاعری سے زیادہ جس کا دورِ عہد صبوت سے خود کو شیفتہ بتاتے ہیں نثر نگاری ان کو زندگی میں کامیاب بناتی اور وہ مفید تر خدمتیں انجام دے سکتے، ان کے ادبی خطبے جو اُنھوں نے ہندوستان کے مختلف طول و عرض میں شرکت مشاعرہ کی تقریب میں پڑھے ہیں، نظموں سے زیادہ مفید ہیں، بالخصوص وہ خطبے جو اُنھوں نے مشاعرہ بزم ادب جہلم اور نائی منڈی آگرہ میں پڑھے ہے

(دکلیم عجم صفحہ ۱۴۱ - ۱۵۵ - اور صفحہ ۱۶۱ - ۱۷۱)

ابھی تک تو "جدید لکھنؤ اسکول" کی شاعری پر انفرادی حیثیت سے بحث کی گئی ہے. اب آیئے قدیم لکھنؤ اسکول کی اُس خصوصیت پر بھی ایک طائرانہ نگاہ ڈال لی جائے جس نے بہیئت مجموعی ایک مخصوص رنگ اختیار کیا اور جس کے علمبرداروں میں بعض ہماری نظروں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہوگئے اور کچھ تبرکات کی حیثیت سے ابھی قائم ہیں. جس طرح دہلی اسکول غالب اور مومن کے بعد فنا ہو گیا اور باوجودیکہ خاندان مومن میں تسیم خاندان غالب میں حالی اور خاندان ذوق میں داغ ہوئے لیکن اُنھوں نے اپنے اُستادوں کی شاہراہ سے الگ ہٹ کر شاعری شروع کی. اسی طرح لکھنؤ اسکول بھی خاندان ناسخ کے نام لیوا سید ضامن علی جلال اور خاندان اسیر کے چشم و چراغ امیر مینائی پر ختم ہو گیا اور اس کے بعد لکھنؤ اسکول میں عزیز، ریاض، صفدر، صفی، نوح، اثر ہوئے اور سب نے بہ اشنائے حضرت نوح مختلف راہیں اختیار کیں، عرصہ ہوا آرہ میں ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا تھا. دہلی، اودھ اور بہار کے بڑے بڑے شعرا تشریف لائے تھے، میرے بچپن کا زمانہ تھا

Marfat.com

صفدر اور نوح بھی رونق افروز بزم تھے، حضرت نوح نے اپنا کلام سنایا اس کے نقوش اس قدر گہرے تھے کہ اب بھی وہ نقشہ اور سماں پیش نظر ہے، اس کے بعد کبھی نوح کا کلام ان کی زبانی سننے کا اتفاق نہ ہوا، آپ کے کلام میں قدیم لکھنؤ کی شاعری کا پورا اثر ہے اُس وقت بھی میں نے یہی محسوس کیا کہ آپ نے صنائع لفظی سے زیادہ کام لیا تھا، اور اب بھی میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا ہے۔ ریاضؔ پر داغؔ کا کافی اثر ہے۔ ان کی خمریات کے مطالعہ سے بے اختیارانہ — ابونواسؔ کی یاد آتی ہے، ان کی طبیعت کی رنگینی اور شباب نا سر مستی دل کے اندر غیر معمولی ابتہاج، وہیجان پیدا کر دیتی ہے، عہد پیری میں ان کے کلام کے اندر اتنی شوخی ہے کہ ان کے بڑھاپے پر جوانی کا دھوکہ ہوتا ہے، فرماتے ہیں:-

ہم تو بس اس ادا پہ مرتے ہیں ۔۔۔ منھ چھپائے جو کوستا جائے

اور یہ چھیڑ یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس پر طرہ یہ ہے:-

کوئی منھ چوم لے گا اس نہیں پر ۔۔۔ شکن رہ جائے گی یونہی جبیں پر

آپ کا ایک شعر ہے، اس کا تیور، اور انداز بیان قابل دید ہے:-

بڑے پاک باطن بڑے صاف طینت ۔۔۔ ریاضؔ آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

الغرض، جرأتؔ، داغؔ، ریاضؔ زندگی کو ابیقورین فلسفہ کی طرح عیش و خرمی میں بسر کر دینا اپنا نصب العین سمجھتے تھے یہ شوخی، لذت و نشاط صاف بتا رہی ہے کہ ان کی طبیعت کا اُٹھان ہی ایسا تھا کہ وہ زندگی کو ہنسی اور ٹھٹھول کے سوا کسی سوگ و برگ میں

Marfat.com

ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے، بعض انسان طبعاً نشاط پسند ہوتے ہیں ریاضؔ بھی انھیں لوگوں میں تھے۔

چند ماہ گزرے پوجا کی تعطیل میں جب میں پہلے پہل لکھنؤ آیا، تو یہاں کے بعض بزرگوں سے نیاز حاصل کیا۔ اسی سلسلہ میں حضرت صفیؔ کے دولتکدہ پر بھی حاضری دی، آپ وضع قطع اخلاق، وطرز انداز بیان، الغرض اپنے صوری ومعنوی خصوصیات کے لحاظ سے قدیم لکھنؤ کی تہذیب وشائستگی، کی باقیات میں سے ہیں، آپ سے درخواست کی گئی کہ اپنے کلام سے فیض یاب فرمائیں، آپ نے بزرگانہ محبت کے تبسم کے ساتھ اسے قبول فرمایا اور اپنی ایک غزل پڑھی سن کر میں بڑی دیر تک سوچتا رہا کہ تذکروں میں لکھنؤ اسکول کی شاعری اور لکھنؤ کے شعرا کے کلام کا جو حصہ نظر سے گزرا ہے اس سے ہٹ کر یہ دوسری چیز معلوم ہوتی ہے۔ میں آرہ واپس آیا، لیکن قیام لکھنؤ کے بعض تصورات مہینوں دل ودماغ پر مسلط رہے ان میں اُمید امیٹھوی کا فسانۂ غم اور حضرت صفیؔ کی غزل کا ایک شعر بھی تھا، جب کبھی غم روزگار سے فرصت ملتی تو صفیؔ کا وہ شعر جس کا صرف اب ایک مصرعہ یاد رہ گیا۔۔۔ بلبل کی طرح نالہ یا اشک بہانا ہے، گنگناتا اور سر دھنتا صفیؔ نے اس شعر میں یہ پیام دیا ہے کہ "اس منزل ہستی میں انسان کو چین کہاں نصیب، اس کی قسمت میں تو بلبل کی طرح نالہ کرنا یا شمع کی طرح اشک بہانا لکھا ہے"، حضرت نے اپنی تالیفات کا تذکرہ کیا جن میں ایک "تنظیم حیات"، ہے اور بعض دوسری غیر مطبوعہ تصنیفات کا حال بیان فرمایا، الغرض میں آپ کی شاعری اور اخلاق دونوں سے بہت متاثر ہوا۔

Marfat.com

یہاں تک تو تصویر کا ایک رُخ تھا، لیکن اس کے دوسرے رُخ پر اُس وقت نظر پڑی جب میں لکھنؤ آیا انجمن بہار ادب کے ارکان و منصب داروں کی علمی سرگرمیاں دیکھیں اور بزم مشاعرہ میں شعرائے لکھنؤ کا کلام سُنا۔ میں نے اس سے قبل جو کچھ لکھا تھا اس کا ماخذ مطبوعہ کتابیں تھیں، تذکرے تھے، اور بعض سُنی سنائی روایتیں، لیکن لکھنؤ میں آ کر ایک دوسری دنیا نظر آئی، جو حد درجہ دلچسپ بھی تھی اور حیرت زا بھی، یقیناً میں نے عہد حاضر کے لکھنؤ اسکول کے متعلق جو کچھ لکھا تھا وہ بالکل سنگین حقیقت ہے اور خاص لکھنؤ والے اپنے تخیل کدہ کے کتنے ہی عجیب و غریب نقوش کیوں نہ پیش کریں، میری رائے میں ترمیم نہیں ہوسکتی۔

میں نے اپنے مقالہ میں لکھنؤ اسکول کی جدید شاعری کا میار حسرت، اصغر، جگر، فانی، جوش، سیماب، صفی، اثر، آرزو کے کلام کے مطالعہ کی بنا پر قائم کیا تھا، یقیناً ان حضرات نے قدیم لکھنؤ اسکول کی روش سے ہٹ کر غزلیں لکھیں، بعض حضرات کو تشکوک ہونگے کہ حسرت، اصغر، جگر، فانی، سیماب وغیرہ کو دہلی اسکول کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ان کے کلام میں دہلی اسکول کا رنگ پایا جاتا ہے اور انھوں نے دہلوی اساتذہ سے اصلاحیں لیں، حسرت نے نسیم دہلوی و مومن سے عقیدت کا اظہار کیا ہے سیماب خود داغ کے شاگرد ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ خود ان کے اساتذہ کے یہاں دہلی اسکول کے محاسن نہیں پائے جاتے بلکہ دہلی اور لکھنؤ کے امتزاج سے ایک نئے اصول کی جلوہ گری ان کے اساتذہ کے یہاں موجود ہے حسرت، اصغر اور فانی پر ان کے اساتذہ کا رنگ نہیں چڑھا

Marfat.com

بلکہ اُنھوں نے اپنا انداز بیان ہی جداگانہ اختیار کیا، یہی وجہ ہے کہ حسرت و اصغر، جگر و سیماب صوبۂ اودھ کے مشاہیر شعرا اور خاص لکھنؤ کے باکمال اساتذہ، اثر، آرزو و صفی کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد قدرتی طور پر میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ لکھنؤ اسکول کی شاعری میں انقلاب ہوگیا ہے اور اسی بنا پر میں نے اُسے ،، جدید لکھنؤ اسکول ،، سے تعبیر کیا، اگر بات یہیں ختم ہوجاتی تو کچھ مضائقہ نہ تھا لیکن انجمن بہار ادب نے اپنا تاریخی مشاعرہ کرکے دنیا کی نظروں سے عقیدت و ارادت کے بعض پردے اُٹھا دیئے، انجمن کی مجلس شوریٰ کے فیصلہ کے مطابق مجھے لکھنؤ آنے پر مجبور کیا گیا اور میں ۲۷ر فروری کو لکھنؤ پہونچا اور سرزمین اودھ کے اس مشہور جلوہ گاہ رنگ و نور میں قیام کیا جو اپنی آغوش میں عشرت ماضی کے بہت سے رنگین فسانے چھپائے ہوئے ہے۔ قیصر باغ کے ایک محل میں ٹھیرا جناب سراج، بدر الدین بدر اور احسان بن دانش سے بھی ملاقاتیں ہوئیں، تھوڑی دیر کے اندر پیاپے انجمن بہار ادب کے سرگرم ارکان نظم و نسق کے سلسلہ میں آئے، اور سب سے تعارف ہوا۔

"انجمن بہار ادب" کے اس تاریخی جلسہ میں مشاعرہ بھی تھا۔ اور مناظرہ و مناثرہ بھی اور سارے لائحہ عمل کو کامیاب بنانے کے لئے ارکان انجمن کی مستعدی قابل داد تھی، دہلی کانپور، لکھنؤ اور اس کے مضافات کے نامی شعرا آئے، اتوار کے دن شب کے وقت جب میں مشاعرہ میں شریک ہوا تو اتنا بڑا مجمع تھا کہ اتنا بڑا علمی مجمع میں نے صرف علیگڈھ میں اُردو کانفرنس کے موقعہ پر دیکھا تھا، قیصر باغ میں آخری شاہ اودھ کا دیوان عام سامعین کی کثرت اور علما و فضلا، ادبا و شعرا سے بھرا پڑا تھا آلہ کبر الصوت نصب کیا گیا تھا اور

Marfat.com

اسی کے سامنے شعرا نے اپنی غزلیں و نظمیں اور ادیبوں نے اپنے مقالے پڑھے۔

مشاعرہ کی مختلف صحبتوں میں حاضر رہا اور شام سے دو اور تین بجے شب تک گرمی محفل دیکھا گیا۔ مشاعرہ کی پہلی صحبت میں جب شریک ہوا، تو طلبہ کی تمسخر انگیز تالیاں، سامعین کا قہقہہ نواز شور و فغاں اور سب سے بڑھ کر شعرا کا کبر الصوت کے سامنے بے سُر تال کے لحن کے ساتھ نغمہ و ترنم دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ بار الٰہا یہ بزم مشاعرہ ہے یا کچھ اور؟ ــــ شعرا اپنا کلام سنا رہے ہیں یا موسیقی ذبح کی جا رہی ہے۔ یہ شاعرانہ ترنم ریزیاں جناب مجذوب کی بڑسے لے کر جناب قتیل و مانی کی بلند پایہ غزلوں تک، اور جناب روش کی عشقیہ غزلوں اور احسان بن دانش کی اثر انگیز نظموں سے لے کر جناب سراج اور قدیر کے سقیم شعروں[1] تک یکساں جاری و ساری تھیں، لکھنوی شعرا نے موسیقی کے پردوں میں خصایص شعریہ کو گم کر دیا، لکھنؤ میں آج وہی کامیاب شاعر ہے جو اچھا گویا ہے اور مشاعرہ میں اسی کو زیادہ داد مل سکتی ہے جو سب سے زیادہ الاپنے کی اہلیت رکھتا ہے، شعر و غنا کے اس لایعنی امتزاج نے اچھے اچھے شعرا کے کلام سے بھی لطف اندوز نہ ہونے دیا، جناب رضا و جناب ارم لکھنؤ کے خوش ذوق شعرا میں سے ہیں، جناب آرزو کی اصلاحوں نے ان کے اندر ایک مخصوص شاعرانہ اہلیت پیدا کر دی ہے، لیکن انھوں نے بھی اپنے شعر سے زیادہ اپنے نغموں کے ذریعہ لوگوں کو مسخر کرنا چاہا، اور مجھے اس کا اعتراف کرنے میں مطلق باک نہیں کہ

---

[1] میں نے یہ غزلیں نہیں دیکھیں، لیکن یہ جانتا ہوں کہ سراج و قدیر یہاں کے خوش گو و خوش فکر شعرا میں سے ہیں۔ (نیاز)

Marfat.com

جناب رضا شعر بھی اچھا کہتے ہیں اور اچھا گاتے بھی ہیں رضا صاحب کا وہ انداز شعر خوانی جس کا یہ اسٹیج پر مظاہرہ کرتے تھے، دل سے کبھی محو نہیں ہو سکتا، جب کبھی دماغ میں وہ نقوش ابھرتے ہیں تو بے اختیار ہنسنے کو جی چاہتا ہے، رضا صاحب اپنے پاکیزہ اخلاق کے لحاظ سے شاعر سے زیادہ انسان ہیں، اس لئے ان کی طرف سے دل میں ہر شخص ایک جذبہ لطیف محسوس کرتا ہے، اسی سلسلہ میں جناب عرشی بھی ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں وہ نہایت نیک سرشت اور بلند اخلاق کے انسان ہیں اور شعر کا بہت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں، وہ بھی گا کر پڑھتے ہیں، لیکن ایک خاص دلکش لحن میں کہ شعر کی خصوصیت بھی قائم رہتی ہے اور نغمہ کی دل آویزی بھی۔ ان سے مل کر مجھے بے انتہا مسرت ہوئی۔ انجمن بہار ادب کے اس مشاعرہ نے بہ حیثیت مجموعی میرے دماغ پر بہت برا اثر ڈالا، میں نے لکھنؤ اسکول کے دور جدید کے متعلق جو نظریہ قائم کیا تھا، اس سے خود لکھنوی شعرا کی اکثریت بہت دور تھی، اس میں شک نہیں عہد حاضر میں لکھنؤ اسکول تعبیر ہے، حسرت و اصغر، جگر و فانی، آرزو و اثر، صفی و آسی جوش، روش و احسان کی ذات سے لیکن ان میں صفی، آرزو و اثر کے سوا سب لکھنؤ سے باہر کے رہنے والے ہیں، لکھنوی شعرا میں جناب سراج و قدیر اور حضرت آشفتہ کے دوسرے تلامذہ[1] میں شاعرانہ ابتذال اور فنی و ادبی خامیاں ہیں اور یہ لوگ زیادہ تر مرثیہ خوانی و غنا نوازی کی طرف رجحان رکھتے ہیں[2]۔ اسی بنا پر میں نے رائے قائم کی تھی کہ مشاعرہ میں لکھنؤ

---

[1] سراج و قدیر، آشفتہ کے شاگرد نہیں ہیں۔ [2] میری رائے میں عبدالمالک صاحب کا یہ فیصلہ صحیح نہیں — ہو سکتا ہے کہ اس مخصوص جلسہ کی غزلوں میں خامیاں ہوں (حالانکہ میں نے انہیں نہیں سنا) لیکن عمومی طور پر یہ حکم لگا دینا کہ سوائے ابتذال و خامی یا مرثیہ و غنا کے ان کے کلام میں کچھ نہیں پایا جاتا زیادتی ہے (نیاز)

Marfat.com

کے شعراء نے جو غزلیں پڑھیں ان میں فنی و افادی خصوصیت تو خیر کیا، البتہ مرثیہ خوانی والا سوز وگداز ضرور پایا جاتا تھا، لکھنؤ کے یہ شعرا جدید لکھنؤ اسکول اور قدیم لکھنؤ دونوں سے بہت دور ہیں قدیم اسکول کی کم ازکم یہ اہمیت تو ہمیشہ قائم رہے گی کہ یہ زبان اور فن کے اعتبار سے بہت بلند سطح کی چیز ہے عہد حاضر کے اکثر لکھنوی شعراء نے مرثیہ میں تغزل کا رنگ اور شعر خوانی میں غنا کی صورت پیدا کر دی ہے، انجمن بہار ادب نے احسان و روش کو بلا کر بہت بڑی کامیابی حاصل کی ورنہ مشاعرہ تو کم ازکم بے کیف ضرور ہو جاتا، احسان کاندھلہ کے رہنے والے ہیں جو غالباً مظفر نگر کے مضافات میں ہے، اسی طرح روش کا وطن جوالا پور ضلع سہارنپور ہے، احسان کے اندر مطالعہ فطرت کا بہت گہرا ذوق ہے اور وہ بہت عمق نظر کے ساتھ مناظر کی جزئیات کا مشاہدہ کرتے ہیں، وہ احساسات کے اعتبار سے بہت ہی ذکی الحس اور جذبۂ الفت کے لحاظ سے مکمل انسان ہیں احسان کے دل میں ایک لازوال ہوک ہے، وہ ہر منظر سے عبرت و بصیرت کا پیام حاصل کرتے ہیں وہ ہر درد انگیز سماں دیکھ کر اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ ,,غم،، ان کی زندگی کا سرمایہ بن کر رہ گیا ہے، احسان کو کس چیز نے اس بلند سطح تک پہونچایا، ہر چند ان کی نجی زندگی کے معمولی واقعات بھی ہمارے پیش نظر نہیں لیکن میرا خیال ہے جس ماحول میں ان کی پرورش ہوئی وہ ان کے لئے حد درجہ حوصلہ آزما رہا ہے ہر زمانہ اور اہل زمانہ نے اپنی کم نگاہیوں سے ان کو ہمیشہ دردمند اور سوگوار رکھا، جہاں تک میرا گمان ہے وہ اس خاندان میں پیدا ہوئے جس میں شرافت کی سربلندی تو ضرور تھی لیکن دنیا کی نظر میں دولت و ثروت اور اعزاز و تکریم کے اعتبار سے اس کا کوئی خاص مرتبہ نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ احسان نے اس

Marfat.com

ماحول میں آنکھیں کھولیں تو خود اپنی زندگی ان کو سوگوار اور دردمند نظر آئی۔ اپنی پامالی اور زبوں حالی کے ساتھ ان کے اندر دنیا کے مصیبت زدہ انسانوں کے ساتھ بھی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے ان کی نظمیں مزدور کی عید اور مزدور کی موت وغیرہ حد درجہ اثر انگیز ہیں اُنھوں نے مشاعرہ میں اپنی نظم "مزدور کی موت" پڑھی تو سارا مجمع اشکبار تھا اور بے اختیار میرا جی چاہتا تھا کہ احسان سے لپٹ کر خوب روؤں، احسان کی یہ نظم ان کا شاہکار ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کی نظیر اُردو ادب میں مشکل ہی سے کسی دوسری جگہ مل سکتی ہے اس میں شک نہیں، احسان اپنے مبلغ علمی کے اعتبار سے کسی خصوصیت کے مالک نہیں یہاں تک کہ وہ زبان اور فن کی عامیانہ غلطیاں بھی کر جاتے ہیں، لاہور کے قیام نے ان کی زبان پر پنجابی محاورہ کا اثر بھی ڈالا ہے لیکن ان تمام خامیوں کے باوجود ان کی نظمیں اس قدر اثر انگیز ہیں جب وہ مجمع کے سامنے پڑھتے ہیں تو مجمع پر ایک کیف بیخودی طاری ہو جاتا ہے احسان اپنی معصومانہ فطرت نگاری کے اعتبار سے انگریزی زبان کے مشہور شاعر ورڈسورتھ سے بہت قریب ہیں۔

جناب روشن نوجوان شاعر ہیں، غزل بھی کہتے ہیں اور نظم بھی، شعریت ان پر اس قدر طاری ہے کہ یکسر حال نظر آتے ہیں، صورت میں بھی ایک خاص دلکشی ہے۔ ژولیدہ مو، سادہ وضع، مضطرب الحال، نوجوان شاعر جب پہلی مرتبہ اسٹیج پر آیا تو میں اسے دیکھ کر بیحد متاثر ہوا اس کی غزلیں ایک خاص پایہ کی تھیں، اس کی عمر اور اس کا رنگ تغزل، اس کا دلنواز لحن دیکھ کر مجھے بے اختیار کیٹس اور عبدالحی تاباں کی یاد آگئی، خدا اسے چشم زخم سے بچائے

Marfat.com

روشؔ نظمیں بھی اچھی کہتے ہیں، لیکن ان کی غزلوں کے عشقیہ رشحات سامعین کو بہت متاثر کرتے ہیں۔ جناب آسیؔ مضافات میرٹھ کے رہنے والے ہیں اور شاعری کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔ ان کے تلامذہ میں شوکتؔ، امینؔ اور عمر انصاریؔ ہیں۔ امینؔ نے میرے سامنے غزل نہیں پڑھی، شوکتؔ اور عمر انصاریؔ نے غزلیں پڑھیں اچھی تھیں۔

مناظرہ اور مذاکرہ کے لئے ۲۸، فروری کا دن مقرر کیا گیا تھا۔ بلند پایہ ادیب و ماہرین فن تشریف لائے تھے۔ جناب پروفیسر مسعود حسنؔ نے سنجیدہ پیرایہ میں لکھنؤ اسکول کے محاسن پر ایک بسیط مقالہ پڑھا۔ مسعود حسنؔ صاحب بہت کم درواقع ہوئے ہیں، اُنھوں نے مروت اور محبت میں بہت سی سطحی باتیں بھی کہہ ڈالیں۔ منیر احمد علوی کا مضمون ادب و انشا کے لحاظ سے تو اچھا تھا لیکن اس میں ضعف استدلال اور معنوی نوعیت کی بھی کمی نہ تھی، اُنھوں نے لکھنؤ اسکول کی تعریف و توصیف میں ہر وہ بات کہہ ڈالی جو ایک لکھنؤ پرست کے شایان شان تھی۔

قاضی خورشید حسنین اور ڈاکٹر عبد العلیم (پروفیسر مُسلم یونیورسٹی) نے لکھنؤ اسکول کی مخالفت میں تقریریں کیں، قاضی صاحب جوش میں اتنے بے تکلف ہوگئے کہ لکھنؤ والوں کو، "آپ لوگ سخت نالائق ہیں"، کہہ ڈالا، لیکن اُنھوں نے فنی خامیاں بھی دکھائیں ان کی بحث اچھی تھی، ڈاکٹر عبد العلیم صاحب کھڑے ہوئے تو لکھنؤ اسکول کی شاعری پر تنقید کرنے کی بجائے معاشیات اور سیاست مدن پر زور بیان صرف فرمانے لگے، آپ کے نزدیک شاعر کی یہ تعریف ہے کہ وہ اپنا کلام سنائے اور لوگ اس کو سُن کر عملی کارنامے پیش کریں۔ کوئی

Marfat.com

شاعر مزدور پر نظم لکھے تو لوگ صرف رو ئیں نہیں بلکہ عمل بھی کریں، یا للعجب! آپ نے ایک سانس میں میر سے لیکر تمام اُردو شعراء کو بے مایہ اور نا حقیقت شناس کہہ ڈالا، میر پر آپ نے عجیب و غریب تنقید کی، میرا تو قیاس نہیں یقین ہے کہ آپ نے آبحیات نہیں پڑھی۔ محمد حسین آزاد نے میر کے متعلق یہ نہیں لکھا ہے کہ ایک کمرہ میں وہ بارہ سال تک بند رہے، لیکن اس کے دریچہ کے باہر کی چیز کبھی نہ دیکھی، اس سے آپ نے یہ استدلال کیا کہ میر صاحب جب فطرت کے مطالعہ سے اس قدر بیگانہ تھے تو بھلا وہ حقیقی معنی میں شاعری کیا کرتے، چہ خوش!

آبحیات میں جو روایت ہے وہ میر صاحب کی شعریت و شاعرانہ محویت پر دلالت کرتی ہے اگر محمد حسین آزاد کی روایت کا یہ مفہوم نہ ہوتا جب بھی ڈاکٹر صاحب کو سمجھنا تھا کہ دنیا میں بہت سے نابینا شاعر گزرے ہیں، اور ان کے کمال سے تاریخ کے صفحات بھرے ہیں ایک ابو العلا معرّی کی مثال لے لیجئے یہ نابینا شاعر تھے، ہومر بھی نابینا تھا۔ عہد حاضر میں مصر کا مشہور ادیب و نقاد ڈاکٹر طہٰ حسین نابینا ہی ہے۔ ملٹن بھی آخری عمر میں بصارت سے محروم ہو گیا تھا، کیا دنیا اُن کے کمالات سے انکار کر سکتی ہے۔

اب دو حضرات اور باقی رہ جاتے ہیں ان میں ایک نے اپنے مزاحیہ مضمون اور دوسرے نے اپنی رنگین تقریر سے مجلس میں ہنسنے ہنسانے کا کافی سامان پیدا کر دیا۔ ان میں ایک تو جناب شوکت ہیں اور دوسرے جناب بشیر، جناب شوکت کو میں نے ہمیشہ تیسرے درجہ کا مزاحیہ نگار سمجھا، ان کی "منگنی" بھی لوگ دیکھ چکے ہیں اور "سودیشی ریل" بھی، ان کے سارے مضامین میں ایک عامیانہ ظلمیت کے سوا کسی بلند ذوقی کا پتہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ

Marfat.com

اہل نظر کے سامنے ان کی مزاحیہ نگاری کوئی وقعت نہیں رکھتی، رشید، فرحت اور پطرس نے مزاحیہ نگاری میں نقد ادب و انشا کی خدمتیں انجام دی ہیں، وہ ہنساتے بھی ہیں اور کام کی بات بھی کہہ جاتے ہیں اس کے برخلاف شوکت صرف ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں ان کا کوئی مطمح نظر نہیں، یوں بھی جناب شوکت کا علمی پایہ بالکل سطحی ہے جو شخص اپنی کتاب کا نام "سیلاب تبسم" رکھے اور انجمن بہار ادب کی بھری مجلس میں "نسلاً بعد نسلاً" کی غلط ترکیب لکھ کر لوگوں کو سنائے اس سے کسی نوع کی علمی تنقید کی توقع کرنا بے محل سی بات ہے۔

سب سے آخر میں جناب بشیر کی تقریر کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔ بشیر صاحب کی خوش روئی اور جامہ زیبی صحت و جوانی دیکھنے کے بعد لکھنؤ کے "بانکپن" کی یاد تازہ ہوتی تھی، انھوں نے دہلی اسکول پر ایراد کرتے ہوئے لکھنؤ اسکول کے محاسن پر روشنی ڈالی اور اس سلسلہ میں لکھنؤ کے تانگہ والوں کی پھبتی سے لے کر "عید پیچھے ٹر" کے واقعات پر تبصرہ فرمایا شاہان اودھ کی رنگین مزاجی، خوش ذوقی اور عشرت کامی کے فسانے بیان کئے اور اس شعر

آغا تقی کے باغ میں گچھا انار کا   چھاتی پٹک کے مر گیا لونڈا اسنار کا

سے بھی فلسفیانہ نتیجہ نکالا، میرا خیال ہے ان کی آزاد تقریر سے لکھنؤ والے کچھ خوش نہ ہونگے کیونکہ بیسویں صدی میں انھیں الزامات کو جو سرزمین اودھ پر دوسروں کی طرف سے عاید کئے جاتے ہیں اور وہ اپنے دامن عصمت پر داغ سمجھ کر ان واقعات کو دھونے کی کوشش کر رہے ہیں بانکے مقرر نے کچھ اس دلفریب انداز میں بیان کئے کہ جا ہے کوئی

Marfat.com

مانے یا نہ مانے میں جناب بشیر کی اس تقریر سے ان کے فلسفیانہ رجحان کا ضرور قائل ہو گیا اُنھوں نے معمولی معمولی واقعات سے اچھے اچھے نتائج نکالے میرے خیال میں ان کی تقریر بہت کامیاب تھی۔

مجھے آخری دن شب کے وقت مقالہ پڑھنے کا حکم دیا، مجھ سے قبل جن صاحب نے اپنا مقالہ پڑھا تھا ان کا انجام دیکھ کر میں ہرگز اس کے لئے تیار نہ تھا لیکن اراکین انجمن کے تقاضہ سے مجبور تھا، طلبہ غزلیں اور نظمیں سننے کے لئے سخت مضطرب تھے اور وہ اپنے جماعتی اثر و اقتدار کے زعم میں وہ ساری حرکتیں کر رہے تھے جس کی بناء پر جرمن ماہر نفسیات ایڈوارڈ اشپرانگر نے لکھا ہے کہ نوجوانوں میں "منوانے" کی اہلیت بہت زبردست ہوتی ہے۔ وہ تالیاں بجا رہے تھے پھبتیاں کس رہے تھے، ہال اُنکے شور و شغب اور ہیجانانہ ہنگامہ پروری سے گونج رہا تھا ایسی فضا میں کسی خشک علمی بحث کا آغاز و انجام دونوں برابر تھا۔ مجھے طلبہ کی جماعت سے بڑا انس ہے اسلئے نہیں کہ میں نوجوانوں کے غیر مہذب طریق زندگی کو پسند کرتا ہوں بلکہ اس لئے کہ ان کی نفسیات کے مطالعہ سے بعض دلچسپ حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ بہر حال میرا ارادہ نہ تھا کہ میں اپنا مقالہ پڑھوں اس لئے کہ یہ علمی مجلس طلبہ کی شر انگیزیوں سے اس لائق نہ تھی کہ یہاں کسی سنجیدہ بحث پر ایک لمحہ بھی صرف کیا جائے لیکن خوف یہ تھا کہ انجمن بہار ادب کے وہ افراد جو پہلے ہی بدگمان نظر آ رہے تھے کہیں یہ نہ فیصلہ کر لیں ؎

زاہد نہ یافت تاب جمالِ پری رخاں   کنجے گرفت و ترس خدا را بہانہ ساخت

Marfat.com

جہاں تک افادیت کا تعلق تھا پڑھنا نہ پڑھنا دونوں برابر تھا، لیکن "حقِ نمک" سمجھ کر میں نے اپنے مقالہ کا حصہ ادھر اُدھر سے غیر مربوط طریقہ پر پڑھ دیا۔ میں مقالہ ختم کر کے اسٹیج سے اُترا تو جناب پنڈت انند نرائن ملا اور انجمن کے دوسرے اراکین نے مقالہ طلب کیا چونکہ انجمن غزلوں اور نظموں کے ساتھ مقالے بھی اپنے اہتمام سے شائع کریگی۔ میرے مقالہ کا مسودہ صاف نہ تھا میں نے کہہ دیا کہ صاف کر کے اس کی نقل بھیجدوں گا۔

انجمن نے ملک کے مختلف اطراف سے لوگوں کو بلایا تھا کہ وہ لکھنؤ اسکول کے جدید رنگ کے متعلق اپنی رائیں دیں تاکہ لکھنؤ اسکول کے تبعین کو استفادہ کا موقع ملے اور اس طور سے انجمن اپنی زندگی میں اپنی افادیت کا ایک غیر فانی نقش قائم کر جائے لہذا میں نے فیصلہ کیا میرے اختلافات اتنے سنگین ہیں کہ اراکین انجمن اپنے اہتمام سے اسے شائع کرنے کے لئے تیار نہ ہونگے اس لئے اب میں اسے اپنے "نگار" میں شائع کئے دیتا ہوں مجھے بیحد مسرت ہوگی اگر سنجیدہ حضرات اس کے خلاف آواز اُٹھائیں گے کیونکہ بہت ممکن ہے میں نے مشاہدہ کرنے اور نتیجہ نکالنے میں غلطی کی ہو۔

Marfat.com

صفیرؔ بلگرامی

آرہ اپنی علمی و ادبی مرکزیت کے لحاظ سے نہ صرف بہار بلکہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں معروف ہے، اس نے گذشتہ ڈیڑھ سو برس کے اندر اردو کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اُن کو ادب اُردو کی تاریخ فراموش نہیں کرسکتی، اُردو کا قدیم ترین شاعر جو آرہ میں گذرا ہے وہ مولانا انور علی یاس (متوفی ۱۲۶۲ھ) تھے، آپ شیخ غلام علی راسخ (متوفی ۱۲۳۸ھ) کے تلامذہ میں تھے آرہ کی ادبی زندگی کا یہ دورِ اولین تھا، اسی عہد میں مارہرہ و بلگرام کے اربابِ سخن آرہ میں تشریف لاتے تھے، چنانچہ یاس مرحوم نے حضرت سید سلطان عالم صاحب سجادہ نشین مارہرہ سید محمد عسکری، سید بندہ علی وغیرہ سے اپنے تعلقات کا ذکر کیا ہے۔

اس دور کے گذر جانے کے بعد ادبی قیادت کی عنان حضرت صفیرؔ بلگرامی مرحوم کے ہاتھ میں آئی، اسی عہد میں اُردو کو بہت بڑا فروغ ہوا چنانچہ مطبع کا قیام، شاعروں کی بنیاد، تصنیفات و تالیفات کا سلسلہ صحافت کی ترویج اسی زمانہ سے متعلق ہے اور اس کو ہم ادبی اصطلاح میں "خیر القرون" کہہ سکتے ہیں، اسی دور کی برکات کا یہ اثر ہے کہ آرہ میں سیکڑوں نامی و ماہر اساتذۂ اُردو پیدا ہوئے، شیخ محمد حسن نظیر

Marfat.com

سید سبحان حیدر نذیر، آغا حسن ظہیر، لالہ امرچند جمیل، چودھری ریاض الدین آزرد، برکت علیخاں سیفی، سید لقمان حیدر اسی دور کے نکتہ سنج شعرا تھے۔

صفیر مرحوم کی قیادت کا سلسلہ ۱۳۰۷ھ میں ختم ہو گیا اور وہ اپنے بعد ایسے ایسے نونہالانِ ادب چھوڑ گئے جنھوں نے اُردو شاعری کو چار چاند لگا دیئے، مولانا اسمٰعیل مہر، مولوی عظیم، شاہ ابراہیم فوق، مولانا ضمیر الحق قیس، قاضی واجد حسین وحید، سید امیر حسن بدر، مولانا ابوالفضل حشر، چودھری فخرالدین فخر، سید قمرالدین قمر، جے نند کمار جوہر نے اپنی نگارش جمیل اور بدیعۂ اشعار سے اُردو نظم کو بڑا فروغ دیا۔ مولانا مہر بہت بڑے گلتراش اور صناع تھے، مولوی عظیم ظریفانہ شاعری میں بڑی مہارت رکھتے تھے آپ کے صاحبزادہ ابوالبرکات برق آرہ کے اُن اکابر شعرا میں ہیں جو مشاعرہ میں میر سوز کی شعرخوانی کے مناظر پیش کر دیتے ہیں شاہ ابراہیم فوق اس عہد کے بہت بڑے ماہر سخن تھے، مولانا ضمیر الحق قیس شمشاد لکھنوی کے شاگرد ہیں آپ کو عروض میں پوری دستگاہ ہے، مولانا بدر مرحوم کے "خم خانہ" پر "مخزن" (لاہور) میں ایک بار لکھا جا چکا ہے۔

آج میں اپنے وطن کے مشہور شاعر حضرت صفیر کے حالات و کلام پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں

نام و نسب ولادت و وطن

آپ کا نام فرزند احمد، تخلص صفیر ہے۔ ۱۲۴۹ھ میں بمقام مارہرہ اپنی ننہیال میں پیدا ہوئے "شمس الضحیٰ" سے آپ کی تاریخ ولادت نکلتی ہے، ایک سال کے ہوئے تو بلگرام آئے جو آپ کا آبائی وطن تھا۔ چار سال کی عمر میں قصبہ آرہ میں وارد ہوئے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:-

Marfat.com

مولد و مسکن وطن ہوا ئے صغیر   تین جا مارہرہ، آرہ، بلگرام

آپ کا سلسلۂ نسب یہ ہے:۔

فرزند احمد بن میر سید احمد، بن سید غلام یحییٰ، ابن سید بندہ علی، بن سید خورشید علی، سید خورشید علی کا سلسلۂ نسب سید ابو الحکیم بن سید ابو القاسم بن سید خاں محمد بن محمود دہتہ کی وساطت سے سید محمد صغریٰ فاتح بلگرام اور حضرت صغریٰ کا نسب عیسےٰ موتم الاشبال بن زید شہید بن امام زین العابدین بن امام حسینؑ تک پہونچتا ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ سید محمد صغریٰ کے اخلاف میں سے ہیں، سید صاحب نے ۶۱۴ھ میں بلگرام کو فتح کیا تھا، اس کے بہت عرصہ قبل سید ابو الفرح واسطی اہل وعیال اور متعلقین کے ساتھ ہندوستان میں آباد ہو چکے تھے، یہی وجہ ہے کہ "سادات صغراوی" خود کو واسطی کہتے ہیں چونکہ ان کے جد امجد واسط سے ہندوستان میں آئے تھے۔

اکثر مثالوں میں پتہ چلتا ہے کہ انسان کی ذہنی ترقی اور تعمیر سیرت میں خاندان کو بہت بڑا تعلق ہوتا ہے، لیکن اس سے ہٹ کر اس کی کوئی اصلیت نہیں اگر ایک شخص علم و فضل کے ساتھ اچھے عادات و خصائل بھی رکھتا ہے تو پھر اس کے لئے خاندان کا فخر کوئی معنی نہیں رکھتا، لیکن جہاں ہماری ادبیات میں بہت سے زہریلے جراثیم داخل ہو گئے وہاں خاندانی فخر و مباہات کا عنصر بھی شامل ہو گیا اور آج سیرت پر مشکل ہی سے کوئی کتاب دستیاب ہو سکتی ہے، جو اس قسم کے ترہات سے پاک ہو، سرسید، نذیر احمد، جیسے قومی فدائیوں نے بھی نہ کسی نہ کسی پیرایہ میں اپنی خاندانی عظمت کا تذکرہ کیا اور

Marfat.com

"حیات جاوید" کے مصنف حالی نے تو سرسید کو بُت بنا کر رکھ دیا۔

میں یہاں مختصراً سید فرزند احمد صاحب کے اُن افکار پر ایک تنقید کرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے اپنے نسب وحسب کے سلسلہ میں ظاہر کئے ہیں فرماتے ہیں:۔

بسکہ سادات صغرادی بلگرام کو حفظ نسب کا خیال سب خیالوں سے بڑھ کر ہے اور اس کی احتیاط اب تک کہ سات سو برس سے زیادہ ہندوستان میں آئے ہوئے بڑے زور شور سے رہی ہے کہ دوسری قوموں کو جائے رشک اور باعث استعجاب اور وجہ رغبت ہے اور اس حفظ نسب کی مشق یہاں تک کی گئی ہے کہ جس قدر قربت میں نسبت ملتی ہے وہ باعث فخر ہوتی ہے اور انتہا یہ ہو گئی ہے کہ احتیاط کرتے کرتے چار بھائیوں سے اگر بڑے بھائی کی اولاد سے سنجھلے اور منجھلے کی اولاد سے چھوٹے کی اولاد کو وصلت واقع ہوئی اور اس وصلت کو تواتر ہو گیا ہے تو وہ بھائی اسی کا ہو گیا گویا بڑے اور سنجھلے کو منجھلے اور چھوٹے سے اور چھوٹے اور منجھلے کو بڑے سے قرابت ہی باقی نہیں ہی

(تاریخ بلگرام ص ۱۳۵)

"یہ قصبہ (بلگرام) سادات ہی کی بود وباش کے سبب سے مشہور ہوا ہے اور اعلیٰ درجہ کے ساکنین سادات ہی شمار کئے جاتے ہیں اور ان سادات کی ناموری "خاندانی" کے لقب سے شہرت پذیر ہوئی، اور خاندانی ہونا خوبی اصلیت ونجابت وشرافت کی دلیل ہے، پس سادات صغراوی کا حفظ نسب

Marfat.com

نے یہ جلوہ دکھایا کہ سب لوگ ان کی بزرگی کے قائل ہیں۔ (تاریخ بلگرام ص۱)
اگرچہ بفضل خدائے یکتا عاصی کے بزرگوار حسب ونسب میں نامور زمانہ اور علم و
فن میں یگانہ ہوتے آئے ہیں (صفیر بلبل ص ۱۲۵)

صفیر مرحوم نے اسی طرح صفیر بلبل، تاریخ بلگرام، معراج الخیال اور جلوہ خضر کے کثیر صفحات رنگین کئے ہیں، میرا روئے سخن صفیر مرحوم کی طرف نہیں کیونکہ اب وہ دنیا میں باقی نہیں ہیں ان کو ایک بزرگ خاندان کا قابل رشک فرزند خیال کرتا ہوں انفرادی اعتبار سے جو کچھ صفیر نے اپنے نسب وحسب کے متعلق لکھا ہے وہ محل اعتراض نہیں۔ لیکن آپ نے سادات صغراوی کے عجیب وغریب تخیل نسبی کے متعلق جو لکھا ہے وہ نہ صرف نظریہ قومیت بلکہ اسلام کی روح تعلیم کے بھی منافی ہے۔

سادات صغراوی کو بروایت صفیر حفظ نسب کا جنون ہے، جیسا کہ ان کے سطور بالا سے پتہ چلا ہوگا، اب غور طلب امر یہ ہے کہ واقعتاً یہ سارا داعیہ فضل وشرف بقول غالب ”رعایت مستی وذوق“ کا نتیجہ ہے یا اس کے اندر کچھ حقیقت بھی ہے؟

ہم نے یہ مانا کہ سید ابوالفرح ہندوستان میں اہل وعیال کے ساتھ تشریف لائے تھے اور اس لئے سادات صغراوی کی نسل میں کسی غیر عنصر کا شامل ہونا مستبعد ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سید ابوالفرح اور حضرت امام حسینؑ کے درمیان جو پشتیں گزری ہیں ان میں کوئی غیر فاطمی خون شامل ہوا ہے یا نہیں؟ پہلے تو حضرت امام زین العابدین ہی کی والدہ ایرانی تھیں اس کے بعد حضرت زید شہید کی والدہ ام ولد (لونڈی) تھیں۔ پھر آپ کے

Marfat.com

صاحبزادے عیسٰی موتم الاشبال ساری عمر خلیفہ منصور اور مہدی عباسی کے ادوار حکومت میں مخفی رہے اور لوگوں کو اُجرت پر پانی پلایا کرتے تھے، اسی لئے آپ کا لقب "سقہ" ہوگیا چنانچہ ۱۶۶ھ میں بمقام کوفہ آپ نے اسی اختفائی حالت میں وفات پائی اس وقت آپ کی عمر چھیالیس سال کی تھی (ملاحظہ ہو صحاح الاخبار علامہ رفاعی ص ۳۵ و ۴۰) خلیفہ منصور ۱۳۶ھ میں تخت خلافت پر بیٹھا اور خلیفہ مہدی نے ۱۶۹ھ میں وفات کی چونکہ بروایت رفاعی حضرت عیسٰی موتم الاشبال نے ۱۶۶ھ میں بعمر ۴۶ سال وفات کی اس لئے ۱۲۰ھ آپ کی تاریخ ولادت قرار پائی، لہٰذا نتیجہ نکلا کہ منصور کے زمانہ خلافت میں آپ سولہ برس کے تھے، ظاہر ہے کہ آپ اس وقت مجرد ہوں گے اور آپ کو وطن سے دور مخفی طور پر اپنا عقد کرنا پڑا ہوگا، اس کے بعد آپ کے صاحبزادے زید احمد، محمد وحسین پیدا ہوئے۔ سادات صغراوی محمد کے اعقاب میں ہیں، کیا سادات واسطی بتا سکتے ہیں کہ حضرت عیسٰی موتم الاشبال نے اس بے بسی و آشفتگی کی زندگی میں کسی فاطمیہ سے رشتہ ازدواج باندھا تھا؟ ایسی صورت میں سادات صغراوی غور کریں کہ نسب و حسب کے پندار، اور رشتۂ ازدواج کے قیود میں وہ کہاں تک حق بجانب ہیں آج ہندوستان کے اندر سیکڑوں کی تعداد میں ایسے صغراوی سادات کے گھرانے موجود ہیں جن کو انکی برادری کے مجرمانہ قیود نے حد درجہ بے نام و ننگ بنا رکھا ہے، آپ کا علم و فضل مسلم آپ کی فاطمیت مصدق، لیکن یہ محشرستان رسوم کیسا؟ خدا کے لئے غور کیجئے ساڑھے چھ سو سال کے اندر آپ کی دنیائے خیال نے آپ کی برادری کے اندر کیسی قیامت برپا

Marfat.com

کردی اب آپ کے یہاں آزاد جیسا ادیب جلیل، عبدالجلیل جیسا لغوی، مبارک جیسا محدث، سید اسمٰعیل جیسا متکلم کیوں نہیں پیدا ہوتا، باستثنائے سید علی بلگرامی اور سید حسین اب کئی سو برس سے آپ کے یہاں سے علم و ادب کا مہرِ درخشاں کیوں نہیں طلوع ہوتا، آپ جس کو موجب فخر سمجھ رہے ہیں وہ آپ کے جسمانی و ذہنی ادبار کا موجب ہے۔

صفیر کا خاندان علم و فضل کے اعتبار سے بہت بلند اور سربرآوردہ تھا، آپ کے اجداد پدری میں مسلسل کئی پشت تک شعر و ادب کا ذوق رہا۔ چنانچہ خورشید علی صاحب خورشید خود شاعر تھے، آپ کے فرزند بندہ علی بندہ اور پوتے غلام یحییٰ صاحب یحییٰ کو بھی شعر و سخن کا مذاق تھا صفیر کے والد سید احمد صاحب نے اُردو میں شعر کہنا شروع کیا یہی خاندانی شاعری صفیر مرحوم کو بھی ورثہ میں ملی۔

یہ تو دادھیال کی حالت تھی، آپ کے نانا سید صاحب عالم صاحب بہت بڑے ادیب اور شاعر تھے، غالب نے "اُردوئے معلیٰ" اور "عودِ ہندی" میں آپ کو جو خطوط لکھے ہیں اُن سے آپ کا پایۂ ادبی واضح ہوتا ہے۔ "صفیرِ بلبل" کے آخر میں حضرت صاحب عالم کی ایک تاریخ طبع بھی مرقوم ہے، غالب نے بھی صفیر مرحوم کی "رشحات" پر دیباچہ لکھا، جو "عودِ ہندی" کے آخری صفحات میں پایا جاتا ہے۔ الغرض صفیر مرحوم پشتینی شاعر تھے، آنکھیں کھولیں تو نانا اور دادا کی آغوش میں شعر و ادب کا درس لیا۔

تصنیفات | صفیر مرحوم نے اپنی ساری زندگی تصنیف و تالیف اور شعر و سخن میں بسر کی اُردو میں سب سے پہلے آپ ہی نے اپنا مطبع "اسٹار آف انڈیا" قائم کیا جہاں سے اُردو میں

Marfat.com

دو اخبار نکلے، آپ نے مختلف فنون پر کتابیں لکھیں ان میں بعض تو طبع ہو چکی ہیں اور بعض کا قلمی مسودہ آپ کے خاندان میں محفوظ ہے۔

"صفیر بلبل": یہ آپ کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے جو ۱۲۸۰ھ میں آپ کے شاگرد شاہ حفاظت حسین مظہر کے اصرار سے شائع ہوا تھا، مقالہ ہذا میں یہی کتاب پیش نظر رکھ کر آپ کے کلام پر تنقید کی گئی ہے۔

"تاریخ بلگرام" اس کا ایک مطبوعہ حصہ میرے پاس ہے تاریخ طباعت مذکور نہیں، آپ کے ابتدائی زمانہ کی تصنیف معلوم ہوتی ہے اس میں سادات صغرادی کا شجرۂ نسب بلگرام کا جغرافیہ، محلات کی تفصیل اور برادری کے رسوم و رواج کا مفصل تذکرہ ہے

"رشحات صفیر" یہ آپ کا بہت بڑا ادبی کارنامہ ہے۔ اس میں آپ نے تذکیر و تانیث کے متعلق مبسوط علمی بحث کی ہے اور اساتذۂ قدیم کے اشعار سے استدلال کیا ہے، اسی کی تلخیص "خلاصہ فیض صفیر" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

"میلاد معصومین"، یہ کتاب بہت زیادہ مشہور ہے، اس میں ائمہ اثنیٰ عشری کے حالات درج ہیں۔

"جلوۂ خضر" بھی آپ ہی کی تالیف ہے، ان کے علاوہ آپ نے اور بھی غیر مطبوعہ کتابیں چھوڑی ہیں جن کا حال "صفیر بلبل" اور تاریخ بلگرام سے معلوم ہوتا ہے۔ مصنف کا خود بیان ہے کہ انھوں نے بتیس مثنویاں لکھیں۔ اردو میں پانچ قصے لکھے "قصہ بوستان خیال" کی اٹھارہ جلدوں کا فارسی سے اردو میں ترجمہ شروع کیا تھا، ۱۲۸۰ھ ہی میں غزلیات

Marfat.com

کا اتنا بڑا مجموعہ تیار ہو گیا تھا کہ کئی دیوان مرتب ہو جاتے، اس کے بعد ستائیس سال اور زندہ رہے، خدا جانے کتنی غزلیں کہیں۔ ۱۲۸۱ھ میں لکھنؤ سے واسوخت کا ایک مجموعہ "شعلۂ جوالہ" کے نام سے شائع ہوا تھا، اس میں صفیر کا واسوخت بھی شامل ہے۔

رفقا و تلامیذ آرہ کے مہر، وجد، بدر، جمیل، نظیر، آرزو وغیرہ تو خیر ان کے تلامذہ ارشد میں تھے ہی عظیم آباد کے بہت سے شعرا کے ساتھ آپ کے مراسم و روابط تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں مفصلہ ذیل بزرگوں کے نام گنائے جا سکتے ہیں:۔ مرزا انور علی انور عظیم آبادی، مرزا یوسف بیگ یوسف عظیم آبادی، علی مرزا وفا عظیم آبادی، آغا مرزا عطا عظیم آبادی حامد حسین عرف میرن صاحب نکہت عظیم آبادی، علی محمد شاد عظیم آبادی وغیرہ۔ ان تمام حضرات نے "صفیر بلبل" کی تاریخ طبع لکھی ہے۔

اولاد آپ کی پہلی بی بی بلگرام کی تھیں، ان سے صرف ایک صاحبزادہ زندہ رہے، مثنوی معراج الخیال میں آپ نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

از من نور احمد است یک پور   روشن کن خانۂ چشم انور

نور احمد نے دو صاحبزادے چھوڑے سید عنایت احمد دلگیر اور سید وصی احمد فانی دونوں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ دلگیر صاحب مشاعرے میں ایک خاص انداز سے پڑھتے ہیں، وصی احمد صاحب فانی بہت بڑے ادیب اور شاعر ہیں۔ نثر میں آپ نے بہت سی موقر خدمات انجام دی ہیں چنانچہ "نگار" میں "ملک خطا کے شہزادے" "گونڈہ گزٹ" میں "دیر و حرم کا افسانہ" اور "ندیم" میں "جلترنگ کے تین بیٹے" شائع ہو کر فانی صاحب کو غیر فانی بنا چکے ہیں فانی صاحب

Marfat.com

سے مجھے غائبانہ عقیدت ہے۔

صفیر مرحوم نے دوسرا عقد آرہ میں کیا تھا، اُن سے دو صاحبزادے، سیّد غنی حیدر اور حافظ سیّد ولی حیدر گہر صاحب ہوئے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ غنی حیدر مرحوم رفتار و گفتار، عادات و خصائل، شکل و صورت میں حضرت صفیر مرحوم سے بہت مشابہ تھے۔ غنی حیدر صاحب نے پہلے آرہ میں ایک "مطبع مصطفائی" قائم کیا اس کے بعد کلکتہ تشریف لے گئے، وہاں "مطبع ستارۂ ہند" قائم کیا، یہ مطبع ہندوستان کے چند اعلیٰ مطابع میں ہے، یہاں کی اعلیٰ طباعت و کتابت ہندوستان و ایران میں مشہور ہو چکی ہے۔ غنی حیدر مرحوم نے آخری عمر میں حج کیا، آپ بہت بڑے خطاط ہفت قلم تھے، حافظ ولی حیدر صاحب "کتب خانہ حیدری آرہ" کے مالک اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، آپ کو شعر و سخن کا بہت بڑا شوق ہے گہر تخلص کرتے ہیں اور آرہ کی "بزم ادب" کے صدر ہیں۔

صفیر کی شاعری

سطور بالا میں لکھا جا چکا ہے کہ صفیر مرحوم کے اجداد پدری و مادری میں نسلاً بعد نسلٍ شاعری چلی آتی ہے، اس لئے صفیر کو گہوارہ ہی میں شاعری کا درس ملا، پندرہ برس کی عمر سے آپ نے شعر کہنا شروع کیا۔ پہلے اپنا کلام چھپایا، دو تین سال کے بعد سیّد محمد مہدی متخلص بہ خبر سے اصلاح لینی شروع کی، خبر مرحوم صفیر کے دادا کے چچا زاد بھائی تھے اس کے بعد صفیر کو لکھنؤ کا شوق ہوا، اپنا کلام شیخ امان علی سحر کو دکھلایا، مرثیہ گوئی کی طرف طبیعت راغب ہوئی، مرزا سلامت علی دبیر سے اصلاح لی، سحر مرحوم نے لکھنؤ چھوڑا، اور دبیر کو عظیم آباد والوں نے مدعو کیا، وہ یہیں آکر رہے۔ صفیر مرحوم بھی

Marfat.com

عظیم آباد میں نواب الطاف حسین خان بہادر کے یہاں قیام پذیر ہوگئے آرہ سے برابر آمد و رفت کا سلسلہ قائم تھا، مرزا دبیر نے محبت و رافت کے ساتھ آپ کی پذیرائی کی۔

صفیر کی شاعری ایک معجون مرکب کی حیثیت رکھتی ہے، ان کی شاعری پر خبر، سحر، دبیر کے علاوہ اور اساتذہ کا بھی اثر پڑا ہے، چنانچہ خواجہ وزیر، حیدر علی آتش، صبا، قدر بلگرامی وغیرہ کے کلام سے انھوں نے استفادہ کیا تھا بعض مقطعات میں صفیر نے ان لوگوں کا تذکرہ کیا ہے :-

شکر ہے، دل مرا مثل حضرت آتش صفیر
عاشق شیدا علی مرتضیٰ کا ہوگیا

طرز وزیر میں لکھی اچھی غزل صفیر
اب آپ کا کلام بھی پُرکار ہوگیا

اب دیکھیے بقول صبا کیا بنے صفیر
آئی بہار داغِ جنوں پھر ابھر چلے

صفیر قدر کا ہے اشتیاق مدت سے
ہمارا عزم سوئے بلگرام ہے بیشک

لیکن صفیر بلبل پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے یہاں میر کا سوز و گداز، غالب کی مضمون آفرینی و جدت طرازی، ناسخ کی محاورہ بندی اور رعایت الفاظ، داغ کی رندانہ سیہ مستی و سلاست نگاری کی بھی کافی مثالیں موجود ہیں۔

طرز میر | ایک ایسے شاعر سے جس نے لکھنوی اساتذہ کی تربیت سے استفادہ کیا جو

Marfat.com

لکھنؤ کی ناسخی فضا سے متاثر ہوا، جس نے داغ کی سی رنگ رلیوں کو سراہا، جس نے شاہانِ اودھ کے عشرت کدوں کے اُجڑنے پر ماتم کیا۔

صفیرؔ کھا گئی حاسد کی آنکھ لکھنؤ کو
کہاں وہ دن کہاں پریاں کہاں وہ قیصر باغ

کیا ہم اُمید کر سکتے تھے کہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں لذت غم اور پیام روح کا سرمایہ بھی رکھتا ہو گا لیکن جب اس کے کلام کا جائزہ لیا جاتا ہے تو اس کے یہاں بیشتر ایسے اشعار نکلتے ہیں جو میر کے سوگوارانہ انداز بیان سے مالا مال ہیں[ل]۔

پھر کیا کروں نہ روؤں جو کہہ کے ہائے دل
اک درد رہ گیا ہے فقط اب بجائے دل

کیا شکوہ ہے اگر کہیں جاتے نہیں ہیں ہم
مدت سے اب تو آپ میں آتے نہیں ہیں ہم

تو نے تو بڑھ کے خاک میں مجھ کو ملا دیا
اے آرزوئے دل تو ہی مل جائے خاک میں

صاف ہم سے ہوا وہ گل اس وقت
ہائے جب موسمِ بہار نہیں

ل: نگار اوّل تو صرف چند اشعار پر اعتماد کر کے یہ حکم لگانا کہ صفیرؔ کے کلام میں میر کا سوز و گداز پایا جاتا ہے درست نہیں، دوسرے یہ کہ جو اشعار انتخاب کئے گئے ہیں وہ خود میر کے رنگ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے صفیرؔ بلگرامی کو میر و غالب سے ممکن ہی بہت عقیدت رہی ہو، لیکن رنگ سخن کو اُن سے کوئی نسبت نہیں وہ خالص لکھنوی اسکول کے شاعر تھے اور اسی رنگ میں اُنھوں نے ہمیشہ شاعری کی۔

Marfat.com

زندگی وہی جو نا کامیوں میں بسر ہو۔

آج آتا ہے شوخ غارت گر　　دین و ایمان کا خدا حافظ
پھر ہمیں یاد آیا کوئے صنم　　لے چلے ناصحا خدا حافظ

پائے بوس یار کی حسرت نہایت ہے صفیر　　خاک میری کاش کہ بنتی مکان نقشِ پا[۱]

پھر گئے ہم سے یار کیا کہنا　　یونہی کرتے ہیں پیار کیا کہنا

لباس سے ہیں نہ واقف نہ تاج سے واقف　　تمہارے وحشی نہیں احتیاج سے واقف

اتباعِ غالب صفیر بلگرامی میں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کے کلام نے صفیر کے دماغ پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں، صفیر نے غالب کو دیکھا تھا، حضرت صاحب عالم صاحب مارہروی کے نواسہ کی حیثیت سے غالب صفیر کو

---

[۱] یہ شعر میر کے رنگ میں ہے تو ضرور، لیکن غالب کے ایک شعر سے مل جاتا ہے:۔

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اگتی ہے حنا　　کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

صفیر نے سادہ الفاظ میں جس آرزو کا اظہار کیا ہے، وہ غالب کی جدت تخیل اور بلند پروازی سے زیادہ اثر آفریں ہے یہی غالب اور میر میں فرق ہے ع۔م

نہ میر کا رنگ ہے نہ غالب کا۔　اڈیٹر نگار

Marfat.com

بہت ہی محبت و رافت کی نظر سے دیکھتے تھے، چنانچہ "رشحات سفیر" کے دیباچہ میں غالب مرحوم لکھتے ہیں:-

سیّدی سندی نور بصر لخت جگر قرۃ العین اسد، مولوی سیّد فرزند احمد کی طول عمر، و دوام دولت و بقائے اقبال کی دعا مانگتا ہوں، جنکو مبدءِ فیاض سے اس رسالہ کے لکھنے کی توفیق عطا ہوئی ہے، سبحان اللہ تانیث و تذکیر کی تقریر کہ وہ مطالب کی توضیح پر بھی مشتمل ہے کس لطف سے ادا ہوئی ہے۔ (عود ہندی ص ۱۹۳)

افسوس ہے کہ ہمارے وطن کے اس ہیرو نے بجائے دہلی، لکھنؤ کی طرف توجہ کی اور سحر مرحوم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اگر وہ غالب جیسے شفیق استاد سے اصلاح لیتے تو یقیناً آج صفیر بہار کے سب سے بڑے شاعر ہوتے، لکھنؤ کی شاعری کے اس صنف نے جو زلف و چوٹی شانہ و زلف سرمہ و مسی سے متعلق تھا ان کے اندر پریشان نظری و ادبی گمرہی پیدا کر دی، چنانچہ وہ اپنی فطری ودیعتوں سے کام نہ لے سکے مگر صفیر مرحوم کو زیادہ مورد الزام نہیں بنایا جا سکتا، کیونکہ اس عہد میں غالب کی مشکل پسندیاں کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھی جاتی تھیں، لیکن آج وہ دور بھی آ گیا جبکہ ہندوستان کا ہر ادیب غالب کے مختصر اردو دیوان کا حافظ ہے ہر انشا پرداز اُسکے بدلیہ شعری سے استدلال کرتا ہے، فلسفی اس کو فلسفہ طراز، نفسی اس کو ماہر نفسیات، مصور، اس کو اپنا موضوع تخیل بنائے ہوئے ہے اور مشرق کا یہ فاقہ مست شاعر اپنی ناکامیوں در

Marfat.com

حسرت بنجیوں کے بعد جب دنیا سے رخصت ہو گیا تو اہل دنیا اس کو چوم چاٹ رہے ہیں غالب کی ناکام زندگی اور کامیاب موت فطرت کی ستم ظریفیوں کی ایک عبرت آموز مثال ہے۔

صفیر مرحوم نے غالب کی تقلید میں جو اشعار کہے ہیں ان میں دقت معنی اور بلندی تخیل کے ساتھ غالب کے مخصوص طنزیاتی رنگ کا بھی تتبع کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں :۔

زاہد اور تیری میری پری　　　خلد تیرا ہے پرستان مرا

فرط دعا رجنت و حور و قصور سے　　　خم ہو کے شیخ صورت محراب ہو گیا

غالب کا ایک شعر ہے :۔

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں　　　سر زیر بار منت احساں کئے ہوئے

صفیر کہتے ہیں :۔

محفل میں اسکی آئے بھی لوگ اور چلے گئے　　　میں نامراد منت درباں میں رہ گیا

تخیل کے اعتبار سے دونوں شعر برابر ہیں البتہ غالب کے خاص اسلوب نے ان کے شعر میں زیادہ گداختگی و برشتگی پیدا کر دی ہے۔ صفیر کہتے ہیں :۔

نگاہ گرم رحمت سے نہیں کم، زار کو تیری　　　فروغ طالع اپنا، شعلے کو، ہر خار و خس سمجھا

بالکل اسی معنی میں اور انہیں فقروں کے ساتھ غالب کے یہاں بھی ایک شعر ہے

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا　　　فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر

Marfat.com

غالب نے تصوف کی چاشنی پیدا کر دی ہے۔ صفیر معشوق کی گرم نگاہوں کو رحمت بتاتے ہیں لیکن دونوں کے یہاں اسلوب بیان ایک، مشبہ بہ، اور وجہ شبہ ایک، کیونکہ دونوں خار و خس کے جل اٹھنے کو "فروغ طالع" سے تعبیر کرتے ہیں۔

صفیر کا ایک مطلع ہے۔

عشق اور حسن کا چرچا رہا دیوانوں تک ۔۔۔ سب یہ ساماں تھا ترے بے سر و سامانوں تک

غالب فرماتے ہیں:۔

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا ۔۔۔ ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

اسی طرح جستجو کی جائے تو صفیر کے یہاں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جن کا غالب کے کلام سے توارد ہو جاتا ہے۔ ذیل کے اشعار غالب کی پیروی کا نتیجہ ہیں۔

اُڑتی پھرے گی خاک مری کوئے یار میں ۔۔۔ مجنوں ہی تھا جو تھک کے بیاباں میں رہ گیا

رندوں نے سمجھے معنی توحید و لاشریک ۔۔۔ زاہد تو بحث گبر و مسلماں میں رہ گیا

ہے یاد شور خندۂ دنداں نمائے یار ۔۔۔ میں نے نمک بھرا ہے دل چاک چاک میں

اٹھاؤں کس طرح دل اس بت بے کافر سے ۔۔۔ کہ فرط لاغری سے خود جہاں سے اٹھ چلا ہوں میں

دکھا خدا کے لئے شمع رو کہ ڈھونڈوں میں ۔۔۔ ہجوم گریہ میں تار نظر نہیں ملتا

Marfat.com

دارالشفائے عشق کی ہر رسم ورہ اور — اچھا وہی رہا کہ جو اچھا نہ ہو سکا

غالب کہتے ہیں :-

"میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا"

داغ کی پیروی | صفیرِ بلبل کے ادراق کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک ناقد حیران رہ جاتا ہے کہ وہی شاعر جو میر و غالب کی زبان استعمال کر رہا تھا جس کے الفاظ میں خواجہ درد کے جذبات کار فرما تھے وہ یکایک اس ادنیٰ سطح پر کیونکر چلا آیا یہ نتیجہ ہے اسی بے راہروی کا جو مختلف اساتذہ کے تتبع سے کسی شاعر کے کلام میں پیدا ہو جاتی ہے۔ صفیر مرحوم نے پیاپے ایسے استادوں سے اصلاح لی جو مختلف بلکہ متضاد رجحان رکھتے تھے۔ سطور بالا سے پتہ چلا ہوگا کہ صفیر کی ننہیال کو غالب کے ساتھ گہرے مراسم تھے۔ حضرت صاحب عالم صاحب اور غالب دونوں کا کلام انھوں نے مطالعہ کیا، پھر لکھنوی اساتذہ کے دواوین دیکھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک معجونِ مرکب بن گئے۔ ذیل کے اشعار داغ کے رنگ کے ملاحظہ ہوں :-

رشک انگیز آج کیسا ماجرائے آب تھا — ان کے سینہ پر جو دریا میں کفِ سیلاب تھا

یعنی معشوق نہا رہا ہے۔ اور کفِ سیلاب اُس کے سینہ سے گزر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر ہمارے شاعر کو پانی پر رشک آتا ہے۔

ان دنوں بوسوں کی باتیں ہو لگاتے جاتے — ورنہ سابق ہی حساب آپ کا بیباق رہا

گدگدائے تھے جو ہم کہتے تھے وہ — دیکھئے اب یہ مرا ہاتھ آیا

Marfat.com

صفیر کے یہاں اس رنگ کے اشعار کی کمی نہیں، وہی سطحیت، وہی بوالہوسی، وہی جذبات پست کی ترجمانی جو لکھنوی اسکول کے ایک خاص دور میں مایۂ ناز تھی ان کے یہاں بھی ہے ملاحظہ ہو:۔

کون عارض سے ملاتا ہے تمہارے عارض نہ ڈرو میں ابھی رکھے ہوں کنارے عارض

اور یہ مرحلہ یہیں تک ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کا انجام یہ ہوتا ہے:۔

آرسی دیکھ کے یہ وصل میں کہنا ان کا دیکھو تو ہو گئے نیلے مرے سارے عارض

اس سے بھی ایک پُر لطف شعر سنئے اور شاعر کے حساس دل اور ذہن رسا کی داد دیجئے

رنگا کر کاہے انگیا اپنی چھاتی پر جمائی ہے یہ اس نے خاتمہ بالخیر اپنے پال ڈالے ہیں

شاعر نے اپنی روایاتی تہذیب سے ہٹ کر یہاں محض تفنن شعری کی بنا پر وہ سب کچھ کہہ ڈالا جس کو نثر میں ادا کرنا "غیر مہذب" سمجھا جاتا ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کی محبوبہ نے رنگین انگیا پہنی ہے وہ اس کو دیکھ کر سمجھ رہا ہے کہ اس کی محبوبہ نے "خاتمہ آم" کا پال ڈالا ہے۔ اسی قسم کی ایک اور شوخی ملاحظہ ہو:۔

سودائے خام ہی طمع اس نونہال سے سینہ سپاٹ ہے ابھی ہموار کیا کریں

پھل جوانی کا لے غیرتِ گلشن کب تک دیکھئے اُبھرے پر یہ ترا جوبن کب تک

الغرض "صفیر بلبل" کے صفحات میں اس نوع کی سطحی اور سوقیانہ شاعری کے بہت سے نمونے موجود ہیں۔

Marfat.com

ناسخ اسکول

صغیر کے یہاں ناسخیت بھی پائی جاتی ہے، محاورہ، زبان، رعایت الفاظ، نازک تشبیہات واستعارات ان کے یہاں بھی ہیں:-

چڑھ گیا جب سے نظر پر آپ کی — اپنی نظروں سے بھی بندہ گر گیا

رات دن سرمست رہتے ہیں خیالاً ای صغیر — دل بغل میں ہے کہ شیشہ بادۂ گلفام کا

ڈوب مرنے پر بھی سودائی اسیر آب تھا — موجیں تھیں زنجیر پا طوق گلو گرداب تھا

ان کے لبوں نے قہقہوں پر ایسا دھر لیا — کٹ کٹ کے رنگ لعل بدخشاں میں رہ گیا

بیوجہ نہیں آپ الگ پھرتے ہیں ہم سے — کچھ جوڑ مقرر کسی اُستاد نے مارا

دھیان اس محیط حُسن کا آنکھوں میں آ گیا — دیکھو کہ دو حباب میں دریا سما گیا

دعائیں پڑھنے لگے پاؤں جلد اُٹھانے لگے — کبھی جو بھول پڑی عاشقوں کے مدفن میں

باتیں سُن سُن کے اُسکی جیتے ہیں — چشمۂ خضر ہے دہن ہم کو

Marfat.com

اساتذہ فارسی سے استفادہ صفیر مرحوم کے بہتیرے اشعار جامی، عرفی، حزیں اور شعرائے متاخر کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں، یہ بھی نتیجہ ہے فارسی دواوین کے زیر مطالعہ رہنے کا۔ صفیر کا ایک شعر ہے:۔

ان لبوں کیلئے مٹی سو مری جام بنا　　　شکر ہے کام مرا گردش ایام بنا

شیخ علی حزیں لاہجی یہی خیال ادا کر گیا ہے:۔

در میکدہ خاکم را پیمانہ کنی یارب　　　شاید دل حسرت کش لب را بہ لبے دارد

صفیر اور حزیں میں کوئی فرق ہے تو صرف اس قدر کہ ایک نے اُردو میں کہا ہے اور دوسرے نے فارسی میں۔ صفیر کی مٹی سے زمانہ نے پیمانہ بنا کر ان کو معشوق کے لب لعلیں سے ملا دیا اور حزیں ابھی اس کی تمنا میں ہیں۔ صفیر فرماتے ہیں:۔

یہ نون نیستی کی خبر پیری میں ہے شیخ　　　اب تو الف سا قد ترا ہمشکل نوں ہوا

مطلب یہ ہے کہ شیخ کو پیری نے سرو قد سے جو حرف الف کے مشابہ تھا اب جھکا کر نون کی شکل بنا دیا اور یہ "نون" گویا "نیستی" کا حرف اول ہے اس سے شیخ کو سمجھنا چاہیئے کہ اس کے آخری دن آ گئے، اس سے قبل بیدل یوں کہہ گیا ہے:۔

نقش پیری نفی ہستی می کند ہشیار باش　　　صورت قد دوتا آئینہ ترکیب لا است

یعنی بوڑھاپے میں جھک جانا گویا لفظ "لا" کی صورت بن جانا ہے، اس لئے پیری کا جھکا ہوا قد ہستی کی نفی ہے۔ صفیر کا ایک شعر ہے۔

اے دل مجھے تو عشق میں تو خاک کر چلا　　　او خانماں خراب بتا اب کدھر چلا

Marfat.com

عرفی کہتا ہے :۔

بلائے دیدہ و دل راز پے شناباں نم
کسے نہ گویدم اے خانماں خراب کجا

کسی قدر اردو بدل کے ساتھ صفیر اور عرفی کا مرکزی تخیل اور بعض فقرے باہم مل جاتے ہیں۔ صفیر کا ایک مطلع ہے۔

سرد تیرے چہرے سے ہو گرمی بازار شمع
اک گل پژمردہ ہے گویا گلِ بے خار میں

صفیر شمع کی ضوفشانیوں کو محبوب کے چہرے کے آگے ماند بتاتے ہیں گویا شمع کی روشنی محبوب کے چہرۂ منور کے نزدیک ایک "گلِ پژمردہ" ہے۔ بالکل یہی تخیل حزیں کے ایک شعر میں بھی موجود ہے :۔

گرہ ساز دزبان شعلہ شمع انجمن پیرا
دراں محفل کہ حرفے زاں عذار آتشیں باشد

لیکن قبل اس کے کہ یہ مضمون ختم کیا جائے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ انکی غزل جو "موج مے" کی ردیف میں ہے اردو لٹریچر میں اپنی نوع کی یگانہ چیز ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ سید امیر حسن بدر مرحوم ہی اس ستانہ غزل کے موجد ہیں جس کی مثال خمریات ابونواس اور میکدۂ خیام میں بھی مشکل ہی سے دستیاب ہو سکتی ہے لیکن صفیر بلبل کے دیکھنے سے پتہ چلا کہ بدر مرحوم نے اپنے استاد کی اختراع فائقہ اور بدلیہ نگارش سے استفادہ کیا ہے۔

صفیر	بدر
جستجو اس کو ہی کسی کے یوسف گم گشتہ کی	گاہ خم میں گہہ سبو میں شیشہ و ساغر میں گہہ
گردشوں میں رات دن ہر کاروانِ موج مے	منزلیں طے کر رہا ہو کاروانِ موج مے

Marfat.com

صفیر مرحوم نے "کارواں موج مے" کی گردشوں کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ حضرت بدر نے اس کے لئے خم، سبو، شیشہ، ساغر کے ارتقائی منازل بیان کئے اور واقعتہً بتا دیا کہ "موج مے" منزلیں طے کر رہی ہے، اور ایک وقت ایسا آئے گا جبکہ کسی کے لب میگوں سے مل جائیگی۔ حضرت صفیر کے یہاں "یوسف گم گشتہ" کا فقرہ بہت معنی خیز ہے مولانا بدر اگر یہی فقرہ اپنے مصرعہ ثانی میں چسپاں کر دیتے تو اُن کا شعر زیادہ بلند ہو جاتا۔ پھر بھی بدر کا شعر صفیر سے بڑھا ہوا ہے۔ کیونکہ صفیر "موج مے" کو نہ تو "کارواں" کہنے کی کوئی توجیہہ پیش کرتے ہیں اور نہ "گردش" کا کوئی ثبوت۔

بدر	صفیر
آسمان خم ہے شفق ساغر مہ و خورشید ہیں	چشمِ مستِ ساقی خود بیں ہو کیا موجِ شراب
کہکشاں پر مجھ کو ہوتا ہی گمانِ موجِ مے	آنکھ کے ڈوروں پہ مجھ کو ہی گمانِ موجِ مے

تشبیہات کے میدان میں حضرت بدر اپنے اُستاد سے بڑھ گئے ہیں۔

بدر	صفیر
بوسے کیا کیا میں لب ساغر کے لیتا جھوم کر	ہو ترے مینوش کے لب پر بیانِ موجِ مے
لب بہ لب مجھ سے اگر ہوتی زبانِ موجِ مے	چوستا ہوں رات دن ساقی زبانِ موجِ مے

Marfat.com

بہار کا ایک دل والا شاعر قعرِ گمنامی میں

ایک ماہر سیاح جب سرحدِ بہار میں قدم رکھتا ہے تو یہاں کے گوناگوں مناظر عجائب قدرت کا ایسا دلکش مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ بے اختیار اُس کی زبان سے نکل ہی جاتا ہے۔ "جمالِ یوسفی دفتر بہمنی دارد" زندگی کے ہر ہر شعبہ سے قدیم تہذیب عریاں نظر آتی ہے۔ سلاطین اور فقرا کے مقبرے، کہنہ اور فرسودہ عمارات کے قدیم کتبات، ایک ماہرِ آثار کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ شیر شاہ اور حسن سور کے روضے (سہسرام) دولت شاہ کا مقبرہ (منیر) اور بودھ گیا کی زیارت گاہیں، نالندہ کالج (بہار)، کے جدید اکتشافات اور راجگیر میں فقرا کے معابد کوہ رہتاس کا عجیب و غریب قلعہ، اور عظیم آباد کی ہندو اور اسلامی تہذیب کی یادگاریں اس کے لئے ایک دامنِ رہگزر رہن کر رہ جاتی ہیں اور وہ ایک عالم محویت و بیخودی میں کھو جاتا ہے یہاں کے قدرتی مناظر، بڑے بڑے دریا، اور آبشاریں، گھنے جنگل اور مرتفع پہاڑوں کے سلسلے شاعروں اور ادیبوں کے لئے کافی سامانِ بصیرت رکھتے ہیں۔ آئیے آج کی صحبت میں اپنے بہار کو اسی ادبی زاویہ نظر سے دیکھیں۔

یہاں کے ایک ممتاز ترین اردو شاعر مولانا شیخ غلام علی راسخ میر تقی میر کے

Marfat.com

ہمعصر تھے، آپ ایک مرتبہ مرزا آسودا سے ملنے گئے اور مرزا صاحب کو اپنا یہ شعر سنایا۔

ہوئے ہیں پیر ہم اب دیدنی رونا ہمارا ہے پلک پر اپنی آنسو صبح پیری کا ستارا ہے

مرزا نے آپ کو لپٹا لیا، راسخ مرحوم کے شاعرانہ نوادر ادب آج زبان اُردو کے جواہر پارے سمجھے جاتے ہیں۔ اُسی اُستاد سخن کے ایک تربیت یافتہ مولانا انور علی یاسؔ تھے

کچھ دن ہوئے میرے عزیز دوست محمد امیر صاحب امیرؔ نے یاسؔ مرحوم کا ایک مطبوعہ دیوان مجھے دیا۔ یہ دیوان اب نایاب ہے۔ مولوی محمد سعید صاحب رئیس عظیم آبادی اور مفتی علی اکرم صاحب آروی نے پہلے پہل ۱۲۸۸ھ میں مطبع نظامی واقع کان پور میں اس کو چھپوایا۔

آرہ کے معمر لوگوں سے آپ کے حالات دریافت کئے لیکن دو ایک بات کے سوا کوئی بات معلوم نہ ہو سکی اسی عرصہ میں مجھے نگر نہسہ (مضافات بہار) جانیکا اتفاق ہوا۔ یہاں ایک عزیز نے مولوی محمد سعید حسرتؔ کا کلیات فارسی دیا[1]۔ یہ نسخہ بھی اب نا پید ہے۔ حسن اتفاق سے اثنائے مطالعہ میں کلیات کے اندر آرہ کے بعض لوگوں کے

---

[1] یہ کتاب میرے عزیز بھتیجہ ابوالخیر سلمہ کے پاس تھی، آپ کے پردادا سخاوت علی (صدیقی پھلواری) صاحب بڑے خطاط تھے آپ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے "کشف الخلاصہ" مصنفہ مولانا حافظ شجاع الدین حیدر آبادی اور "مقدمۃ الصلوٰۃ" (نام حق) مصنفہ حضرت شرف بہاری کے قلمی نسخے میرے پاس ہیں۔ میرے دادا مرحوم عبدالعلی صاحب سخاوت علی صاحب کے حقیقی بھائی تھے۔ ع-م

Marfat.com

تذکرہ مل گیا، مزید تفتیش کی تو انور علی یاس مرحوم کا مفصل تذکرہ پایا۔ حسرت مرحوم یاس آروی کے داماد تھے۔ اور آج محض حسرت کے کلیات کی بدولت یاس کا تذکرہ محفوظ ہے، ورنہ شاید اس کے تلف ہو جانے کے بعد یہ بھی کوئی نہیں جانے گا کہ یاس کون تھے اور کب وفات پائی[1]؟

ابتدائی حالات و تعلیم

بعض معمر لوگوں نے بتایا تھا کہ یاس مرحوم کا وطن اصلی موضع بھورہ ضلع پٹنہ تھا لیکن مولانا حسرت نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے، بلکہ وہ آپ کا وطن آرہ بتاتے ہیں۔ ملکی محلہ میں بود و باش تھی، آپ کے بعض رشتہ دار اب بھی موجود ہیں۔ امیر صاحب کے والد مولوی محمد سعید صاحب رجسٹرار مرحوم کو بھی یاس سے نانیہالی رشتہ داری تھی۔ آپ کے والد ماجد کا نام شیخ محمد حیات تھا انھوں نے ۱۲۳۰ھ میں وفات کی، یاس ۱۲۰۸ھ میں پیدا ہوئے۔ لفظ "چراغ" سے آپ کی تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں عظیم آباد میں رہتے تھے قاضی عباس علی مرحوم اور حسین خاں ریاضی داں سے فنونِ متداولہ کی چند کتابیں پڑھیں، اس وقت شیخ غلام علی راسخ کی شاعری کی شہرت تھی، یاس کو علوم عربیہ کے علاوہ شعر و سخن کا بھی ذوق تھا، راسخ مرحوم میر تقی کی صحبت دیکھے ہوئے تھے، یاس نے اُردو غزلوں میں راسخ مرحوم سے اصلاح لی۔ فنونِ جمیلہ کا شوق کافی تھا، بعض ماہروں سے فنِ موسیقی و

---

[1] وزیر علی عبرتی عظیم آبادی (متوفی ۱۳۰۸ھ) نے اپنے تذکرہ معراج الخیال میں یاس کے حالات لکھے ہیں ۱۲

Marfat.com

آلاتِ موسیقی کا استعمال سیکھا۔ آپ کے بڑے بھائی مولوی کرامت علی نے جو ۱۲۳۹ھ میں عدالت آرہ میں مفتی مقرر ہوئے تھے، انتقال کیا تو حاکموں نے آپ کو نوازا اور عدالت کا مفتی اور صدر امین بنا دیا۔

صاحبان بلگرام و مارہرہ سے تعلقات

یاس کو فارسی ادبیات سے گہری دلچسپی تھی۔ بلگرام اور مارہرہ اس زمانہ میں فارسی کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ یاس کو میر افتخار علی ذرہ، میر امامی، میر محمد عسکری، سید سلطان عالم، اور سید صاحب عالم مارہروی کے ساتھ گہرے تعلقات تھے۔ سید عالم صاحب سجادہ نشین مارہرہ نے ۱۲۵۳ھ میں انتقال کیا تو یاس نے عربی میں ایک نہایت پُر اثر تاریخ کہی:

توفی ربہ سلطان عالم ‏ ‏ وقد اعطاہ فی الجنات جاہا

سالت الناس عن تاریخ فوتہ ‏ ‏ لتحصیل علیہ انتباہا

فقالوا آہ وداویلاہ آہا ‏ ‏ فآہا ثم آہا ثم آہا

(ترجمہ) ہمارے آقا سلطان عالم نے وفات کی اللہ تعالیٰ نے آپ کو جنت میں مرتبہ عطا فرمایا۔ میں نے لوگوں سے آپ کی تاریخ وفات کے متعلق سوال کیا تاکہ مجھے معلوم ہو، لوگوں نے کہا، آہ! واویلا! آہ! آہ! آہ!

یاس عربی زبان پر پوری قدرت رکھتے تھے، انہوں نے فیضی کی تفسیر بے نقطہ "سواطع الالہام" کے تتبع میں ایک مطول خط لکھا تھا۔ اسی طرح میر امامی نے اپنی مثنوی "ثمر مراد" لکھی تو یاس نے تاریخ کہی:-

Marfat.com

میر امامی کہ در زمانۂ خود	بایدش جامی و نظامی گفت
مثنوی لطیف و پاکیزہ	ہمہ چوں شاعران نامی گفت

سال اتمام آں دل من یاس
طاقت خامۂ امامی گفت[1]

جوانامرگ فرزند یاس کے ایک لڑکا مولوی منور علی اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکی مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی سے بیاہی ہوئی تھی لڑکا علوم متداولہ سے فارغ ہوچکا تھا لیکن زمانہ نے فرصت نہ دی۔ عین عالم شباب میں ایک سال تک بیمار رہ کر ۱۲۶۲ھ میں وفات کی۔ بوڑھے باپ کے دل و جگر پر اس کا گہرا اثر ہوا چنانچہ سید صاحب عالم صاحب مارہروی نے تعزیت میں یاس کو جو خط لکھا تھا اُسکے جواب میں یاس فرماتے ہیں:۔

نامہ ہر دو بزرگواران بر یک قرطاس بہ پرسش عزاے فرزند مغفرت

---

[1] سید بندہ علی بندہ مارہروی جو صفیر بلگرامی آروی کے پرداد تھے میر امامی کے چچا ہوتے تھے، زندگی نے وفا کی تو صفیر مرحوم کے حالات زندگی اور شاعری پر بھی ریویو کیا جائے گا۔ صفیر مرحوم کا خاندان علم و ادب اور معارف و رشد کا گھرانہ تھا۔ یاس کے اکثر دوست جن کا مولانا حسرت نے تذکرہ کیا ہے۔ صفیر مرحوم کے بزرگ تھے۔ شاعری صفیر کی موروثی چیز تھی۔ وہ خود بھی ایک باکمال شاعر گذرے ہیں اردو کے اکثر اساتذہ سخن مولانا سید امیر حسن بدر، مولوی اسمٰعیل مہرہ مانی واجد حسین وجد سبھوں نے آپ سے فیض حاصل کیا۔ (ع۔م)

Marfat.com

لباس این فقیر ماتم اساس رسیدہ رہین اخلاق کریانہ گردانیدہ درحقیقت
دریں مدت عمر رسیدن این چنیں غم ظاہرا البتہ صعوبتے دارد کہ قوائے
ہمچوں ما ضیفان وپیراں تاب تحمل آں نمی آرد و خود غم پیری مشہور است
کہ اصعب می شود۔

آخر کار وہی ہوا، جس کا یاسؔ مرحوم کو کھٹکا تھا۔ جوان بیٹے کی وفات سے دل بیٹھ گیا، جذبات میں امنگ نہ رہی، دنیا سے دلچسپی کم ہوگئی یاد الٰہی کی طرف طبیعت مائل ہوئی ۱۲۱۲ھ میں ایک مرتبہ حج کر چکے تھے، دوبارہ حج کا ارادہ کیا، آپ کو حضرت سید شاہ احمد پھلواروی قدس سرہٗ سے بڑی عقیدت تھی۔ آخر عمر میں حضرت مولانا شاہ فصیح صاحب غازیپوری کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے اور ہمیشہ ذکر و شغل میں مصروف رہنے لگے ۱۲۶۲ھ میں حج کے ارادے سے اہل و عیال کو لیکر پٹنہ پہونچے تاکہ کلکتہ سے جہاز پر سوار ہو کر بیت اللہ کی طرف روانہ ہوں لیکن حیات نے وفا نہ کی اور ۲۵ ذیقعدہ منگل کی شب کو ۱۲۶۲ھ میں ہیضہ کے عارضہ سے انتقال کیا انا للہ الخ آپ کا مزار پٹنہ میں مولانا سید حسرتؔ کے والد منشی حاجی واعظ علی صاحب کے مکان کے اندر ایک باغیچہ میں واقع ہے۔

خصوصیاتِ کلام

یاسؔ کے بعد بہار میں اُردو اور فارسی کے بڑے بڑے شعرا گذرے ہیں۔ شاہ ابوالحسن فردؔ، شاہ علی حبیب نصرؔ، محمد سعید حسرتؔ، ظہیر احسن شوقؔ (نیموی)، میر علی محمد شادؔ عظیم آبادی، سید فرزند احمد صفیرؔ بلگرامی (آروی)، کی شاعرانہ نکتہ سنجیوں سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، یہ لوگ صرف شاعر نہ تھے

Marfat.com

بلکہ عالم اجل اور فنی مہارت میں یگانہ تھے، شاہ نصر پھلواری کا پورا دیوان رومی کے تاثراتِ حزیں اور سوز و درد سے مملو ہے، نصر کی شاعری کیفیات و جذبات کی شاعری ہے۔ آپ کے یہاں معنی آفرینی اور لفظی صناعیاں کم ہیں مگر اپنے سیلاب جذبات میں پڑھنے والے کو بھی بہالے جاتے ہیں۔ نعت میں کچھ اس انداز کے اشعار کہے ہیں کہ ہر ہر لفظ سے خلوص اور آشفتہ آرزوؤں کا اظہار ہوتا ہے، یہ مناقب شعری حبِ رسول ﷺ کا نتیجہ تھے، جو صوفی گھرانے کی خاص چیز ہے اور ذوق عامہ کا وہاں تک گزر نہیں۔ فرماتے ہیں ؎

چہ عشق است عشق احمدؐ یارب ایں راہ زماں افزا
چہ درد است درد احمدؐ کاں دل پاکم نہاں دارد

کیا کوئی رسمی نعتیہ نگار شاعر اس قسم کا بلند پاکیزہ خیال پیش کر سکتا ہے؟

مولانا حسرت اور شوق نیموی دین کے بلند پایہ عالم گذرے ہیں۔ حسرت نے حافظ اور بابا فغانی، جامی اور عرفی کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں اور حق یہ ہے کہ ان کی بیشتر غزلیں کامیاب رہی ہیں، عرفی کی مشہور غزل ہے ۔

گر کام دل بہ گریہ میسر شدے ز دست　　　صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

حسرت مرحوم نے بھی اس پر غزل کہی جس کا یہ شعر مجھے پسند آیا۔

ماند بہ خندۂ چمن و گریہ سحاب　　　از یار خندہ کردن و از ما گریستن

یار کے نوشخند اور اپنی گریہ وزاری کو خندۂ چمن اور گریۂ سحاب بتانا حسرت کی

Marfat.com

تمثیل نگاری اور شاعرانہ جستجو کا پورا ثبوت پیش کر رہا ہے۔

شوق نیموی کی شاعرانہ قدرت، عذوبت بیان، بدائع شعری اور معاملہ بندی، ان کی مثنوی "سوز و گداز" سے ظاہر ہوتی ہے، آپ کی غزلوں میں وہ جوش و خروش نہیں جو مثنوی میں ہے، پھر بھی آپ کی بہت سی غزلیں کامیاب کہی جا سکتی ہیں، مجھے آپ کا یہ شعر بہت پسند ہے۔

دیکھ کر خلد دل بھر آیا شوق　　　یاد آئی کسی کے گھر کی طرح

اسی غزل کا یہ شعر بھی ہے جو اثر اور کیفیت سے لبریز ہے۔

یاس و حسرت کی خاک اڑتی ہے　　　بے ترے دل ہے اجڑے گھر کی طرح

مگر یاس مرحوم ان اساتذۂ سخن سے بہت قبل گذرے ہیں آپ کا زمانہ میر کے قریب تھا پھر بھی آپ کے کلام میں زبان کی لطافت و صفائی کے اعلیٰ نمونے پائے جاتے ہیں۔

یاس نے اردو میں راسخ مرحوم سے اصلاح لی، خود راسخ بھی یاس کی قدر کرتے تھے اور ان کا کلام سنا کرتے تھے۔

دریائے اشک یاس ہو چشم سے رواں　　　آیا جو ذکر راسخ غفراں مآب کا

اے یاس قدرداں تھے ہماری سخن کے وے　　　کرتے ہیں یاد راسخ غفراں مآب کو

Marfat.com

اب یاں طرزِ سخن میں اے یاسؔ　　　راسخؔ کے یادگار ہیں ہم

معلوم ہوتا ہے اُستاد اور شاگرد کے تعلقات بہت گہرے تھے، دونوں طرف سے خلوص و محبت کا برتاؤ تھا لیکن یاسؔ نے بعض مقطعات میں شاہ نصیرؔ کا بھی تذکرہ کیا ہے

ہیں قدر شناس سخن اے یاسؔ نصیرؔ اب　　　خدمت میں جو اُن کی یہ غزل جائے تو اچھا

معلوم ہوتا ہے راسخؔ کی وفات ۱۲۳۸ھ کے بعد یاسؔ نے شاہ نصیرؔ دہلوی سے مشورۂ سخن کرنا شروع کیا تھا، اور یہ نظریہ اس سے اور بھی محکم ہوتا ہے کہ شاہ نصیرؔ کے تتبع میں یاسؔ نے بھی بعض غزلیں لکھیں۔

ٹیکا و طوق و بالی ہیں مل کر ہلال چار　　　ہیں گرد بدر عارض دل بر ہلال چار

شاہ نصیرؔ اور آپ کے پیرؤں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ادق قوافی و ردیف اور مشکل زمینوں میں کامیاب غزلیں نکالتے ہیں ظفرؔ کے یہاں سنگلاخ زمینوں میں جو غزلیں پائی جاتی ہیں، وہ شاہ نصیرؔ ہی کی مشکل پسندیوں کا نتیجہ ہیں۔ ظفرؔ پہلے شاہ نصیرؔ سے اصلاح لیا کرتے تھے، خود اُستاد ذوقؔ بھی شاہ نصیرؔ کے شاگرد تھے، اس "ہلال چار"، کی ردیف میں شاہ نصیرؔ کی غزل ہے اور یاسؔ شاہ نصیرؔ کے ہمعصر تھے، اُنھوں نے بھی شاہ صاحب کی دقت پسندی کی تقلید میں یہ نظم لکھ ڈالی اور کون کہہ سکتا ہے کہ یاسؔ نے شاہ نصیرؔ سے کم جگر کاوی کی ہے یا ان کی غزل شاہ صاحب کی غزل سے رتبہ میں کم ہے، فرماتے ہیں:۔

لے تیغ پیش ابرو وہ دیکھے تھا ماہ صوم　　　تھی ایک خلق دیکھ کے ششدر ہلال چار

Marfat.com

اس "ہلال چار" کو پورا کرنے کے لئے یاس مرحوم نے نزاکتِ خیال کی کتنی وادیاں طے کیں، تیغ، ابرو، ساعدِ سیمیں اور اصل "ہلال آسمانی" ان چاروں کا اجماع ہو گیا۔ مشکل ردیف کو کس خوبی سے نباہا۔

دو چوڑیاں دو ٹکڑے جو اس مہ کی شب ہوئیں
وقت سحر تھے بر سر بستر ہلال چار

الغرض اسی قسم کے "کوہ کندن" سے کام لے کر یاس نے پوری غزل تمام کی ہے اور میرا خیال ہے شاہ نصیر کے اسکول کی یہ بہترین چیز کہی جاسکتی ہے۔

دیکھو ہر چاندرات میری نیاز
میں ہوں کشتہ ہلال ابرو کا

بالکل شاہ نصیر کے تتبع کا نتیجہ ہے، مگر غور سے پورے دیوان کا جائزہ لیا جائے تو میر کے اسکول کی پوری حیات کارفرما نظر آتی ہے۔ وہی سوز درد، وہی معصومانہ اندازِ بیان، وہی دردمندانہ لہجہ ادا، وہی گداختگی و برشتگی، وہی حزن والم، جو راسخ کو میر سے ورثہ میں ملا تھا، یاس کے یہاں بھی موجود ہے۔ یہ غزل ملاحظہ ہو:۔

سامنے کب وہ یار گزرے ہے
یوں تو دل میں ہزار گزرے ہے

تا دمِ زیست تھے سبھی ہمدم
کون سوئے مزار گزرے ہے

یاس رہ رہ جو آہ کرتے ہو
تیر سا ہے کہ یار گزرے ہے

اس میں شک نہیں آخری مصرع قدسی کے شعر سے مستفاد ہے، جس کو پہلے مرزا سودا نے اردو کا جامہ پہنایا۔

Marfat.com

قدسی کہتا ہے :۔

بہار بے سپر جام دیاری گذرد   نسیم ہمچوں خدنگ از کنارمی گذرد

دہلی کے ایک مجمع علم وادب میں سودا نے قدسی کے اسی خیال کو اُردو میں پیش کیا۔

بہار بے سپر جام دیار گذرے ہے   نسیم تیر سا سینہ کے پار گذرے ہے

اس عہد کا بہت بڑا نقاد ادب، شیخ علی حزیں کا حریف اور مجمع النفائس (تذکرۂ شعرائے فارسی) کا بلند پایہ مصنف خان آرزو مجلس میں موجود تھا فوراً بول اُٹھا۔

شعر سودا حدیث قدسی ہے   چاہیے لکھ رکھیں فلک پہ ملک

لوگوں نے سمجھا کہ "حدیث قدسی" کہہ کر آرزو نے تعریف کی۔ سودا بھی دکھانے کو خان آرزو سے گلے ملے کہ واقعتہً ان کا شعر بمنزلہ حدیث قدسی تھا اور اس لئے لائق ہے کہ ملائکہ اس کو آسمان پر لکھ رکھیں حالانکہ دل میں سمجھا کہ وسیع النظر ناقد کیسی بے لاگ تنقید کر گیا۔

یاس کے اشعار بالا میں جو کیفیت المیہ ہے، وہ تشریح کی محتاج نہیں میر تقی کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے، فرماتے ہیں :۔

ہگی درد تھے ہم یاس دلے آہ نہ کی   یاں تلک درد محبت تو چھپایا ہم نے

یہ انداز بیان راسخ مرحوم کے فیوض کا نتیجہ ہے۔

سینہ میں ایک مونس تھا قلب خستہ اپنا   سو خون ہو کے ہمدم آنکھوں میں آرہا ہے

Marfat.com

صبر و قرار و تسکین دل سو تو لے گئے سب کیا ڈھونڈتے ہو تم اب اس گھر میں کیا رہا ہے

اسی غزل کا یہ شعر ہے۔

ہاتھوں کو اپنے لپکا ہے چاک پیرہن کا ناصح مرا گریباں کیا تو سلا رہا ہے

غالب آپ کے بعد گذرے ہیں اُنھوں نے اسی خیال کو کسی قدر اضافہ کے ساتھ یوں کہا ہے :۔

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

الغرض یاس حقیقتاً میر کے اسکول کے پیرو تھے اور قدرتی طور پر دل بھی ایسا ہی لیکر آئے تھے، اس پر زمانے نے جوان بیٹے کو فنا کے گھاٹ اُتار کر اور بھی غمزدہ بنا دیا، اُن کی کامیاب غزلیں اسی دور حرمانی و حزن کی یادگار ہیں۔

ذیل میں آپ کے کلام کا مختصر سا انتخاب دیا جاتا ہے :۔

عشق میں حالِ دل و دیدہ نہ پوچھ ایک صحرا ایک دریا ہو گیا

کر گذرتے جو جی میں تھا صد حیف نہ ہوا ان تلک گزار اپنا
قیتیں ان کی کیں تمہارے لئے بات کرنا تھا جن سے عار اپنا
ہائے نکلے وہ دشمنِ جانی جن کو جانا تھا دوستدار اپنا

Marfat.com

اے یاس رقیبوں کو ہوا روزِ قیامت
اس شمع کو جب میرے شبستاں میں ہوئی صبح

ہم نے اس سرو کو دیکھا تھا خراماں اک دن
پھرتی آنکھوں میں ہے وہ خوبیِ رفتار ہنوز

ارتباطِ شمع سے روشن ہے پروانہ کا حال
کیا کرے کوئی کسی سے آشنائی کی ہوس

سوزاں ہیں اشکبار ہیں ہم
محفل میں شمع وار ہیں ہم
چشم عالم کے توتیا ہیں
کس کے در کے غبار ہیں ہم
جن کی خاطر تُنک ہوئے آہ
ان کی خاطر کے بار ہیں ہم

بند سب کے کھلے باز رہے پر اپنے بندھے
فصل گل کے ہوئے اس رنگ سے ایام تمام

اک عمر کے بعد ان کا میرے پاس یہ پیغام
آیا ہے کہ اس کوچہ میں جایا نہ کروں میں

Marfat.com

سیر گلشن سے بافراغ ہوں میں — ہمہ تن یعنی داغ داغ ہوں میں
سر میں شورِ جنوں و دل میں طپش — طرفہ رکھتا دل و دماغ ہوں میں
کھویا جاتا ہوں دل میں سو سو بار — کس کا یوں در پئے سراغ ہوں میں

اعجاز عیسوی سے توقع بریدہ ہوں — جادوئے چشم یار کا آزار دیدہ ہوں
وضع جہاں سے نفرتِ دل کا معاملہ — یاں تک کھنچا کہ آپ سے بھی اب کشیدہ ہوں
بزمِ جہاں میں سوز دروں سے برنگ شمع — جس دن سے میری آنکھ کھلی آبدیدہ ہوں
رونے کی جا ہے یاس یہ افتادگی مری — حسرت بھری نگاہ کا اشکِ چکیدہ ہوں

Marfat.com

غالب کی اخلاقی کمزوریاں

نگارمیں آپ نے مصحفی کے تذکرہ "عقد ثریا" پر میرا تبصرہ پڑھا ہوگا لیکن بہت بڑا ادبی ظلم ہوگا اگر کوئی شخص عقد ثریا پر کچھ لکھے اور غالب کے ان خطوط کا تذکرہ نہ کرے جو عود ہندی میں پائے جاتے ہیں، یا قاطع برہان یا اسی نوع کی دوسری تحریروں میں موجود ہیں جن میں مرزا صاحب نے اپنی بلند ذوقی اور "ایران نوازی" کا ثبوت دیا ہے، عقد ثریا میں انسان بیدل، آرزو، قتیل، واقف، فاخر، مظہر، کے حالات و کلام کا مطالعہ کرتا ہے اور وہ ہندوستانیوں کے اکتسابات شعروادب پر فخر کرتا ہے، لیکن جب عود ہندی میں غالب کی لن ترانیاں دیکھتا ہے تو اس کے حوصلے بڑی حد تک پست ہو جاتے ہیں، ایک طرف کلمات الشعرا[1]، سرو آزاد، عقد ثریا، گلِ رعنا، سفینۂ خوشگو، مجمع النفائس رکھئے اور دوسری طرف مرزا صاحب کی ان طنزیات پر غور کیجئے اور فیصلہ کیجئے کہ غالب جیسے فرزندانِ ہند کی ذہنیت نے شعروادب کے ذریعہ ملک وملت کے مفاد کو کس حد تک نقصان پہونچایا ہے، کاش مرزا صاحب زندہ ہوتے اور میں پوچھتا کہ حضرت! قتیل، واقف، ممتاز

---

[1] مرزا افضل سرخوش۔

Marfat.com

وغیاث بے مایہ سہی، ناصر علی و بیدل، آرزو و مظہر فارسی دانی سے نابلد سہی لیکن جس رنگ کے فارسی شعر اُنھوں نے کہے ہیں کسی ایرانی کا ایک بھی اُردو شعر اس پایہ کا دکھا دیجئے، اگر ہندوستان میں فارسی زبان کے ایسے شعرا نہ گزرے جن کا مثل ایران بھی نہ پیدا کر سکا، جن کی ادبیت و فارسی دانی کو ایرانیوں نے بھی تسلیم کر لیا تو بھی ہندوستانیوں کے لئے یہی بات کیا کم باعث فخر تھی کہ ہندوستان خسرو و فیضی، بیدل و ناصر علی پیدا کر سکا اور ایران زبان اُردو کا کوئی ایسا شاعر بھی پیش نہیں کر سکتا جو کم سے کم جعفر زٹلی کا ہی ہم رتبہ کہا جا سکے۔ تذکروں میں بعض ان ایرانی شعرا کا حال ملتا ہے جو ہندوستان آئے اور ریختہ کی طرف بھی مائل ہوئے، انھیں میں مرزا معز فطرت اور قزلباش خاں اُمید بھی ہیں۔ فطرت معاصر تھے بیدل، ناصر علی، سرخوش وغیرہ کے۔ مرزا افضل سرخوش کو ان سے بڑی عقیدت تھی، وہ یہانتک لکھ جاتے ہیں کہ "قرار داد جمیع مستعدان زمان است کہ آں زمان ہیچ یکے بہ قابلیت و کمالات میرزا ولایت نیامدہ"[۱]، لیکن جب اُنھوں نے ریختہ میں شعر کہا تو یہ:-

از زلف سیاہ تو بہ دل دھوم پڑی ہے در گلشن آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

اُمید بھی ایران سے آئے تھے اُن کی طرف بھی ریختہ کے اشعار منسوب ہیں میر اور قائم کے علاوہ ان کے یہ اشعار گردیزی اور میر حسن نے بھی لکھے ہیں، میر

---

[۱] کلمات الشعرا۔

Marfat.com

کے معاصر تھے۔ میر صاحب کا بیان ہے :۔

داخل ذیل امرا بود در ہر سیر و تماشا می رفت و صحبتہا می داشت چنانچہ یک روز در عرس سید حسن رسول نما صاحب قدس سرہٗ بندہ نیز بہ تحریک یاران موافق رفتہ بود او ہم تشریف می داشت چوں مرا از دور دید، گفت کہ خوش باشد کہ من ہم دریں ایام دو شعر ریختہ موزوں کردہ ام۔ بشنوید۔[1]

اس کے بعد میر صاحب نے اُمید کے وہ دونوں شعر نقل کئے ہیں جو یہ ہیں :۔

در و دیوار سے اب صحبت ہے   یار بن گھر میں عجب صحبت ہے
تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں   الحفیظ الحفیظ کرتا ہوں

فطرت کے مقابلہ میں اُمید کے یہ شعر، صاف، سلیس اور محاورہ سے قریب ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ شاعری کا وہ دور ہے جبکہ اُردو اپنے شباب کو پہونچ چکی تھی، سودا، اثر، درد، سوز اور میر تقی جیسے نقادانِ سخن کے سامنے اُمید کے ان شعروں کی کوئی حقیقت ہے؟ ایرانی شعرانے بہت سر مارا تو یہ چند شعر کہے۔ اسی کے مقابلہ میں بیدل کا ضخیم فارسی کلیات دیکھئے، ناصر علی کا دیوان پڑھئے اور فیصلہ کیجئے کمال کے اعتبار سے شعرائے ایران قابل داد ہیں یا شعرائے ہند!

اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہی غالب جو خود ہندی میں یہ کچھ لکھتا ہے، "اُردوئے معلیٰ" میں فارسی زبان کے بہت سے ایسے شعرا کی مدح کرتا ہے جو اس

---

[1] نکات الشعرا صفحہ ۸

Marfat.com

عہد میں سجادہ نشینی یا کسی بلند منصب پر فایز تھے، ان کی اکثر تحریریں پھولواری اور بہار میں محفوظ ہیں۔ خود آرہ کے مشہور شاعر باقر کی فارسیت کی مرزا صاحب نے ستایش کی ہے[1]۔

اب آیئے کسی قدر تفصیل کے ساتھ مرزا صاحب کے ترہات پر بحث کریں مرزا صاحب چودھری عبدالغفور سرور کے نام خط لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں:۔

فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت طبیعت کی ہے پھر تتبع کلام اہل زبان، لیکن نہ اشعار قتیل و واقف و شعرائے ہندوستان کو یہ اشعار سوائے اس کے کہ ان کو موزونی طبع کہئے اور کسی تعریف کے شایان نہیں ہیں نہ ترکیب فارسی نہ معنی نازک ہاں الفاظ فرسودہ عامیانہ جو اطفال دبستاں جانتے ہیں اور جو متصدی نثر میں درج کرتے ہیں وہ الفاظ فارسی یہ لوگ نظم میں خرچ کرتے ہیں جب رودکی و عنصری و خاقانی و رشید وطواط اور ان کے امثال و نظایر کا کلام بالاستیعاب دیکھا جائے اور ان کی ترکیبوں سے آشنائی بہم پہونچے اور ذہن اعوجاج کی طرف نہ لے جائے تب آدمی جانتا ہے کہ ہاں فارسی یہ ہے[2]۔

مرزا صاحب نے ایک سانس میں ہندوستانی فارسی کے سارے ذخیرہ کو زباندانی اور نزاکت معنی کے اعتبار سے بے مایہ کہہ دیا، اسی کے ساتھ فارسی کی تکمیل کے لئے تتبع کلام اہل زبان اور مناسبت طبیعت کو لازمی ٹھیراتے ہیں، آگے چل کر جب مرزا صاحب نے

---

[1] مقدمہ دیوان باقر سید عطا حسین
[2] عود ہندی صفحہ ۸

Marfat.com

ادہی قتیل و واقف اور شعرائے ہند کی "موزونی طبع" کو تسلیم کر لیا ہے تو پھر "مناسبت طبیعت" کی بحث ہی ختم ہو جاتی ہے اور اگر "مناسبت طبیعت" سے ان کی مراد شعریت ادبیت کے علاوہ کچھ ہے تو اس اہمال سرائی اور ایہام طرازی کی تشریح بھی کرنی چاہئے قی، رہ گیا تتبع کلام اہل زبان، تو اس کے متعلق تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ قتیل و واقف نے کس اہتمام کے ساتھ حصول زبان اور تتبع اہل زبان کی طرف توجہ کی۔ قتیل نے مرزا ہد باقر شہید اصفہانی کی ظل عاطفت میں تربیت پائی۔ شہید ہی نے مرزا صاحب کیلئے تیل تخلص پسند کیا۔[۱]

واقف کے لئے بھگوان داس کی شہادت سنئے:۔

"خودش می گفت کہ در اوایل از ہندر اہن "خوشگو" و آفرین لاہوری (شاہ فقیر اللہ) اصلاح شعر گرفتہ ام آخر دفع کلام ایشان مطبوع طبع من نیفتاد دیوان سعدی و خسرو را پیش نہادہ بمشق سخن پرداختم۔[۲]"

واقف نے سعدی اور خسرو کا کلام پیش نظر رکھ کر مشق کی۔ سعدی تو مسلمات میں سے ہیں، رہ گئے خسرو تو ان کی اہلیت و عظمت، ان کی زبان دانی و نکتہ سنجی کا اعتراف مرزا صاحب کو بھی ہے۔[۳] جہاں تک اصول انتقاد کا تعلق تھا، مرزا صاحب کے معیار قتیل و واقف پورے اترتے ہیں۔ اب آپ ہی فیصلہ کیجئے ہم ان ترہات کو مرزا صاحب

---

۱ عقد ثریا

۲ سفینہ ہندی مخطوطہ پٹنہ لائبریری

۳ عود ہندی صفحہ ۴۳

Marfat.com

کی زبان دانی کا نتیجہ سمجھیں یا زبان درازی کا۔

رودکی و عنصری، خاقانی و دطواط کی مثال دیکر انھوں نے جیسی تنقید کی ہے
اور پھر شہادت و توضیح سے جس طرح گریز کیا ہے اس سے سوائے اس کے کہ مرزا صاحب
کا تعصب ظاہر ہو اور کوئی انتقادی نظریہ واضح نہیں ہوتا۔ اس لئے ہم بھی اس پر
التفات کرنا پسند نہیں کرتے، ہاں دوسری جگہ مرزا صاحب نے اس کی وضاحت
کی ہے آگے یہ بحث آتی ہے، ہم مرزا صاحب کے اُس دعوے پر نقد و نظر کرینگے
ایک اور لن ترانی سنئے، حضرت صاحب عالم صاحب کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے
ہیں :-

نظامی ایسا ہوا کہ جب تک فرید آباد کا کھتری دیوانی سنگھ متخلص بہ قتیل جس کو
حضرت نے مرحوم لکھا ہے، اُس کی تصدیق نہ کرے تب تک اُس کا کلام قابلِ
استناد نہ ہو۔ قتیل اساتذۂ سلف کے کلام سے قطعاً آشنا ہی نہیں اس کے علم
فارسی کا ماخذ ان لوگوں کی تقریر ہے کہ نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ممالک
مغربی کی طرف سے لکھنؤ آئے اور ہنگامہ آرا ہوئے، بیشتر ان میں کشمیری یا کابلی
و قندھاری تھے اور اگر احیاناً کوئی عامہ اہل ایران سے بھی ہو، تو تقریر اور ہے
تحریر اور ہے۔ اگر تقریر بعینہ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ بقراط سے اور
شرف الدین علی یزدی اور ملا حسین واعظ کاشفی اور طاہر وحید یہ سب نثر میں کیوں
خون جگر کھایا کرتے۔ وہ سب طرح کی نثر میں جو لالہ دیوانی سنگھ قتیل متوفی نے

Marfat.com

بہ تقلید اہل ایران لکھی ہیں نہ رقم فرمایا کرتے یہ شخص مدعی ہے کہ کدہ کا لفظ سوائے چار پانچ اسم کے اور اسم کے ساتھ ترکیب نہیں پاتا، پس آرزو کدہ اور دیو کدہ اور نشتر کدہ اور امثال اس کے جو ہزار جگہ اہل کلام میں آیا ہے وہ نادرست ہے۔ میں اور آپ بیٹھیں اور اس کے خرافات پڑھے جائیں اور جو میں عرض کروں اُس پر حضور غور فرمائیں۔ تب معلوم ہو کہ یہ کتنا لغو اور فارسی دانی سے کتنا بیگانہ ہے۔[1]

مرزا صاحب کے سطور بالا پڑھیے اور تضاد بیان، اور انحراف اُصول پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔ غریب کو یاد نہ رہا کہ زبان کے باب میں اُنھوں نے جو اصول قائم کیا ہے، اُس سے انحراف تو نہیں کر رہے ہیں۔ مرزا صاحب بڑے طنطنہ کے ساتھ عود ہندی میں ایک جگہ عرفی اور ابو الفضل کا مناظرہ نقل کرتے ہیں اور اپنے زعم میں عرفی کی فتح تسلیم کرتے ہوئے یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ عرفی نے جب سے ہوش سنبھالا ایران کے بڈھوں اور بڈھیوں سے فارسی سُنی یہاں پر اُنھوں نے سُنی ہوئی تقریروں کو زباندانی کے لئے لازمی قرار دیا۔[2] اور پھر سطور بالا میں یہ بھی فرمانے لگے "تقریر یاد رہے تحریر یاد رہے"۔ اگر یہی کلیہ ہے تو پھر مرزا صاحب کا سارا قصر بنیاد ہی سرنگوں ہو جائے گا، چونکہ اہل ایران کی تحریروں ہی نے خسرو و فیضی، بیدل و ناصر علی، ماہر و سرخوش پیدا کئے۔

اب رہ گئی یہ بحث کہ قتیل پر قندھاری و کابلی ماہرین فارسی نے اثر ڈالا تھا، جو

---

[1] عود ہندی صفحہ ۱۴۔ ۱۵

[2] عود ہندی صفحہ ۳۴

Marfat.com

نواب سعادت علی خاں (والی اودھ) کے زمانہ میں لکھنؤ آگئے تو یہ بھی مرزا صاحب کی
قلت مطالعہ و عدم وقوف کا نتیجہ ہے، مرزا قتیلؔ جب دیوانی سنگھ تھے اسی وقت
فیض آباد میں میر باقر شہید اصفہانی جیسے شاعر باکمال اور ماہر اہل زبان کا سایہ نصیب
ہوا۔ قتیلؔ کی عمر اس وقت ۱۸ سال کی تھی، بالکل نوجوان تھے، شہیدؔ ہی نے بقول مصحفی
ان کو مسلمان کیا۔

اس انتقاد کے سلسلہ میں مرزا نے نظامی کا بھی نام لیا ہے، شاید انھیں معلوم نہیں کہ
نظامی کی شہرت اور سربلندی کا سبب ان کی زباں دانی اور فارسیت نہیں بلکہ صو
ارشادات و معارف نے ان کو یہ عزت بخشی ہے، ورنہ زبان و انشا کے لحاظ سے شعرائے
اصفہان اور شیراز نظامی، رومی اور عطار وغیرہ کو قابل استناد نہیں سمجھتے، اسی طرح
جس طرح دہلی اور لکھنؤ والے دکن و بنگالہ کے سخنوروں کو نظر میں نہیں لاتے

حضرت صاحب عالم صاحب کو ایک خط لکھتے ہیں اور سجع اور ایطا کے متعلق طویل
بحث کرتے ہوئے عبدالواسع، غیاث الدین (صاحب غیاث اللغات) اور محمد حسین
(قتیلؔ) کی شان میں جو نالائم کلمات استعمال کئے ہیں، وہ مرزا صاحب کے اخلاق
تربیت و تہذیب کے بہت کچھ آئینہ دار ہیں، سُنئے اور داد دیجئے:۔

میرے بیان پر غور کرو، اور جو عبدالواسع اور غیاث الدین اور عبدالرزاق ان
ناموں کی شوکت نظر میں ہے تو تم جانو ایک شخص بھیک مانگتا ہے باپ نے اس کا
نام میر بادشاہ رکھ دیا ہے۔ اصل فارسی کو اس ،، کھتری بچہ، قتیل علیہ ما علیہ نے

Marfat.com

تباہ کیا رہا سہا غیاث الدین رام پوری نے کھو دیا، ان کی سی قسمت کہاں سے لاؤں
جو صاحب عالم کی نظر میں اعتبار پاؤں، خالصاً للہ غور کرو کہ وہ "خران ناشخص"
کیا کہتے ہیں اور میں خستہ دردمند کیا بکتا ہوں، واللہ نہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے
اور نہ غیاث الدین فارسی جانتا ہے، میرا خط پڑھو یہ نہیں کہتا کہ خواہی نہ خواہی
پڑھو، قوت ممیزہ سے کام لو، "ان غولوں پر لعنت کرو" سیدھی راہ پہ آجاؤ
اگر نہیں آتے تم جانو تمہاری بزرگی پر اور مرزا تفتہ کی نسبت پر نظر کرکے لکھا ہے
نہیں کہتا کہ خواہی نہ خواہی میری تحریر کو مانو مگر اس "دکھتری بچہ" سے اور اس
"معلم" سے مجھ کو کمتر نہ جانو، عربی کا حرف اور ہے، فارسی کا قاعدہ اور ہے
سمجھو نہ سمجھو تم کو اختیار ہے، عقل کو کام فرماؤ، غور کرو، سمجھو، عبدالواسع پیغمبر
تھا، قتیل برہما نہ تھا، واقف غوث الاعظم نہ تھا، میں یزید نہیں ہوں، شمر
نہیں ہوں مانتے ہو مانو نہ مانو تم جانو۔[1]

یہ ہے اخلاقی مرتبہ اس عظیم الشان شاعر کا، جو ہماری زبان وادب کا ہیرو سمجھا
جاتا ہے۔ یقیناً کسی انسان کی ادبی زندگی اس کی اخلاقی خصوصیات سے بالکل الگ
چیز نہیں کہی جا سکتی، لیکن غالب کی اخلاقی کمزوریوں نے ان کی شعریت اور ادبیت کا
پلہ بہت کچھ سبک کر دیا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی فلسفہ طرازیوں اور شاعرانہ نکتہ سنجیوں
کے لحاظ سے اگر ایک طرف احترام کا مستحق ہے تو دوسری طرف اپنی بد زبانی، اعوجاج تنگ

---

[1] عود ہندی صفحہ ۱۰۱

اور خود پرستی کے باعث حد درجہ قابلِ الزام بھی ہے فتیل و واقف، عبدالواسع و غیاث ال
اس کے ہمعصر نہ تھے اور اس لئے غالب کی ہرزہ سرائیوں کو معاصرانہ رقابت کا نتیجہ کہہ
نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ معاصرین کے ساتھ رشک و رقابت کے واقعات سے شعراء علما
کے علاوہ صوفیہ کے تذکرے بھی بھرے ہوئے ہیں۔

شیخ نجم الدین صغری کا حضرت قطب الدین بختیار کاکی سے کشیدہ ہونا، علامہ راز
اور حضرت بہاؤ الدین کی کشاکش۔ بدیوانی و فیضی کی شکر رنجیاں، معاصرانہ چشمک کا نتیجہ ہیں
اگر صورت حالات یہی ہوتی تو ہم مرزا صاحب کو معاف کر دیتے لیکن ایسا نہیں، ان کو اپ
فارسی دانی کا بڑا پندار تھا۔ وہ اپنے سامنے کسی کو نظر میں نہ لاتے تھے، اللہ اللہ وہی شخص
جو ایسا بلند شعر کہے:۔

نہ دارد بت پرستی عیب عار خود پرستیدن — خدا توفیق کیش کفر بخشد دیں پناہاں
وہی شخص خود پرستی کے قعر ذلت میں نظر آئے۔ وہی شاعر جو ایک اسلامی فرماں روا
سامنے یوں سر نیاز خم کرے۔

خانہ زاد اور مرید اور مداح — تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر — نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

یا بہادر ظفر کی شان میں یوں کہے:۔

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا — ہے فخر سلیماں جو کرے تیری وزارت
اور یہیں پر ختم نہیں شاہزادہ جواں بخت کی تقریب شادی میں سہرا لکھے اور اس پر ف

Marfat.com

کرے، تن ڈھانکنے کو کپڑے اور قرض ادا کرنے کو روپے مانگے، اور طرح طرح کی نیاز مندیوں کا اظہار کرے کیا اس کے لئے سزاوار تھا کہ حکومت کا نقشہ بدلتے ہی ساری عقیدت کیشیوں کو بھول جائے، بادشاہ قید ہو جائیں، شاہزادے مارے جائیں، بیگمات مصیبت جھیلیں، لال قلعہ کے در و دیوار سے حسرت و حرمانی ظاہر ہو، اور وہ قصیدے لکھے ان کی شان میں جنھوں نے ہماری تہذیب ہمارے تمدن کو مٹایا، ہماری حکومت چھین لی ہمیں گھر سے بے گھر کیا۔ آپ بھی سن لیجئے فرماتے ہیں :-

پرسش گری تا کجا صاف نہ گویم چرا
ہر کس شیوۂ خاصے در ایثار است ارزانی

ہند ز لارڈ آکلنڈ رونق دیگر گرفت
زمن مدح وزلارڈ آتن برا گنجینہ افشانی

چارلس ٹمکف فرخندہ شمایل کہ بہ دہر
آسماں پایہ حبس تامسن آں قلزم فیض

بستہ بر دامن نظارہ ز فردوس طراز
باد جائش بہ جہاں تا بہ جہاں جا ماند

فرزانہ پرنسب کہ ستایندہ بہ جاہش
مرحبا داورجم مرتبہ تامس ماڈک

چنداں کہ پرستند خدارا بہ خدائی
بنگر ایں صفحہ کہ آرائش دیوان من است

اچھا آیئے، اب دیکھیں کہ ہندوستان کے فارسی ادب پر تنقید کرتے ہوئے مرزا صاحب کیا فرماتے ہیں :-

میرا قیاس اس کا مقتضی ہے کہ پیر و مرشد حضرت صاحب عالم مجھ سے آزردہ ہیں

Marfat.com

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ میں نے ممتاز و اختر کی شاعری کو ناقص کہا تھا، اس رقعہ میں ایک میزان عرض کرتا ہوں، حضرت صاحب ان صاحبوں کے کلام کو یعنی ہندیوں کے اشعار کو قتیل و واقف سے لیکر بیدل ناصر علی تک اس میزان میں تولیں میزان یہ ہے، رودکی و فردوسی سے لیکر خاقانی و سنائی و انوری وغیرہم تک ایک گروہ ان حضرات کا کلام تھوڑی تفاوت سے ایک وضع پہ ہے، پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہوئے، سعدی و جامی و ہلالی یہ اشخاص متعدد نہیں، فغانی اور ایک شیوۂ خاص کا مبدع ہوا۔ خیالہائے نازک و معانی بلند اس شیوہ کی تکمیل ظہوری، و نظیری، عرفی و نوعی بھی سبحان اللہ قالب سخن میں جان پڑگئی اس روش کو بعد اس کے صاحبان طبع نے سلاست کا چرچا دیا، صائب و کلیم و سلیم و قدسی و حکیم شفائی اس زمرہ میں ہیں، رودکی و اسدی و فردوسی، یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا اور سعدی کے طرز نے بسبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا فغانی کا انداز پھیلا اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے، تو اب طرزیں تین ٹھہریں ہیں، خاقانی اور اس کے اقران، ظہوری اس کے امثال، صائب، اس کے نظایر۔ خالصاً للہ ممتاز و اختر وغیرہم کا کلام ان تین طرزوں میں سے کس طرز پر ہے۔ اچھی طرز ہے مگر فارسی نہیں ہے، ہندی ہے، دار الضرب شاہی کا سکہ نہیں ہے، ٹکسال باہر ہے داد داد، انصاف انصاف[۱]

---

[۱] عود ہندی صفحہ ۴۵، ۴۶

مرزا صاحب کی یہ "میزان"، اگر کسی یورپین مستشرق کے سامنے رکھدی جائے، تو معلوم نہیں وہ ان کی "جہرنیمروز" اور کلیات نظم کو ان کی تراوش فکر کا نتیجہ بھی سمجھنے کے لیے تیار ہوگا یا نہیں، جو شخص تاریخ و تذکرہ سے اس حد تک ناآشنا ہو کہ فارسی شاعری کی تین طرزیں قرار دے اور خاقانی کے ساتھ فردوسی کا نام لے، سعدی کے ساتھ جامی و ہلالی کا، ظہوری کے ساتھ نظیری کا اور صائب کے ساتھ قدسی و شفائی کا وہ دوسروں کے رنگ کلام پر تبصرہ کرے! حیرت ہے، کاش مرزا صاحب زندہ ہوتے اور کوئی پوچھتا حضرت! تاریخ و لسانیات کے حقایق و نکات جو آپ نے بیان فرمائے ہیں، ان میں سب سے اہم چیز تھی وہی آپ نے چھوڑ دی، مانا طرزیں تین ہی سہی لیکن ضرورت تو یہ تھی نا کہ ان کی خصوصیات سلسلہ وار گنائی جاتیں اور پھر ممتاز واخر، واقف و قتیل، بیدل و ناصر علی کے کلام کا تجزیہ کرکے اس میزان پر تولا جاتا، اگر کوئی مدعی یہ کہہ دے کہ ان طرزوں میں سے کسی نہ کسی طرز سے شعرائے ہند کا کلام ضرور مل جاتا ہے تو پھر آپ کے پاس کیا جواب ہے، یہ تو محض آپ کا ادعا ہی ہے، دلایل و نظایر تو آپ نے دیئے نہیں اب کوئی خاک اس میزان سے کام لے۔

اب آیئے مرزا صاحب کی ان تین طرزوں پر تاریخ و تذکرہ کی روشنی میں بحث کریں، فرماتے ہیں:-

"رودکی و فردوسی سے لیکر خاقانی و سنائی و انوری وغیرہم تک ایک گروہ ان حضرات کا کلام تھوڑی تفاوت سے ایک وضع پر ہے:"

Marfat.com

رودکی، فردوسی کو خاقانی، سنائی اور انوری کی صف میں لانا ایسا ہی ہے، جیسے کوئی نصلی اور ولی وغیرہ کو میر، قائم اور ضیا کا ہم رنگ بتائے اس میں شک نہیں فارسی کی عشقیہ شاعری کی ابتدا رودکی ہی سے ہوتی ہے۔ چنانچہ مولانا شبلی نے بھی یہی لکھا ہے، مگر نہ رودکی کو فردوسی سے کوئی نسبت ہے اور نہ فردوسی کو خاقانی سے اور نہ سنائی وانوری میں کوئی تشابہ ہے۔ دقیقی، اسدی، فردوسی نے فارسی کی مثنوی نگاری کی غیر فانی خدمتیں انجام دیں۔ اسی طرح خاقانی نے صوفیانہ شاعری کو ترقی دی، چنانچہ جامی کا یہ لکھنا "دیر اوراء طور شعر طور دیگر بودہ است"[۱] اور ملا نور اللہ شوستری کا یہ نظریہ "در مواعظ و حکم طریقہ شیخ سنائی پیمودہ"[۲] اپنی جگہ بالکل حقیقت ہے، جامی اور شوستری کی تائید دولت شاہ کی اس تحقیق سے بھی ہو جاتی ہے کہ خاقانی پہلے حقائقی تخلص کرتے تھے[۳]۔ بات یہ ہے کہ اتفاقات نے خاقانی کی صوفیانہ رشحاتِ فکر میں درباری زندگی کی تلخیاں ڈال دیں اور وہ سعدی و سنائی کی طرح نیم صوفی ہو کر رہ گئے ورنہ آج ان کا پایہ رومی و عطار سے کم نہ ہوتا تخلص حقائقی کا انتخاب ہی بتا رہا ہے کہ شروع ہی سے ان کا رجحان، فلسفہ اخلاق و حکمیات کی طرف تھا اگر منوچہر شروان شاہ کے دربار سے وابستگی نہ ہوتی تو وہ بہت بلند صوفی شاعر ہوتے، قصیدہ گوئی میں یقیناً انکو ید طولیٰ حاصل تھا، لیکن صوفیانہ، حکیمانہ، اور منجانہ تلمیحات نے اس کے قصائد کو انوری سے

---

[۱] نفحات الانس [۲] مجالس المومنین مخطوطہ پٹنہ لائبریری

[۳] تذکرہ دولت شاہ سمرقندی مخطوطہ پٹنہ لائبریری

Marfat.com

بالکل متمایز رکھا ہے، اس لحاظ سے بھی انوری سے اور اس سے کوئی مماثلت نہیں۔

مرزا صاحب دوسری طرز کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہوئے، سعدی و جامی دہلالی، یہ شخاص متعدد نہیں"

بیشک سعدی نے ایک خاص طرز کی ایجاد و اختراع کی، لیکن کس صنف کلام میں؟ مرزا صاحب نے یہ نہیں بتایا سعدی جس دور میں گذرے ہیں وہ صوفیانہ شاعری کے شباب کا زمانہ تھا، اسی وقت رومی و نظامی بھی گزرے ہیں یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر نکلسن سعدی کو نیم صوفی "کہتا ہے[1]۔ صوفیانہ شاعری میں اپنی عملی اخلاقیات کے باعث سعدی ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں، لیکن اس کے موجد نہیں، ہاں فارسی تغزل میں انھوں نے اپنی ایک خاص راہ نکالی، اس صنف میں نہ تو وہ کسی کے مقلد و متبع ہیں اور نہ فارسی شعرا میں ان کا ہمسر ہوا، جامی کو تغزل میں سعدی سے دور کا بھی واسطہ نہیں، عراقی کے ہمرنگ ہوں گے، البتہ مثنوی نگاری و صوفیانہ شاعری میں وہ نظامی و خسرو کے پہلو بہ پہلو ہیں۔

تیسری طرز کے متعلق مرزا صاحب کا ارشاد ہے:۔

"فغانی اور ایک شیوہ خاص کا مبدع ہوا، خیالہائے نازک و معانی بلند اس شیوہ کی تکمیل کی ظہوری و نظیری، عرفی و نوعی بھی سبحان اللہ قالب سخن میں جان پڑ گئی اس روش کو بعد اس کے صاحبان طبع نے سلاست کا چرچا دیا صائب و

---

[1] مقدمہ دیوان شمس تبریز مطبوعہ کیمبرج

کلیم و سلیم و قدسی و حکیم شفائی اس زمرہ میں ہیں۔"

یک لخت مرزا صاحب ساتویں صدی سے اُچھل کر دسویں صدی تک چلے آئے اور درمیان میں حافظ کو ہضم کر گئے جو بذات خود ایک خاص طرز کے مبدع ہیں، اچھا اسے جانے دیجئے، بیشک فغانی نے ایک خاص شیوہ کی ابداع و اختراع کی اور عہد اکبری کے وہ کثیر التعداد عظیم المرتبت شعرا، عرفی، تقی اوحدی، ظہوری، قمی، نظیری وغیرہ نے جو ہندوستان میں آئے فغانی کی پیروی کی جیسا کہ تذکروں سے ثابت ہے، تقی اوحدی کا خود اعتراف ہے کہ جس زمانہ میں وہ اصفہان سے شیراز آئے تو عرفی سے ملے۔ اس وقت مشاعروں میں طرح کے لئے بابا فغانی کے اشعار کا انتخاب ہوتا تھا[۱]، خان آرزو نے بھی اسی کو عرفی کے ذکر میں دہرایا ہے[۲]۔ مرزا صاحب ظہوری کے زلہ ربا ہیں اور اُنھوں نے فارسی غزلیات میں بڑی حد تک اسی کے خوان کرم کی ریزہ چینیاں کی ہیں پھر بھی اُنھوں نے اس کے ساتھ عرفی و نظیری کا بھی نام لیا ہے، عرفی و نظیری میں ایک حد تک ہم رنگی بھی پائی جاتی ہے۔ گو صائب کا مشہور شعر ہے:۔

صائب چہ مجال است شوی ہمچون نظیری   عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

اسی پر تبصرہ کرتے ہوئے خان آرزو فرماتے ہیں "انصاف اینکہ طرز و طور ہر سہ اُستاد جدا است و کلام ہر یکے را چاشنی خاصے[۳]" لیکن ظہوری دورِ متاخرین میں ایک

---

[۱] عرفات العاشقین مخطوطہ پٹنہ لائبریری   [۲] مجمع النفائس جلد ۲ مخطوطہ پٹنہ لائبریری

[۳] مجمع النفائس ذکر نظیری

Marfat.com

خاص طرز کا مالک ہے، اس سے قبل فارسی زبان میں کسی شاعر کے یہاں اس اسلوب، ادا، وطرز کا پتہ نہیں جو اس کی غزلیات میں ہیں، معنی آفرینی کے اعتبار سے وہ اپنی آہنگ میں یگانہ تھا، مرزا صاحب کی فارسی غزلیات ظہوری ہی کی پیروی کا نتیجہ ہیں[1]۔ اسی طرح نظیری کو کوئی نسبت ہوگی تو کیٹس اور قائم سے وہی سوختہ سامانی اور غم کوشی، دل فروشی اور پامالی جس نے کیٹس اور قائم پیدا کئے نظیری کے خمیر میں بھی ودیعت تھی۔

مرزا صاحب نے صائب اور کلیم و سلیم، قدسی و حکیم شفائی کو ایک صف میں لا کھڑا کیا اور پھر اس کے بعد دور عالمگیری سے لیکر ان کے عہد تک جتنے ایرانی شعرا ہندوستانی میں آئے ان کا کوئی ذکر ہی نہیں، میں پوچھتا ہوں سرخوش، آزاد اور حزیں نے اپنے تذکروں میں جن معاصر ایرانی شعرا کا حال لکھا ہے، ان کے متعلق مرزا صاحب کا کیا فیصلہ ہے۔ محمد سعید اشرف، مرزا معز فطرت، حزیں، واله یا پھر جو ہندوستان نہ آئے جلال اسیر، آذر، راہب وغیرہ کا کلام کس طرز میں ہے۔ صائب نے حکیم رکنائے کاشی اور حکیم شفائی سے استفادہ ضرور کیا[2]۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ صائب کا کلام تو ان کی زندگی ہی میں اس قدر مشہور ہو جائے کہ بقول مرزا افضل سرخوش غیر ممالک میں تحفتہً جائے، شاہان روم وغیرہ عباس ثانی سے دیوان صائب طلب کریں[3]

---

[1] ملاحظہ ہو، سرزمین ایران کا ایک رعنا ادیب دکن میں، از عبدالمالک۔ مطبوعہ ایوان گورکھپور ۱۹۳۱ء

[2] نشتر عشق مخطوطہ پٹنہ لائبریری

[3] کلمات الشعرا، مکتبہ طاق بستان قلمی نسخہ

Marfat.com

اور عوام میں شفائی کو کوئی جانے بھی تو صائبؔ کی نسبت سے۔ والہ داغستانی کا بیان ہے کہ صائبؔ کو بچپن میں ایک اہل اللہ نے سریش کا ایک پیالہ بھر کر دیا تھا، صائبؔ نے دو حصہ آنکھ موندھ کر پی لیا، باقی ایک حصہ چھوڑ دیا۔ اسی واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"آں دلچسپی کہ در کلام مرزائے مرحوم است بہ سبب سریش ادلیا است والا ظاہر احوال مرزا مقتضی ایں نبود کہ آں ہمہ حقایق و معارف از دے صدور باید"[1]

اس میں شک نہیں کلیم کو بھی شاہجہاں نے کئی مرتبہ سونے سے تولا لیکن قدرافزائی درباری تملقات اور شاعرانہ پست خیالی کا نتیجہ تھی، قدسیؔ کی ساری کائنات اس کی ایک بے مثل نعت ہی، شفائی کی متاع عزت میں یہی بہت ہے کہ صائبؔ اس کا شاگرد تھا، الغرض مرزا صاحب کی یہ ساری کاد کاو تنقید تذکرہ و تاریخ سے نابلد ہونے کا نتیجہ ہے، اُنھوں نے فارسی شاعری پر جو غیر ماہرانہ تبصرہ کیا ہے اس نے ہمیں مرزا صاحب کی طرف سے بہت بدظن کر دیا اور طرہ یہ کہ باایں وقوف و مطالعہ وہ ہندوستان کے سارے فارسی شعرا کو بے مایہ و غیر مستند سمجھتے ہیں اور اس پہ اصرار کر رہے ہیں۔

---

[1] ریاض الشعرا قلمی نسخہ پٹنہ لائبریری

Marfat.com

آرہ کے دورِ ادبی کی ایک مختصر تاریخ

اور

جناب سیّد امیر حسن صاحب بدرؔ کے "خمخانہ" پر ایک طائرانہ نگاہ

جس خاک سے انسان پیدا ہوتا ہے اُس کی سرشارانہ محبت اور والہانہ پرستاری تاریخ نفسیات کا ایک مسلمہ واقعہ ہے جس کے تعارف کے لئے نہ کسی دقیقہ سنجی کی ضرورت ہے اور نہ کسی افسانہ تراشی کی، بشریت کے لئے یہ ضروری ہے؛ اور کسی انسانی نفس میں اس کا فقدان اس کی پستیٔ حوصلہ اور تنگیٔ ظرف کا ایک ایسا شکوہ حسرت اندوز ہے جو منطقیانہ استدلال و استنتاج کا منت کش نہیں نفسِ انسانی کی اس خصوصیت کو مدِ نظر رکھ کر حدیث شریف میں حبِ وطن کو "من الایمان" کہا گیا ہے۔ حبِ وطن کے متعلق تاریخ و سیر، ادبیات و سیاسیات میں کثرت سے واقعات ملتے ہیں، اسکی ہمہ گیری شعرا و ادبا ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ مجاہدین، اور مہاجرین (اسلام) کے سوانح حیات بھی اس لذت الم کے تذکروں سے خالی نہیں حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ شروع شروع مدینہ میں جب مسلمان ہجرت کر کے آئے تو حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت بلالؓ بخار میں

Marfat.com

مبتلا ہوئے جنابہ صدیقہؓ عیادت کے لئے تشریف لے گئیں، پوچھا ابا جان کیا حال ہے،
اے بلالؓ تمہاری کیسی طبیعت ہے، حضرت ابوبکرؓ بخار کی شدت میں مبتلا ہوتے تو یہ شعر پڑھتے

کلّ امریٔ مُصبّحٌ فی اھلہ — والموت ادنیٰ من شراك نعلہ

ہر شخص اپنے گھر میں صبح کرتا ہے — موت اُسکی جوتی کے تسمے سے نزدیک تر ہے

اور حضرت بلالؓ کا بخار اُتر جاتا تو وہ یہ اشعار پڑھتے :۔

الا یالیت شعری ھل ابیتن لیلۃً — بوادٍ و حولی اذخرٌ وجلیلُ

وَھَلْ آردن یومًا میاہ مُجنّۃٍ — وھل تبدُون لی شامۃٌ وطفیل

(ترجمہ) الٰہی مجھ کو کہ میں ایک رات کب ملے گی، جب میرے گرد اذخر اور جلیل (گھاس کی قسم) کا تختہ زار ہوگا۔ میں کب مجنہ پانی دیکھوں گا جو آب حیات ہے اور کب میری نظر شامہ اور طفیل (پہاڑیاں ہیں) پر پڑے گی :۔

مکتب کے فارسی پڑھنے والے بچے بھی حضرت شیخ سعدیؒ کے جذبات وطن پرستی سے آشنا ہیں جنھیں شیخ نے اپنے خاص ادبی رنگ میں گلستاں، بوستاں دونوں کتابوں کے اندر لکھا ہے، گلستاں کے دیباچہ کی پُرجوش دعائیہ ترانہ بھی کسے یاد نہیں۔

یارب ز بادِ فتنہ نگہدار خاک پارس را — چندانکہ خاک را بود و باد را بقا

اور بوستاں کے دیباچہ کے اندر طوفان بیخودی میں شیراز کو تمام عالم پر سند تفوق عطا ہی کر دیا :۔

در اقصائے عالم بگشتم بسے — بسر بردم ایام با ہر کسے

تمتع ز ہر گوشۂ یافتم — ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم

Marfat.com

اپنے اس سیاحانہ تجارب کے بعد فرماتے ہیں

چو پاکان شیراز خاکی نہاد نہ دیدم کہ رحمت بر اں خاک باد

خاقانی کا دفتر دیکھو اس میں بھی اس عنصر غیر فانی کی کارفرمائیاں نظر آرہی ہیں۔

مدینہ وہ مقام تھا جس کے لئے نبی صلعم نے دعا کی تھی۔

اللھم حبب الینا المدینۃ کحبنا مکۃ او اشد اللھم صححھا وبارک

لنا فی مدھا وصاعھا وانقل حماھا فاجعلھا بالجحفۃ

اے میرے اللہ، مدینہ کو ہم لوگوں کے لئے ایسا محبوب بنادے جیسا کہ ہے یا اس

سے بھی زیادہ اے اللہ اس کی آب وہوا ہم لوگوں کے موافق بنادے۔ اور

اس کے تول ناپ میں برکت عطا فرما، اور اس کا بخار جحفہ میں بھیج دے۔

مکہ فتح بھی ہوگیا پھر بھی آپ اپنے مقام ہجرت سے نہیں لوٹے۔ یہاں تک کہ آپ نے وہیں وفات بھی پائی صحابہ کرام کو یہ معلوم تھا۔ لیکن پھر بھی حب وطن کی کشش انہیں مکہ کی یاد دلاتی رہی، سعدی کا شیراز اور خاقانی کا شروان، خواہ اپنے دور کے قابل ناز بلاد اسلامیہ دمشق، قرطبہ، بغداد، اصفہان وغیرہ کے مقابل میں مرکز توجہ سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہوں لیکن اتنا تو معلوم ہو ہی گیا کہ وطنیت کے جوش میں انسان کیا کچھ نہیں کہہ جاتا، دنیا کی نکتہ چین نگاہیں خواہ اسے جس نظر سے چاہیں دیکھیں لیکن حب وطن کا ایک بااخلاص جذبہ باوجود کوشش کے بھی دل و جگر میں پنہاں نہیں رکھا جا سکتا۔

شعرا و ادبا آرہ کے ذوق شاعری کی تاریخ حضرت صفیر بلگرامی مرحوم سے

Marfat.com

شروع ہوتی ہے، آپ اپنے خاندانی لحاظ سے اپنے زمانہ کے بہت بڑے شاعر تھے، آپ کے تلامیذ میں مولوی محمد اسمٰعیل صاحب قہرؔ، مولوی سیّد امیر حسن صاحب بدرؔ، قاضی واجد حسین صاحب وجدؔ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، اور چونکہ یہ حضرات خاص ملکی محلہ (آرہ) کی خاک سے اُٹھے ہیں، اس لئے اثر وطن کے لحاظ سے اپنے دور کے بڑے باکمال شاعر ہوئے، جناب قہرؔ کو تو میں نے دیکھا نہیں، البتہ آپ کے بعض کارنامے میرے پیش نظر ہیں، جناب قہرؔ صرف ایک کہنہ مشق اور بلند پرواز شاعر ہی نہ تھے، بلکہ آپ نے ایک ایسا جدت طراز دماغ پایا تھا کہ اس میں لذت نظر، اور ذوق تماشا کے بہت سے سامان موجود تھے، آپ کا ایک باغ اب بھی موجود ہے، جو کبھی محمد شاہ رنگیلے کے طوفان نشاط کی یاد دلایا کرتا تھا، جناب قہرؔ کو شعر وسخن کے علاوہ طغرا بنانے میں بھی خاص کمال تھا، آپ کے ہاتھ کا طغرا میں نے دیکھا ہے جو ایک کاغذ پر قینچی سے تراش کر خط طغرا میں آیۃ الکرسی لکھا ہوا ہے۔

جناب قاضی واجد حسین صاحب وجدؔ اب دنیا میں نہیں آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں لیکن نہیں پاتیں آپ کی وفات کے ساتھ ملکی محلہ کے قدیم بزرگوں کی بہت سی زندہ تمثالیں مٹ گئیں وہ مجھے بہت محبوب تھے۔ یہ اس لئے نہیں کہ میں جناب وجدؔ مرحوم کے کمالات باطن اور اثرات قدس کا معترف ہوں بلکہ جناب وجدؔ نہ ایک عبادت گزار زاہد تھے نہ صوفی منش بزرگ لیکن پھر بھی میرے دل سے کوئی پوچھے وجدؔ کیا تھے؟ تو میں مرحوم کو یاد کر کے جامیؔ کا یہ شعر پڑھ دوں گا۔

Marfat.com

مرد فرما بہ خون اے دل چو در چشم نماند آبے
کہ خواہم امشب از ہجران یار خویشتن گریم

کسی زندہ شخص کی مدح گستری میں خواہ وہ کتنی ہی مخلصانہ پہلو کیوں نہ رکھتی ہو نفس کو صلہ احسنت و آفریں کی اُمید رہا کرتی ہے، وحید اب دنیا میں نہیں کہ اپنے دستور کے مطابق "اچھے ہونا بیٹا" کہہ کر دعائیں دیں گے لہٰذا آپ کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے جائیں تو دلچسپی سے خالی نہیں۔

جناب وحید ملکی محلہ (آرہ) کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے خاندان میں قاضی کا خطاب نسلاً بعد نسلٍ چلا آتا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے گھرانے کے بعض ارباب، سلاطین اسلام کے زمانہ میں عہدہ قضا پر مامور تھے، وحید مرحوم شعر و سخن، ذوق مجلس آرائی اور نشاط صحبت کا ایک خاص جذبہ رکھتے تھے، میں نے اُن کا عالم پیری دیکھا۔ لیکن اس وقت بھی اُن کی ذوق پسند طبیعت میں ایک ہیجان تھا وہ پیری اور ناتوانی میں بعض اوقات شباب کی یاد تازہ کر دیتے، طبیعت شاعری سے خاص مناسبت رکھتی تھی اُن کی جوانی تو میں نے دیکھی نہیں۔ لیکن قرائن بتاتے ہیں سید انشا مرحوم کی طرح جادۂ عیش و طرب کے رہرو ہونگے۔ ذوق سماع نہایت اعلیٰ پایا تھا۔ اور بعض آلات موسیقی بھی نوازا کرتے، وہ امیر غریب، اپنے بیگانے، اعلیٰ ادنیٰ سب سے یکساں ملا کرتے، آپ کی ملاقات اور قوت خطابت کا بالکل جداگانہ انداز تھا۔ لہجہ خطابت میں ایسی حلاوت تھی کہ مشکل سے کوئی دل غیر متاثر رہ سکتا تھا والد مرحوم کے زمانہ میں کبھی

Marfat.com

کبھی غریب کدہ پر قدم رنجہ فرمایا کرتے خاکسار سے کوئی برادری نہ تھی لیکن آپ کی نظر کرم اور آپ کی نگاہِ شفقت نوازِ ایک سحر تھی، جس نے آج مجھے مجبور کیا کہ میں جذبات کے طوفان میں جناب وجدؔ مرحوم کی تصویر پیش کروں۔

وجدؔ مرحوم کی بڑی صفت یہ تھی کہ وہ خاک نشینوں کو سر چڑھایا کرتے تھے، غرور و تکلف نام کو نہ تھا، ہمجولیوں میں بیٹھے تو ایک سنجیدہ بزرگ تھے، جوانوں میں بیٹھے تو انھیں کے مذاق کی سی باتیں، بچوں کی مجلس میں شرکت کی تو ترغیب و دلدہی کے ہزاروں ترانے سُنا دیئے، سچ پوچھئے تو اب مجلس مشاعرہ میں وجد کو دل ڈھونڈھتا ہے ایسے پُرجوش الفاظ میں داد دیتے کہ بچے اپنے دل میں ایک خاص سرور اور اُمنگ پاتے ایک مرتبہ کوئی لڑکا مجلس میں مرثیہ پڑھ رہا تھا جناب وجدؔ سامنے تشریف فرما تھے وہ دہرائے جاتے تھے، اتفاقاً ایک مصرعہ دُہرانے میں اس کے چند آخری الفاظ بھول گئے تو اضطراراً کہنے لگے، ”ہاں، وہی، وہی“ ہم لوگوں کو بے اختیار ہنسی آگئی مجھ سے جہاں ملاقات ہوتی بڑی محبت سے فرماتے، ”بیٹا شعر نہیں کہتے، شعر کہا کرو“، محلہ کے بچوں، منظر، محمود، امیرؔ سب میں انھیں نے شاعری کا ذوق پیدا کیا، بڑے بے تکلف تھے بچے بھی بڑے شوق سے بے جھجک ہو کر اصلاح کے لئے اپنا کلام لے جاتے، ابتداءً مجھے بھی شاعری کا خبط سوار ہوا تھا تو ایک مرتبہ اُنھوں نے مجھے بھی اصلاح دی تھی، وجد مرحوم بڑے نفس شناس بھی تھے، اُن کی اصلاح سے بچے کبھی برداشتہ خاطر نہ ہوتے شاعری میں اصلاح دینا نہایت اہم کام ہے، نفسیات کا ماہر نہ ہونے کے باعث اکثر

Marfat.com

اُستادوں نے اپنے لائق شاگردوں کو کھو دیا ہے۔

وجدؔ مرحوم سانولے رنگ کے متوسط القامت شخص تھے، چہرہ کتابی تھا زلفیں رکھا کرتے، داڑھی زنخداں پر گھنی تھی، اور رخسار پر ویسی نہ تھی، پُرانے وقت کے شرفا کی طرح بڑی مہری کا پائجامہ پہنا کرتے، جس میں اسی کپڑے کی ایک چوڑی مغزی ہوتی ہے۔ میں ڈھلی ڈال جوتا ہوتا عموماً قمیص یا کُرتے پر کوٹ پہنا کرتے، پیر کی تکلیف سے آہستہ آہستہ چلا کرتے، آپ کے صاحبزادہ جناب محمد خالد صاحب شمیمؔ ہیں، آپ کا کلام مجالس مشاعرہ میں میں نے سُنا ہے، اچھی طبیعت پائی ہے، لیکن وجدؔ کچھ اور ہی تھے۔ جس کی نظیر اب اس خاک سے غالباً صدیوں نہیں پیدا ہوسکتی، وجدؔ کی زندہ دلی، شیریں کلامی، حُسنِ اخلاق میری آنکھوں تلے گھوم رہا ہے، آخر عمر میں اُنھوں نے آرہؔ بصد حسرت خیر باد کہا، اور رتبیا کے مضافات میں وفات پائی، خدا بخشے اور ہمارے وطن کو توفیق دے کہ قاضی صاحب مرحوم کی طرح حُسنِ خلق کی کیفیات مخلصانہ اپنے قلوب میں پیدا کریں۔ جس کی سحر طرازی صرف اقربا ہی تک محدود نہ رہے، بلکہ اسلام کی شیرازہ بندی اپنے بیگانہ کے امتیازات سے بالاتر ہے۔

علامہ ابن خلکان نے فن سیرت میں وفیات الاعیان ایک ضخیم کتاب ہی لکھی ہے، جو کئی جلدوں میں ہے اس میں جتنے بڑے بڑے علما کا تذکرہ کیا ہے، ان میں ایک خاص بات یہ پائی جاتی ہے کہ وہ کسی ایک صنف علم پر دستگاہ نہیں رکھتے تھے، بلکہ متعدد علوم کے حامل ہوا کرتے، جو ایک دینی عالم ہوتا وہ ایک زبردست

Marfat.com

طبیب ہوتا وہ ایک فلسفی اور ایک شاعر، ایک ادیب اور ایک ماہر موسیقی بھی ہوا کرتا، ابن سینا، الفارابی، ابن زہر، ابن خلدون وغیرہ کے حالات زندگی میں یہی کلیہ نظر آتا ہے آرہ کے دور جدید کے لئے مولانا حکیم ضمیر الحق صاحب قیس کی زندگی بہت غنیمت ہے، آپ ایک بڑے عالم دین کے ساتھ ایک تجربہ کار طبیب بھی ہیں اور ایک کہنہ مشق شاعر بھی۔ آپ کا حلقہ مسترشدین گو چنداں وسیع نہیں چونکہ آپ ایک اہل حدیث عالم ہیں پھر بھی مغرب کے بعد آپ روزانہ قرآن وحدیث کا درس دیا کرتے ہیں چند روز خاکسار بھی اس حلقہ استرشاد میں شریک رہا ہے، مطب کی یہ شہرت ہے کہ دروازہ پر لوگوں کا ہجوم لگا رہتا ہے، آرہ کی خموش علمی زندگی کی یہ آخری شمع معلوم ہوتے ہیں خدا کرے آپ کا سایۂ نورانی ایک عرصہ تک رہے، خمخانہ کی تاریخ میں جو آپ نے اشعار کہے ہیں ان سے آپ کے ذوق شاعری اور بلند تخیل پر روشنی پڑتی ہے۔

سید ابن الحسن صاحب فکر (ایم۔ اے) کا علمی کمال اور آپ کی اثر آفریں سیرت ملکی محلہ کے لئے مایۂ ناز ہے آپ اگر اس وقت دور جدید کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں تو ساتھ ہی بزرگوں کے کمالات بھی آپ میں موجود ہیں۔ آپ کی زندگی تفصیل کی محتاج ہے، اسلئے اس وقت مفصل نہیں لکھوں گا، مگر اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جناب فکر آرہ کی طرف سے دور جدید کے بڑے شعرا جناب اصغر و جگر کے مقابلہ میں پیش کئے جا سکتے ہیں، جناب فکر صرف یہی نہیں کہ ایک نازک خیال شاعر، اور نکتہ سنج سخن آفریں ہیں بلکہ آپ کو انشا پردازی میں بھی خاص کمال ہے، آپ حال میں دفتر "سادات" کے حلقہ ادارہ کو اپنے علمی کمالات

Marfat.com

سے فیض پہونچا رہے تھے۔ نہایت شگفتہ صورت، عشرت پسند اور با اخلاق انسان ہیں مشاعرہ میں جب غزلیں پڑھتے ہیں تو ایک خاص اداسے جس سے سامعین پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

جناب بدرؔ کے مختصر حالات زندگی آپ کا اصل نام امیر حسن تخلص بدرؔ والد کا نام سید محمد ہاشم ملکی محلہ (آرہ) کے ایک معزز سید خاندان میں پیدا ہوئے، یہیں تعلیم و تربیت پائی سید صفیرؔ بلگرامی کے تلامیذ ارشد میں ہیں۔ آپ ہی سے کلام میں اصلاح لی، فارسی کے زبردست عالم اور ایک حد تک عربی سے بھی واقفیت ہیں آرہ میں ایک انگریزی درسگاہ کے اندر فارسی کے مدرس اعلیٰ ہیں، متوسط قامت، گورا رنگ، سفید گرد دار ڈاڑھی، شیخ علی حزیںؔ جیسے نازک مزاج لیکن درد دل سے خالی نہیں متدین، صوفی منش، ذکر و شغل سے لذت آشنا، اس وقت عمر پچپن کے لگ بھگ ہوگی۔

محاسن کلام مختلف شعرا کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک بصیر کلام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ایک تو وہ جس میں ایک شاعر مناسبت اور لطافت بیان، نزاکت تخیل، حلاوت معنی، پرواز فکر رعایت لفظی، مجاز اور تشبیہات سے کام لیکر کچھ خیال ظاہر کرتا ہے۔ دوسرا وہ جو صحیفۂ فطرت کا ایک رمز شناس انسانی جذبات اور احساسات کا مطالعہ کرنے کے بعد "پیام" کی صورت میں پیش کرتا ہے، یورپ کی شاعری اور قدیم عربوں کا کلام اس طریق کی پیداوار ہے۔ ایک یوروپی شاعر جس طرح قوم کو اخلاقی اد

Marfat.com

سیاسی اصلاحات کا پیام دیتا ہے؛ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ورڈ سورتھ اور گوئٹے کے صوفیانہ خیالات ملٹن کی سیاسی اور اصلاحی نظمیں عربوں کے پُرجوش رجزیہ اشعار پڑھنے کے بعد انسان اسی نتیجہ پر پہونچتا ہے۔ لیکن اُردو شاعری پر فارسی کا غلبہ تھا اس لئے اہل فارس کے اسی طرز کو جس میں پیام کی بجائے نزاکت خیال اور رعایت الفاظ سے کام لیا جاتا ہے، بہت سے اُردو شعرانے بھی اختیار کیا، چنانچہ میرؔ اور سوداؔ کے کلام میں یہی فرق ہے۔ میر کی شاعری پیام سے متعلق ہے، سوداؔ کی شاعری حلاوت بیان اور رعایت الفاظ سے جناب بدر مدظلہ، کے کلام میں جذبات و پیام کی روح سے زیادہ تشبیہات و مجازیات۔ لطائف وظرائف، برجستگی ادا اور حلاوت بیان پائی جاتی ہے

کلام پر متقدمین کا اثر سرسری طور پر مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالنا بہت مشکل ہے کہ آپ کے کلام پر شعرائے متقدمین میں سے کون کون شاعر کے کلام کا اثر پڑا ہے۔ لیکن یہ قطعی ہے کہ فارسی شعرا میں حافظؔ اور اردو میں ناسخؔ سے آپ کو بہت عقیدت ہے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

رنگ نظمِ حضرتِ ناسخؔ مری اُردو میں ہے ۔۔۔ بدرؔ نافہموں کو اس کا لطف مل سکتا نہیں

ظاہر ہے کہ ناسخ کے کلام میں جرأت کی سی رنگینی نہیں، مگر ناسخ کی شاعری رموز و نکات کی شاعری ہے، اصول کی نگہداشت اور قواعد کی پابندی نے کلام میں وہ دلچسپی نہیں ہونے دی لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ بدر کی نگاہ کس قدر رمز شناس اور آپ کا دماغ کس قدر دقیقہ سنج واقع ہوا ہے، حافظؔ کا کلام بھی آپ کے زیر مطالعہ رہا ہے

Marfat.com

لیکن آخری دور میں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

بدرمست بادۂ شیراز رہتا ہوں مُدام — اب نہیں رہتی بیاضِ نظم اُردو زیر سر

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

مصحفِ رُخسار جاناں کی زیارت ہو گی بدر — رات کو سویا ہوں میں حافظ کا دیوان دیکھ کر

جناب بدرؔ کو حافظ کا دیوان دیکھنے کے بعد رات کو ,,مصحف رخسار جاناں،، کی زیارت ہوئی یا نہیں اس کی تو خبر نہیں، لیکن حافظ کے رموز میکشی اور تجربات بادہ پیائی آپ کے خیالات میں ایک حد تک منتقل ہو گئے جو آپ کی ایک انتہائی پر جوش غزل ,,موج مے،، کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہیں، ,,خمخانہ،، میں ایسے اشعار بھی ہیں جو حزیںؔ، عرفیؔ، سلمان ساوجیؔ رومیؔ وغیرہ کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں لہذا اس توارد خاطر، مناسبت فکر، نازک خیالی اور کمال پر جناب بدرؔ کے لئے قلب میں احترام کا ایک غیر فانی احساس پیدا ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

داغ دلِ فرہاد ہوا ے غیرتِ شیریں (بدر) جس گل پہ ہو لالہ کا گماں کوہ کے اوپر

فارسی اور اُردو شعرا میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کے یہاں اس مضمون کا شعر نہ ملے حزیںؔ کہتے ہیں۔

بدشت از جلوہ ہائے لالہ داغم تازہ میگردد — کہ یاد از سینہ ہائے دردمنداں میدہد مارا

اس کے قبل صائبؔ نے یوں کہا تھا۔

یادگارِ جگر سوختہ مجنون است — لالہ چند کہ از دامن صحرا برخاست

Marfat.com

صائبؔ سے پہلے جامیؔ کہہ گئے ہیں۔

بسکہ رفتند شہیدانِ غمت زیرِ زمیں لالہ با غرقہ بہ خوں می دمد آں صحرا را

جامیؔ سے پہلے حافظؔ نے کہا تھا۔

ز حسرتِ لبِ شیریں ہنوز مے بینم کہ لالہ می دمد از خاکِ تربتِ فرہاد

متقدمین میں صائبؔ کے خیال سے جناب بدرؔ کا خیال بالکل ملتا ہوا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا ترجمہ ہوا ایسا توارد خاطر، اور تمثیل بیان دورِ جدید میں ایک اردو کے شاعر کے یہاں پایا جانا قابلِ فخر ہے:

کبھی میں دیر میں پہونچا کبھی حرم میں گیا (بدر) تمہارے در پہ میں آیا کہاں کہاں ہو کر

اے بیخبراں بائے طلب بخہ مسازید (حزیں) نزدیک تر از ماست زما مرحلۂ ما

مائیہ دیریم عرفیؔ عشوۂ در کعبہ نیز (عرفی) مدتے پار بجہا از پردہ می انگیختیم

نتیجہ کے اعتبار سے تینوں اشعار میں ایک ہی خیال پایا جاتا ہے، جناب بدرؔ کو اعتراف ہے، کہ دردِ محبوب تھا تو پہلو میں لیکن مفت میں تمام زمانہ کی خاک چھان ڈالی، حزیںؔ فرماتے ہیں کہ ہماری منزل ہماری ہستی سے بھی قریب ہے، اس لئے بادیہ پیمائی کی حاجت نہیں عرفیؔ کا شعر تو جناب بدرؔ سے بالکل مل گیا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فارسی نے اردو کا جامہ پہن لیا ہے، جناب بدرؔ کے لئے دل سے بے اختیار داد نکلتی ہے عرفیؔ جیسے قادر الکلام شاعر کے خیال سے آپ کا کلام مل جاتا ہے۔

دلِ پُر داغ عاشق ہو کے رنگین جاناں میں (بدر) تماشہ ہو گلِ لالہ کھلا ہے شاخ مرجاں میں

Marfat.com

(حزیں) زناراج بہاراں مست ورنگیں جلوہ می آئی
حنا نبود کہ جوشاں خون گلزار است از دستت

محبوب کے دستِ حنائی کو دیکھ کر دونوں نے حکم لگایا ہے کہ یہ رنگ حنا نہیں ہے، بلکہ خون ہے، جناب بدرؔ نے اسے "دلِ پُر داغِ عاشق" بتایا ہے، حزیںؔ نے "خون گلزار" سے تعبیر کیا ہے۔

مر کے بھی وابستگی دامانِ جاناں سے رہی (بدر) خاک ہو جانے پہ بھی میں خاک دامنگیر ہوں
تنہا نہ منم خاکت کز خاک سر کویت (سلمان ساوجی) ہر گرد کہ برخیزد صاحب نظرے باشد

مضمون میں کسی قدر اختلاف ضرور ہے، لیکن اصولی حیثیت سے دونوں کے یہاں ایک ہی خیال پایا جاتا ہے جناب بدرؔ فرماتے ہیں کہ مرٹنے کے بعد بھی خاک بن کر دامن یار سے لپٹا ہوں، سلمان ساوجی کہتے ہیں، کہ محبوب کے در پہ میں ہی خاک نہیں ہوا ہوں بلکہ یہاں سے جو ذرہ اٹھتا ہے وہ کسی عاشق کی نگاہ کا ایک جزو ہے، یعنی اس قدر کثرت سے عشاق نے جان دی ہے، کوئے جاناں میں خاک ہونے اور فنا ہونے کے بعد بھی "محو دید" اور "دامنگیر" ہونے میں دونوں برابر ہیں،

شمع ایمن کی تجلی ہے لحد کے اندر (بدر) جلوہ گر ہے جو سرِ گورِ غریباں کوئی
تجلی زار می بینم سرِ گورِ غریباں را (حزیں) مگر شمعے بہ طوف مشہدِ پروانہ می آید

جناب بدرؔ کے یہاں حزیںؔ سے بھی بڑھا ہوا استعارہ ہے۔ حزیںؔ نے تو اس تجلی زار بنانے والے محبوب کو شمع اور جناب بدرؔ نے اسے "کوئی" کہہ کے اس تجلی کو موسے

Marfat.com

کے وادی ایمن اور بقعہ مبارکہ کی تجلی بنا دی قرار دے انکار نہیں ہو سکتا۔

چمن زار جہاں میں طائر سدرہ نشیں ہوں (بدر) میں کھا سکتا نہیں ہرگز فریب دام اور دانہ

تو مرغِ عالمِ قدسی ندیمِ مجلسِ انسی (رومی) دریغ باشد اگر تو دریں مقام بمانی

کسی قدر اختلاف کے ساتھ ایک خیال ہے۔

نہیں کم حرص ہوتی ہی سبو و شیشۂ مے کی (بدر) ڈبو دے خم میں ساقی آج بدر بادہ پیما کو

لب مخمور مرا جرعہ نہ بندد ساقی (حزیں) چوں رسد دور بمن میکدہ بردار بیار

دونوں کے یہاں ایک ہی جذبۂ مے آشامی ہے۔ اور ایک ہی ہوس بادہ پیمائی ہو

یہاں تک جستجو کی جھک گئی اپنی کمر آخر (بدر) دیا نا تھا نہ پایا آج تک عمر گریزاں کو

تا وادی شیبم ز کجا سر بدر آرد (حزیں) طے کردہ ام از کوچہ تن پیچ و خمے چند

بہت عمدہ توارد خاطر ہے، کسی قدر اختلاف ضرور ہے۔ لیکن صحیفہ فطرت کے درس عبرت نے دونوں نے یکساں نتائج پیدا کئے ہیں جناب بدر فرماتے ہیں عمر گریزاں کو ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے کمر جھک گئی بوڑھے ہو گئے۔ لیکن نہ پا سکے۔ حزیں فرماتے ہیں کہ اس خوف سے کہ نہ معلوم کہاں پیری و ناتوانی کا وادی پُر خطر نظر آئے۔ میں نے پیچدار کوچہ سے گزرنا شروع کیا۔ اور یہ جھکی ہوئی کمر گویا وہی "کوچہ تن" کے "پیچ و خمے چند" کی طے منزل ہے، استنباط نتیجہ میں دونوں برابر ہیں۔

لائے مے سے شیخ صاحب کی مرمت کیجئے (بدر) کہنہ یہ دیوار ہے ٹیڑھی بے کہگل نہیں

خمیر مایہ آسائشیست لائے شراب (عرفی) بگو کہ صاف کشان جرعہ زتہ گیرند

Marfat.com

بظاہر مضمون مختلف معلوم ہوتا ہے، لیکن "ڈوڈوبے" کی تاثیر بیان کرنے میں دونوں

برابر ہیں۔ جناب بدرؔ کے یہاں مجازی رنگ گو بھدا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن پُر لطف ضرور ہے

جناب موصوف نے شیخ صاحب کی اچھی مرمت کی ہے عرفیؔ نے سادہ سادہ الفاظ میں

"لائے شراب" کی خوبی بیان کر دی ہے، توارد خاطر سے انکار نہیں ہوسکتا

(بدر) مرا گھُٹ گھُٹ کے یہ عشق لب لعلین جاناں میں

مری قسمت مجھے لے ڈوبی آخر آب حیواں میں

ز بس حرف و صورت خضر مہاز جابر می آرد (حزیں) کہ آب زندگی لعل تر از یر نگیں باشد

لب لعلین جاناں کو آب حیواں سے تعبیر کرنے میں دونوں برابر ہیں البتہ اسلوب بیان

جُدا گانہ ہے۔ جناب بدر نے اس خیال پر ایک مزید اضافہ یہ کیا ہے کہ انھوں نے اپنی

ہستی کو اس آب حیواں میں غرق بھی کر دیا، لفظ "گھُٹ گھُٹ" کے اضافہ سے خیال میں اور

بھی نزاکت پیدا ہو گئی ہے۔ محبوب کے لب لعلین میں چشمہ آب حیواں کی طرح ظاہری سیلانی

آب تو ہے نہیں کہ طالب ایک مرتبہ غرق ہو جائے بلکہ وہ گھُٹ گھُٹ کر جان دے رہا ہے

ترا رُدئے عرق آلود اے گُل دیکھ کو کھُلی (بدر) پڑی شبنم کے قطرے ہیں جبین صحن گلشن پر

آلودہ قطرات عرق دیکھ جبیں کو (سودا) اختر پڑے جھانکے ہیں فلک پر سے زمیں کو

جبین معشوق کو عرق آلودہ دیکھ کر دونوں نے اپنی اپنی وسعت فکر اور پرواز خیال

کے مطابق دو مثالیں دی ہیں سوداؔ کا شعر بڑھا ہوا ضرور ہے، لیکن جناب بدرؔ نے بھی

ایک لطیف خیال کا اظہار کیا ہے۔ توارد سے انکار نہیں ہوسکتا۔ اسی معنی میں لیکن بہت

Marfat.com

موزیں کا یہ شعر ہے۔

نگاہ گرم ہوں رخسار نازنیں ،بوسہ عرق چو شبنم گستاخ یاسمیں تو بوسہ

حشر برپا ہے تری محشر خرامی سے ابھی (بدر) اور کیا ہوگی قیامت جسکا میں قائل نہیں

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے (غالب) کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

مفصلہ بالا موازنہ سے یہ بات ایک حد تک ثابت ہوگئی ہے کہ جناب بدر ہمارے دور میں اُردو کے ایک نازک خیال اور کامل الفن شاعر ہیں۔ جن کے خیالات فارسی کے بہترے اساتذہ سے مل جاتے ہیں۔

جذبات بدر

اس میں شک نہیں کہ جناب بدر کے یہاں سودا کی طرح شگفتگی بیان رعایت الفاظ اور خوبی زبان ہے۔ غالب اور میر کی طرح پیام کی شاعری نہیں، لیکن ایسا نہیں کہ آپنے اس رنگ میں کچھ کہا ہی نہیں۔ جس غزل میں آپ نے ادائیگی جذبات کی کوشش کی ہے، وہ اس قدر بلند سطح پر پہونچ گئی ہے کہ معمولی الفاظ میں آپ کی لطافت احساس اور باریکی نظر کی تعریف نہیں ہوسکتی:

اجل کا ہوں نہ شرمندہ نہ ممنون مسیحا ہوں شب تنہائی فرقت میں میں مر مر کے جیتا ہوں

دفور بیخودی میں بھی میں وہ محو تجلی ہوں کہ بنکر آئینہ ہر وقت منہ اُس بت کا تکتا ہوں

دفور بیخودی سی چپ بیٹھ منہ اک کا تکتا ہوں سراپا محو انداز بت آئینہ سیا ہوں

قیامت چھیڑنا میرا ہے لے باد سحر گاہی کسی محشر خرام شوخ کا نقش کف پا ہوں

تری چشم غزالی کا ہے سودا سر میں جب دن سی پریشاں صورت گرد رم آہوئے صحرا ہوں

Marfat.com

نہ پوچھو صورتِ غربال ہے کیوں دل جگر میرا — کسی تیرِ نگاہِ سحر ساماں کا نشانہ ہوں

میں وہ ہوں آرزو دل بھی خبر رکھتا نہیں جس کی — نہیں گوش آشنا جس سے میں وہ حرفِ تمنا ہوں

فارسی ترکیب نازک خیالات دلکش فقرے اُبھرے جذبات سبھوں نے مل کر کلام کو اس بلند سطح پر پہونچا دیا ہے جو میر اور غالب کے تخیلات کا مخصوص نشیمن ہے ۔

یہ جوشِ شوقِ عریانی یہ ضعفِ پنجۂ وحشت — رگِ گردن خفا ہے حلقۂ تنگِ گریباں میں

سلامت دستِ وحشت ہو اگر ای شوقِ عریانی — نہیں ممکن کبھی پیوند داماں و گریباں میں

خمریاتِ بدر

عربی شعرا میں اخطل، فارسی میں حافظ اور خیام نے جس حسنِ ادا سے شراب کی تعریف کی ہے، وہ اُن کا مخصوص حصہ ہے، اُردو میں مرزا غالب نے اس صنفِ سخن کو بہت ترقی دی اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ حافظ اور خیام کی طرح غالب بھی بادہ نوشی کے عادی تھے، نشہ میں انسان کا طائرِ خیال سدرہ نشین ہوجاتا ہے، اور اس وقت زبان سے ایسے ایسے رموزِ ہستی کا انکشاف ہونے لگتا ہے کہ ایک ناقدِ مطالعہ کرنے کے بعد مجبور ہوجاتا ہے کہ ان خیالات کو ملہماتِ صوفیانہ کی طرف منسوب کر دے، جنابِ بدر کے "خمخانہ" میں اگر "موجِ مے" نہ ہوتا تو یقیناً نام کا عدمِ مناسبت ناظر کو افسردہ بنا دیتا، حافظ اور غالب کے نکاتِ بادہ پیمائی اپنی جگہ بے نظیر ہیں لیکن بدر نے جس لطیف اسلوبِ بیان جس دلکش حسنِ ادا، اور پُرجوش ترنمِ جذبات میں خمریات پر طبع آزمائی کی ہے اس کی نظیر کم از کم میری نظر سے نہیں گزری یہی نہیں کہ میں نے ایسے خیالات اساتذۂ اردو کے کلام میں نہیں دیکھے، بلکہ ایسی ولولہ انگیز ترانہ سنجیاں شعرائے فارس کے کلام میں بھی نہیں

Marfat.com

پائی جاتیں، جناب شفق عماد پوری نے طبع دیوان «خمخانہ» کی تاریخ میں جو اشعار کہتے ہیں ان میں ایک جگہ جناب بدر کی اس غزل کی طرف اشارہ کیا ہے، فرماتے ہیں۔

اس کی ہر ہر بیت ہے گویا بیانِ "موج مے" کیوں نہ ہو پھر ترجمانِ میکشاں دیوانِ بدر

ملاحظہ ہو ؎

گاہ خم میں گہ سبو میں شیشہ و ساغر میں گہ منزلیں طے کر رہا ہے کاروانِ موجِ مے

کس لطف سے مجلس بادہ نوشی کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔

آسماں خم، مے شفق، ساغر مہ و خورشید ہیں کہکشاں پر مجھ کو ہوتا ہے گمان موجِ مے

نفسیات کا مسئلہ ہے کہ انسان کے نفس پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے، وہی اسے کائنات کے ہر ذرہ میں نمایاں معلوم ہوتی ہے، عرفی فرماتے ہیں۔

عرفی ببیں فسردگی گشت ماہتاب امشب کہ در بغل ننہادیم شیشہ را

جناب بدر کے کلام میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے، فرق یہ ہے کہ عرفی کو آج کی رات شراب نہ ملی اس لئے وہ چاندنی میں بھی افسردگی محسوس کر رہے ہیں، جناب بدر کی بیتابی جذبات کا کیا کہنا، آپ اس قدر سرشار ہیں کہ پورا آسمان ہی آپ کو میکدہ نظر آتا ہے، غضب کا زور بیان ہے، ولولہ قابل ستائش ہے، اس رنگ میں غالب نے بھی کہا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

چار موج اُٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا موجِ شراب

غالب نے اپنی لذت اندوزی طرب کو صرف آسمان ہی تک محدود نہیں رکھا

Marfat.com

بلکہ تمام کائنات میں آپ کو ایک روح نشاط نظر آرہی ہے جناب بدر کی تشبیہات قابل داد ہیں۔

بوسے کیا کیا میں لب ساغر کے لیتا جھوم کر
لب بہ لب مجھ سے اگر ہوتی زبان موج مے

انداز شوق اور مستی ہر لفظ سے ٹپک رہی ہے، معلوم ہوتا ہے جناب بدر کے سامنے "موج مے" کا وہی سماں ہے جیسے ایک دیوانۂ شباب کے سامنے "عروس شب اوّل" کا جلوۂ بیتاب۔

پھول نرگس کے کھلے ہیں چشمۂ خورشید میں
عکس چشم مست ساقی ہے میان موج مے

غضب کی تشبیہ ہے، تخیّل کی پرواز قابل داد ہے، شراب سے بھرا ہوا پیالہ ہے، ساقی "بانگ نوشا نوش" دے رہا ہے۔ اور اس کی آنکھوں کا عکس شراب میں موجود ہے، جناب بدر اُسے پیالۂ شراب میں ساقی کی آنکھیں نہیں بتاتے، بلکہ چشمۂ خورشید میں گُلِ نرگس پھولا ہوا بتاتے ہیں۔

اسی معنی میں حضرت جامی نے بھی فرمایا ہے ؎

شد در قدح صہبا عکسے ز رخت پیدا
قد اشرقت الدنیا من کاس حمیرانا

کشتیٔ مے پر لگا جب بادبان موج مے
اُڑ کی رندوں کو ساقی کیا ہوا برسات کی

برسات کا موسم ہے دور پر دور چل رہا ہے، گویا شراب ایک کشتی ہے جس پر "موج مے" یعنی "من قدح نوش و مغان بانگ زنان نوشا نوش" کا بادبان ہے کشتی کو تیز چلنے کے لئے ایک کپڑا لگا دیتے ہیں اسی کو بادبان کہتے ہیں، اب رندوں کی

Marfat.com

پرداز کا کیا کہنا غالب کہتے ہیں۔

پوچھ مت وجہ سیہ مستی اربابِ چمن — سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

بزمِ جاناں صحنِ گلشن، میکدہ رندوں کا گھر — طول سے ہے طول سیرِ کاروانِ موجِ م

کہاں کہاں شراب نوشی ہوتی ہے، جناب بدر اس کی ترجمانی فرماتے ہیں۔

آپ کی اس غزل میں ستر اسی اشعار پائے جاتے ہیں، اور ہر شعر لطف و جذبات

کا ترجمان ہے۔

جناب بدر کے محاسن افکار ملاحظہ ہوں۔

رعایت لفظی

ہماری خاک کی پامال کس خورشید طلعت نے — کہ ہر ذرہ ہے تاباں اختر چرخ بریں ہو ک

چڑھایا سر تو ہے تم نے مگر اک دن ستائیں گے — یہ کالے کالے موئے زلف مار آستیں

کس درجہ طول ہے شب تارِ فراقِ یار — شاید ہے اُس کو زلف شکن در شکن سے

شوخی کلام

کبھی تو حضرتِ واعظ اُٹھاؤ لطفِ بہشت — شریکِ صحبت یارانِ میکشاں ہو ک

مہِ صیام میں یہ اعتکاف اور روزے — خدا کے گھر میں رہوں بھوکا میہماں ہو

Marfat.com

مجاز و تشبیہات

ہے خیال صید مرغ دل بوقت خواب بھی — وہ بچھا کر سو رہے ہیں دام گیسو زیر سر

تبسم زیر لب ہے زلف بکھری ہی جو عارض پہ — گھٹا چھائی حلب پر بجلیاں کوندیں بدخشاں میں

سلاست بیان

تم پہ میں مر رہا ہوں مرنے دو — کام کرنے کا ہے یہ کرنے دو

اُن کو اے ہم نشیں سنورنے دو — کوئی مرتا جو ہے تو مرنے دو

ناروا ظلم اُن کو کرنے دو — خون ناحق میں ہاتھ بھرنے دو

خون بولے گا سر پہ چڑھ کے وہاں — قتل کر کے یہاں مکرنے دو

چھینٹے کوثر کے داغ پہ دینا — ابھی شیشہ میں تو اترنے دو

مذہبی جذبات

دکھلا دے مدینہ مجھے مولائے مدینہ — مضطر ہوں بہت لے شہ والائے مدینہ

میں شیفتہ چشم کمل کا نبی کی — آنکھیں ہیں مری نرگس شہلائے مدینہ

دکھلائے اگر زور نظر چشم تصور — آجائے نظر گنبد خضرائے مدینہ

فردوس میں مرتے ہی جو داخل ہوں عجب کیا — دل میں دم رحلت ہے تمنائے مدینہ

مژگاں کی طرح آنکھوں پہ پنپی میں جگہ دوں — ہاتھ آئیں جو خار رہ صحرائے مدینہ

وارفتہ گیسوئے رسول عربی ہوں — ہو سر میں ازل سے مرے سودائے مدینہ

Marfat.com

میں طوف کروں روضۂ اقدس کا بصد شوق
بلوائے مجھے لے مرے مولائے مدینہ

تڑپائیگی جنت میں مجھے صورتِ بسمل
نکلی نہ اگر دل سے تمنائے مدینہ

روشن ہوئی اے بدر مری چشم بصیرت
سرمہ ہوئی خاکِ رہ صحرائے مدینہ

تلمیح

شرف حاصل ہوا جب ہم سخن ہونیکا موسیٰ کو
بڑھا دی پرسشِ حالِ عصا پر گفتگو کتنی

یہ قرآن کی آیت کی طرف اشارہ ہے اللہ تعالیٰ نے تو صرف اتنا ہی خطاب کیا تھا وَمَا تلك بیمینك یاموسیٰ (اے موسیٰ! تمہارے ہاتھ میں یہ کیا ہے؟) اس پر حضرت موسیٰ فرماتے ہیں ھی عصای یہ میری لاٹھی ہے۔ لیکن یہیں تک کہہ کے چپ نہ رہے بلکہ فرمانے لگے اتوکؤا علیھا واھش بھا علی غنمی ولی فیھا مآرب اخریٰ (میں اس پر سہارا لگاتا ہوں، اور اس سے اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں اور اس سے اور بھی کام لیتا ہوں)

تاریخ و اساطیر

Marfat.com

عہد ظفر کے تاریخی و سیاسی حالات

ملتوں کے بننے بگڑنے میں، قوموں کے عروج و زوال میں، قدما کے شاندار اور پُر جلال طرز تمدن میں، ان کے دلکش اور دلفریب اصول تہذیب میں، ان کے اختلال مملکت، اور اضمحلال قیادت میں ایک محو نظارہ کے لئے جو سامان بصیرت نظر آتا ہے اہل نظر سے مخفی نہیں، مطالعہ فطرت کے یہ تاثرات انسان کے ذوق ادب میں کارفرما نظر آتے ہیں۔ تاریخ، آثار، تصوف، شاعری اسی انقلاب ہستی کی مختلف علمی تعبیرات ہیں ایک مورخ اٹھا، اس نے قوم میں جذبات عمل، اور شورش اقتدار پیدا کردی، ان کی تعمیر عادات، ان کی تنظیم جماعت ان کی سیاست مدن، الغرض ان کے تمام شعبات معاشرت کے لئے کاشانۂ ہستی اور طلسم وجود سے منتشر واقعات چن کر، اثر آفرینی کا ایک ایسا مادہ جمع کر دیا جسے آج "تاریخ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اسی طرح ہیئت اجتماعیہ کے بعض افراد نے اس ہنگامۂ عمل کے آخری نتیجہ پر غور کیا، انھوں نے مصر کے قدیم آثار، یونان اور روما کے مٹے ہوئے تمدن، فارس اور عرب کی قومی یادگار، ہندوستان اور چین کے دفائن ارضی کا پُر حسرت نظارہ کیا، ان کے قلوب پر ہنگامۂ ترقی، تمنائے حکومت، اور ان کے وجدان میں احساسات مادہ نوازی اور طلب جاہ کی بجائے

Marfat.com

دوسری کیفیات پیدا ہوئیں جنھیں مبادی تصوف اور لوازم شاعری سے تعبیر کر سکتے ہیں، آثار قدیمہ کا یہی عبرت آموز نظارہ تھا جس نے گوتم اور ادھم سے تخت چھڑایا، جس نے رومی اور سنائی پیدا کئے، جس نے ڈینٹے اور ایمرسن کی گفتار میں خلش پیدا کی، اسمیں شک نہیں کہ شعرا کی زندگی کا ابتدائی زینہ اکثر اس مطالعہ کے اوّلین حصہ سے متعلق رہا ہے، لیکن شاعری جب "فاراہ الآیۃ الکبریٰ"، اور "بنطش البطشۃ الکبریٰ" کے مناظر سے متحسس ہوئی تو احساسات نے کروٹ لی، اور ذوق کا دوسرا مرکز مقرر ہوا تاریخ بتاتی ہے، شعر وسخن کا آخری نتیجہ ذوق تصوف ہے اور یہ کلیہ ہم رومی اور عطار کی حلاوت زندگی، خاقانی اور خسرو کے رشحات درد، نظیری اور ظہوری کے ترک تلذذ میں پاتے ہیں، مشاہدات زندگی، اور تجارب انقلاب کی اسی منزل پر پہنچکر رومی نے کہا ہے

دیدیم کہ بر کنگرہ اش فاختہ   بنشستہ ہمی گفت کہ کو، کو، کو

دہر کی اس پُر ملال بوقلمونی، اور دایۂ فطرت کی اس ستم ظریفی سے قلوب پر جو اثر پڑتا تھا، وہ صوفی ادبیات، یا زوال دولت کی تاریخی موشگافیوں، اور کھنڈر اور آثر کی دلکش نقش آرائیوں میں ملے گا، جن کا کافی ذخیرہ گبن کی درد انگیز سحر کاری، اور خاقانی کے نگار خانہ بیان میں پایا جاتا ہے۔ خاقانی مداین کے سر بفلک عمارات کے کھنڈروں میں پہونچتا ہے۔ عہد اکاسرہ کی مٹی ہوئی عظمت ان کا جاہ وجلال، ان کی شان وشکوہ، ان کا رعب و دبدبہ اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، وہ عہد ماضی کے اس دور سطوت وحکمرانی کا ایک نہایت دلفریب نقشہ پیش کرتا ہے اور اس کے بعد

Marfat.com

اس وحشت آباد مقام، اور درد پیدا کرنے والے ویرانہ کے نقوش دکھاتا ہے دفعتہً قلب میں ہیجان پیدا ہونے لگتا ہے، دل میں ٹیس اٹھتی ہے، اور بے اختیار تیرہ سو سال پیشتر کے ایک انسان کے الہامی جذبات کی تصویر نظر کے سامنے کھنچ جاتی ہے وکم اھلکنا قبلھم من قرنٍ ھم احسن اثاثاً ورءیاً ۔ قل من کان فی الضلالۃ فلیمدد لہ الرحمٰن مدا حتی اذا راوا ما یوعدون اما العذاب واما الساعۃ فسیعلمون من ھو شرٌ مکاناً واضعف جنداً[۱] (اور ہم نے ان سے پہلے ایسے لوگ ہلاک کئے، جو سامان اور نمود میں ان سے بھی اچھے تھے، آپ فرما دیجئے جو لوگ گمراہی میں ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ڈھیل دیتا چلا جا رہا ہے، یہاں تک کہ جس چیز کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے اس کو دیکھ لیں گے خواہ عذاب کو خواہ قیامت کو، سو ان کو معلوم ہو جاوے گا کہ برا مکان کس کا ہے اور کمزور مددگار کس کے ہیں۔)

خاقانی نے مدائن کے کھنڈر کی جو تصویر کھینچی ہے، وہ گویا قرآن کے اسی آیت کی شرح ہے، فرماتے ہیں[۲]۔

ہاں اے دلِ عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں	ایوان مدائن را آئینۂ عبرت داں
یک رہ ز لب دجلہ منزل بہ مدائن کن	از دیدہ دوم دجلہ بر خاک مدائن راں

---

[۱] قرآن مجید میں اکثر اس مضمون کی آیتیں پائی جاتی ہیں، زخرف، قصص، احقاف، ق وغیرہ میں یہ اشارے موجود ہیں۔

[۲] خاقانی کا یہ قصیدہ اس قدر مشہور ہے کہ ایک انگریز مستشرق نے اس کا ترجمہ مع شرح شائع کیا۔

Marfat.com

خود دجلہ چناں گریہ صد دجلۂ خوں گوئی ... کز گرمی خوں نابش آتش چکد از مژگاں
بینی کہ لب دجلہ کف چوں بدہان آرد ... گوئی ز تف آہش لب آبلہ زد چنداں

شاعر دریائے دجلہ کے کنارے کھڑا ہے، اُس کے ایک طرف عہد اکاسرہ کی یادگاروں کا سلسلہ ہے، اُسے دیکھ کر شاعر کے دل میں ایک التہاب درد پیدا ہوتا ہے ایک شعلۂ الم بھڑک اُٹھتا ہے، اُسے اپنے تمام جذبات لطیف خود دریائے دجلہ میں نظر آنے لگتے ہیں، وہ دجلہ کے تموج اور تھپیڑوں میں حباب کی سرافرازیوں کو دیکھ کر کہتا ہے کہ موج دریا آہ ہے جس کی گرمی سے جسم دریا پر پھپھولے رونما ہیں، اور یہ حباب کی شکل میں سطح دریا پر نظر آرہے ہیں۔

گہ گہ بہ زبان اشک آواز دہ ایوان را ... تا بو کہ بہ گوش دل پاسخ شنوی زایواں
دندانۂ ہر قصرے پندے دہدت نو نو ... پند سر دندانہ بشنو ز بن دنداں
گوید کہ تو از خاکی ما خاک توایم اکنوں ... گامے دو سہ بر ما نہ اشکے دو سہ ہم بفشاں
از نوحۂ جغد الحق مائیم بہ درد سر ... از دیدہ گلابی کن درد سر ما بنشاں
آری چہ عجب داری کاندر چمن گیتی ... جغد است پے بلبل نوحہ است پے الحاں

اس کے بعد شاعر کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں وہ ایک والہانہ انداز میں ٹوٹے ہوئے محلوں سے اس تباہی و بربادی کا راز دریافت کرتا ہے اور عالم بیخودی میں اسے دندانۂ قصر سے جواب بھی مل رہا ہے کہ آؤ تم بھی ایک پتلہ خاک ہو، میں بھی تمہاری ہستی کا ڈھیر ہوں۔ ہماری تمہاری خلقت ایک ہے، مجھ پر دو ایک قدم چلو، چند قطرے آنسو بہا لو۔ دوسری طرف

Marfat.com

شاعر کے کان میں اُلّو کی وحشت ناک آوازیں آ رہی ہیں، سر میں درد ہو گیا ہے، اور اب وہ طالب ہے کہ گلاب نہیں بلکہ آنسوؤں سے میرے اس درد کا علاج کر دیعنی وہ دوسرے افراد کو بھی اپنا شریک ماتم بنانا چاہتا ہے، اس کے بعد رنگینیٔ دہر کا ایک کلیہ پیش کرتا ہے کہ دنیا میں ہر بلبل کی آواز کے بعد اُلّو کی منحوس صدائیں سنی جاتی ہیں اور ہر نغمۂ نشاط کے بعد نوحہ مستلزم ہے۔

ایں ہست ہماں ایوان کز نقش رخ مردم	خاک در او بودے دیوار نگارستان
ایں ہست ہماں درگہ کو را ز شہاں بودے	دیلم ملک بابل، ہندو شہ ترکستان
پندار ہماں عہد است از دیدۂ فکرت بیں	در سلسلۂ درگہ در کوکبۂ میدان

یہ وہی محل ہے جہاں خدم و حشم تھا، جہاں کی خاک نگارخانہ چین کی دیوار تھی، یہ وہی دربار ہے، جہاں دیلم، بابل ہند اور ترکستان کے حکمراں جذبۂ نیایش لے کر آتے اگر غور سے دیکھا جائے تو عہد ماضی کا وہ جبروت آج بھی در و دیوار سے ظاہر ہو رہا ہے آثار قدیمہ کے اس مطالعہ سے خاقانی اس نتیجہ پر پہونچے ہیں

امروز کہ از سلطان رندے طلبد توشہ	فردا ز در رندے توشہ طلبد سلطاں
ہر کس برد از طیبہ سبحہ "زگل حمزہ"	پس تو ز مداین بر تسبیح "گل سلمان"

دنیا میں یہی ہوتا چلا آیا ہے کہ آج اگر کوئی شخص بھکاری بنکر بادشاہ کے دروازہ پر صدا لگا رہا ہے تو کل بادشاہ اس مفلس و قلاش کے دروازہ پر دریوزہ گری کے لئے آتا ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں کہ مکہ سے تو سب لوگ "سبحہ گل حمزہ" لے جاتے ہیں مجھے مدائن

Marfat.com

"گل سلمان"، کی تسبیح لانی چاہیئے۔

دنیا کی ہر قومی ترقی کا ایک دور ہوتا ہے، اور اگر میں تاریخ و آثار کے بیشمار واقعات کی بنا پر دعویٰ کروں تو بیجا نہیں کہ اُمتوں کی ترقی کے لئے فطرت خود اسباب مہیا کرتی ہے اور جب اُن کی بربادی کا زمانہ آتا ہے، تو کوئی تدبیر کوئی حکمت عملی کارگر نہیں ہوتی، جنھوں نے تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا ہے انھیں اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ خاندانوں کے اسباب عروج و زوال میں باوجود کاوش بھی اس کا پتہ لگانا مشکل ہے کہ کسی خاندان کی سیاسیات ایک وقت حوادث زمانہ کے سیلاب سے کیوں محفوظ رہ جاتی ہے، اور دوسرے وقت وہی اسباب سیاسی خطرات کیوں پیدا کر دیتے ہیں؟ ایک غلام اور ایک آشفتہ حال فرد بادشاہ ہوتا ہے، اور شاہی خاندان کا ایک معزز انسان دربدر کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے یا اپنے گلوئے نازپرورده کو تشنگیٔ شمشیر کے لئے وقف کر دیتا ہے، عہد اموی و عباسی کی مطول داستان جلالت و نکبت کو جانے دیجئے، صفویہ اور قاجاریہ، فاطمیہ و ملوکیوں کے سیاسی انقلاب کو چھوڑیئے، برامکہ کی ترقی، اور ہندستان کے غلام، خلجی، تغلق، سید لودی، سور خاندانوں کو درگذر کیجئے، صرف دکن کی محدود سرزمین کے مختلف شاہی خاندانوں کے اسباب ترقی و تنزل پر غور کیجئے، خاندان بہمنیہ اور عادلشاہیہ کے آشفتہ حال بانیوں کے حالات زندگی پڑھیے نظام الملک بحری اور فاروق شاہیہ کے بانی ملک راجہ کی زندگی کا مطالعہ کیجئے

لہ فرشتہ، بساتین السلاطین، منتخب التواریخ، اور تاریخ قطب شاہیہ وغیرہ میں بتفصیل یہ حالات موجود ہیں ان خاندانوں کے بانی اور ان کے نسب حسب کے متعلق ایک کتاب میرے زیر تصنیف ہے

Marfat.com

آپ کو معلوم ہو جاویگا کہ طلسم کائنات کی ان بوالعجبیوں کو سمجھنا مشکل ہے، اور عجز کے ساتھ صرف یہی اقرار کرنا پڑے گا کہ حقیقتاً فطرت کا بانی کسی شے کو ہمیشہ ایک حالت پر رکھنا نہیں چاہتا، ہر شاہی خاندان کا وجود ایک بچہ کی ولادت ہے، اور اس کے لئے جتنے مراحل ارتقا طے کرنا ہیں ان سے گزرنے کے بعد یقیناً ایک وقت معین پر باوجود سامان ارتقا، باوجود اسباب علو، نکبت کا ہجوم اور بدبختی کا سیلاب ضروری ہے، جس طرح ضعف پیری میں عمدہ سے عمدہ تدابیر بھی ایام جوانی کی معمولی تدبیر کے برابر بھی اپنا اثر ظاہر نہیں کرتیں، اسی طرح قوموں اور ملتوں، خاندانوں اور افراد کے ارتقا کی ایک محدود منزل ہے، جہاں انہیں اپنی ترقی کا آخری سفر ختم کر کے فنا ہونا پڑتا ہے، اکاسرہ کی تباہی کا زمانہ آیا تو یزدجرد جیسے بیدار مغز بادشاہ کی ایک نہ چلی۔ امویہ کی پستی کا دور آیا تو مردان الحمار جیسے زبردست سلطان سے بھی کچھ بنائے نہ بن پڑا، لودیوں کے خراب دن آئے تو ابراہیم میدانِ جنگ میں مارا گیا۔

مغل خاندان حوادث روزگار کی اس زد سے کیونکر محفوظ رہ سکتا تھا، جلوس بابری ۹۳۲ھ سے ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ کے وقت جلوس ۱۲۵۳ھ تک تین صدی سے زیادہ زمانہ گزر گیا تھا، خاندان مغلیہ وہ تمام خدم وحشم تزک و تجمل، جبر و قہر، قبضہ و اختیار، نعایم و لذائذ حاصل کر چکا تھا جو دنیا کے ایک بڑے سے بڑے خاندان کے لئے ضروری ہیں آخر کار ان کے عادات و اطوار، ان کے اخلاق و ذہنیت میں انقلاب ہونا تھا، ہوا، اور جس طرح انھوں نے لودیوں کو بے خانماں کیا تھا، اسی طرح خود بھی

Marfat.com

بے خانماں ہوئے، وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ (اور بہت سی بستیاں ایسی تھیں جو قوت میں آپ کی اس بستی سے بڑھی ہوئی تھیں جس کے رہنے والوں نے آپ کو گھر سے بے گھر کر دیا کہ ہم نے ان کو ہلاک کر دیا، سو ان کا کوئی مددگار نہ ہوا۔)

ایک با اقتدار خاندان کی ظل عاطفت میں، قدرت دوسرے خاندان کی ترقی کے جو اسباب مہیا کرتی ہے انہیں تاریخ نے نظر انداز نہیں کیا، البتہ صورتیں مختلف ہوتی ہیں اور اس سایہ میں پرورش پاکر خاندانوں نے اپنے ولی نعمت سے جو سیاسی حقوق حاصل کئے۔ انہیں جس طرح مٹایا، اور آخر کار انہیں مٹاکر تاج و تخت حاصل کیا وہ تاریخ کا کوئی نادر الوقوع مسئلہ نہیں، لہذا مغل خاندان کے ساتھ انگریزی حکومت نے جن سیاسی تدابیر اور ظاہر دارانہ مراعات سے کام لیا ان کا مطالعہ کرنے کے بعد نہ تو انگریزی حکومت کو مطعون بنایا جا سکتا ہے، نہ انگریزوں سے کوئی گلہ ہے۔

خاندان مغلیہ کا دور انحطاط تو عالمگیر کی وفات سے ہی شروع ہوتا ہے لیکن اکبر اور عالمگیر کی قائم کی ہوئی عظمت نے شاہ عالم کی زندگی (۱۱۱۸ھ سے ۱۱۲۴ھ) تک کوئی نمایاں تغیر نہ ہونے دیا اس کے بعد پیاپے مختلف بادشاہوں کی تخت نشینی اور چند ماہ اور چند یوم تک زمام حکومت لے کر برطرف ہونے کے واقعات نے مغل سیاسیات کو بہت نقصان پہنچایا۔ چنانچہ شاہ عالم کی وفات ۱۱۲۴ھ سے سلطان محمد ابراہیم کے وقت جلوس ۱۱۳۲ھ تک تخت دہلی پر پیاپے مغل خاندان کے نو بادشاہ بیٹھے۔

Marfat.com

ان میں صرف سلطان فرخ سیر نے چھ سال تین ماہ اور چند یوم تک حکومت کی بقیہ تمام سلاطین چند ماہ اور چند یوم تک سریر آرائے حکومت رہے ابوالفتح محمد شاہ بادشاہ کی حکومت ہر چند سطوت مغلیہ کے استقرار کے اعتبار سے اچھی تھی لیکن نادری حملہ اور دہلی کی بربادی نے مغلوں کو دنیا کی نظر میں بہت خفیف کر دیا، اور غالباً اسی وقت سے ہندوستان کی دوسری سیاسی تحریکات کو مغلوں پر تسلط حاصل کرنے کی جرأت ہوئی، محمد شاہ کے بعد بہادر شاہ سے لیکر اکبر شاہ (۱۱۶۱ھ تا ۱۲۵۳ھ) تک ہر چند مستقل طور پر بادشاہوں نے حکومت کی، لیکن شاہ عالم ثانی ہی کے دور میں انگریزی سیاسیات نے ہندوستان پر ایک گہرا اثر پیدا کر دیا تھا اور شاہ عالم سے لیکر سراج الدین بہادر شاہ ظفر (۱۱۷۳ھ تا ۱۲۵۳ھ) تک تیموری خاندان کے بجائے انگریزوں کو ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی طاقت تصور کرنی چاہیئے۔

لارڈ ولسلی اور اس کے رفقائے دارالشوریٰ کا خیال تھا کہ شاہ عالم کو اپنی حمایت میں لیکر بتدریج شہنشاہیت کی سیاسی تدابیر اختیار کرنی چاہیئے[1] شاہ عالم کے مسئلہ حفاظت

---

[1] عہد ظفر کے یہ سیاسی و تاریخی حالات میں نے ،، جان ولیم کے ،، کی کتاب ،، تاریخ جنگ سپاہیان ،، سے لئے ہیں جو تین جلدوں میں ہے تاریخی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنف نے بعض جگہ جیسی زہر افشانیاں کی ہیں، طنز آمیز لہجہ، اور حقارت انگیز طرز خطابت اختیار کیا ہے، وہ یہی نہیں کہ ہندوستانی دماغوں کے اندر ہیجان پیدا کرنے والے ہیں بلکہ انگریزی سیاست کے بھی منافی ہیں اور میں بہ آہنگ بلند کہہ سکتا ہوں کہ مصنف نے یہ کتاب لکھ کر انگریزی سیاسیات کو فائدہ کی بجائے نقصان پہونچانے کی کوشش کی ہو میں نے چاہا تھا کہ ظفر کے متعلق ہر پہلو سے بحث کروں لیکن افسوس یہ ہے کہ (بقیہ نوٹ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ)

Marfat.com

سے لارڈ ولسلی نے سیاسی فضا میں جو نمایاں تغیر پیدا کر دیا تھا وہ یہ تھا کہ اگر خاندان مغلیہ کا یہ فرمانروا انگریزوں کی بجائے فرانسیسیوں یا مرہٹوں کی حفاظت میں آجاتا تو انگریزوں کو برطانوی حکومت کے قائم کرنے میں دقتیں پیدا ہوتیں۔ چنانچہ یہ نظریہ اس خط سے بھی واضح ہو جاتا ہے، جو لارڈ ولسلی نے ۱۳ر جولائی ۱۸۰۴ء کو انگلستان کی "عدالت رہنمایان کی مجلس مخفیہ" میں بھیجا تھا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شاہ عالم کو برطانوی حفاظت میں لینے سے فرانسیسی قوم جو ہندوستان کے حصہ میں صاحب اقتدار ہے، اپنے معاندانہ ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکتی، کیونکہ شاہ عالم ان کے معاندانہ کارروائیوں میں ایک آلہ تھا، جس سے وہ اب محروم ہو گئے، ولسلی نے اس سیاسی حکمت عملی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ بادشاہ کے مسلہ حفاظت سے اطراف وجوانب کی دیسی ریاستوں پر ایک اچھا اثر پڑے گا اور وہ یہ دیکھ کر کہ انگریزوں نے بادشاہ کے لئے اس گری ہوئی حالت میں ایک نشیمن راحت کا سامان کر دیا، اور اسکے آفت زدہ کثیرالتعداد افراد خاندان کے لئے ایک معقول ذریعہ معاش مقرر کر دیا، انگریزی سیاسیات کو بہ نظر استحسان دیکھیں گے، شاہ عالم کا انگریزی حمایت میں آجانا خاندان

(بقیہ نوٹ صفحہ ماسبق) میں پٹنہ کی اورنٹیل لائبریری میں باوجود کاوش عہد ظفر کی تاریخی کتابیں نہ پاسکا یہاں اُردو کی کتابیں ایک تو یوں بھی کم ہیں، اور جو ہیں ان میں اس مقصد کی کتابیں نہ ل سکیں تاریخ اور ادب کی کتابوں کی تدوین کے متعلق خاندان مغلیہ کو جو شرف ہے۔ وہ علمی دنیا سے مخفی نہیں، لیکن عہد ظفر خاندان مغلیہ کا دور نزع تھا۔ وہاں تاریخ اور شاعری کے متعلق کتابیں کون لکھتا۔ بہت تلاش کے بعد "جام جم" مصنفہ سید احمد خاں (قلمی نسخہ) انکشاف الخلوق مصنفہ منشی خادم علی سندیلوی اور اس انگریزی کتاب سے سیاسی اور تاریخی حالات مرتب کئے۔

Marfat.com

تیموریہ کے مٹنے اور حکومت برطانیہ کے استقلال کا سبب ہوا، اور " ولیم کے " فتح " د نصرت کے
نہایت ستمگارانہ جذبات میں جبکہ انسان بیخود ہو جاتا ہے، کہتا ہے، کہ " دسلی نے اپنے رفقا
سر جارج بارلی اور مسٹر اڈمن اسٹون کے مشورہ سے ایک فہرست تجاویز مرتب کی جس کے
ذریعہ بادشاہ کی وقعت ایک گڑیا سے زیادہ نہیں رہی وہ بیک وقت ایک بادشاہ بھی تھا، اور
انگریزوں کے سیاسی مقاصد کے حصول کا ایک آلہ . وہ کچھ تھا بھی اور کچھ نہیں، اب وہ انگریزوں
کا ایک وظیفہ یاب تھا، وہ ہم لوگوں کے لئے " بازی عظیم " (Great game) کا ایک
نمود اطمینان تھا، ہم لوگوں کو یہ دیکھ کر تشفی تھی کہ بادشاہ ہمارے تصرف میں ہے، لیکن ساتھ
ہی وہ ہم لوگوں کیلئے ایک کشمکش اور حیرت کی چیز بھی تھا کہ کس طرح اس آلہ کو استعمال کریں لارڈ
دسلی کی حکومت کی سیاسی قابلیت کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ یہ لارڈ دسلی کی
زبردست حکمت عملی تھی کہ اُس نے صرف خاندان تیموریہ ہی نہیں بلکہ اُن لوگوں سے بھی
مصالحت رکھی جو اس مسلمان شاہی خاندان سے ایک جذبہ احترام اور تعلق معززانہ رکھتے
تھے لارڈ دسلی کی تجاویز میں ایک تجویز یہ تھی کہ ریاستوں پر جو اقتدار قائم کیا گیا ہے، اُس کا
ایک حصہ ہنوز بادشاہ سے متعلق رہے اور ان اضلاع کی آمدنی کے علاوہ جو اس تخت شاہی
سے مخصوص تھی، بادشاہ اور اُس کے خاندان کے لئے سالانہ ایک لاکھ پونڈ سے زیادہ وظیفہ
مقرر کر دیا، اس طور سے کائنات کا سب سے بڑا بادشاہ، ہندوستان کا حکمراں باایں ہمہ
کہ اُسے حکومت بھی تھی اس کے مقبوضات بھی تھے حقیقتاً " جماعت تجار " کا ایک وظیفہ خوار
ہو گیا، حالات نے ایسی صورتیں اختیار کر لی تھیں جو حکومت برطانیہ ہند کے فواید کی مو

Marfat.com

ہوں لیکن خطرات سے خالی نہ تھیں، ان مصائب اور انحطاط کے باوجود بادشاہ کا نام قوت کا ایک ستون تھا، اور روگ پرچم شاہی کو ہنوز بہ نظر اعزاز و احترام دیکھتے تھے لارڈ ولسلی نے اچھی طرح معلوم کر لیا کہ اگر حکومت مغلیہ کے یہ بقیہ آثار قائم رہے اگر شاہ عالم کو شاہجہاں کے محل میں اس تمام اگلی شان ڈشکوہ کے ساتھ ایک مسلمان آبادی کے درمیان جو ہنوز خاندان تیموریہ سے وفاداری کا جذبہ رکھتی تھی چھوڑ دیا گیا تو ایک نہ ایک دن شاہ عالم کے کسی جانشین کی بدولت تباہ شدہ شہنشاہیت کی تعمیر جدید کی جدوجہد ہو گی جس سے ہم لوگوں کو نہایت پریشان کن تکالیف کا سامنا ہوگا، اس لئے تجویز کیا گیا کہ مونگیر شاہی خاندان کا مسکن قرار دیا جائے لیکن تبدیل مقام کے خیال سے ضعیف العمر بادشاہ کانپ گیا اور یہ لرزش خوف اس کے تمام خاندان، چھوٹے بڑے، مرد عورت، متعلقین اور محکومین میں سرایت کر گئی لارڈ ولسلی نے اب مزید ایذا رسانی سے باز رہ کر انھیں مورد عجز بنانا اور چاہا اور راضی ہو گیا کہ وہ دہلی محل میں سابق دستور رہیں۔

دسمبر ۱۸۰۶ء میں شاہ عالم کا انتقال ہو گیا، اور اکبر شاہ اس کا جانشین مقرر ہوا اس وقت انگریز افسر جو دہلی میں برطانوی حکومت کی نیابت کرتا تھا قدیم طرز کا ایک درباری تھا، اور اسے اپنی نرمی کلام اور اوضاع سے کافی موقعہ تھا کہ دربار شہنشاہی پر خارجی اثر ڈال سکے، مسٹر سیٹن کو مرحانا قبول تھا لیکن وہ محل کے چھوٹے چھوٹے افراد کے احساسات مجروح کرنا نہیں چاہتا تھا، چارلس مٹکاف نے لکھا کہ میں سیٹن کے اس طرز عمل کو پسند نہیں کرتا، جو انھوں نے شاہی خاندان کے انتظام میں اختیار کیا ہے، میں نے مانا کہ ایک برسر اقتدار

Marfat.com

شاہی خاندان کے زوال کے بعد عدل و انصاف، شفقت و رحمت کا اقتضا ہے کہ ایک مستحسن
طرز عمل اختیار کیا جائے، لیکن سیٹن کا خلق و رافت، ان کا عجز، محبت ان کا اعتراف لطف
اس تمام شان و شکوہ کا خاتمہ کر رہا ہے جس کا برطانوی حکومت کے ایک نائب کو دہلی میں، جو صحیح
معنی میں دہلی کا حکمراں ہے، حاصل ہونا چاہئے اس طور سے حمیت انسانی کے اظہار میں
وہ ان شاہی جذبات کو بیدار کر رہے ہیں جنھیں ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہئے یہ تو ظاہر
ہے کہ ہم لوگ بادشاہ کو شہنشاہی اقتدار تفویض کرنا نہیں چاہتے، لیکن ساتھ ہی ہم لوگوں
کو ایسی روش نہیں اختیار کرنی چاہئے کہ اس کے دل میں اس کے حصول کا حوصلہ پیدا
ہو جائے، ہم لوگ اس کے حالات کے مطابق اس کا احترام کریں ہم لوگ ماحول کو مدنظر رکھتے
ہوئے اس کی آسائش کا خیال رکھیں، اور جہاں تک ممکن ہو وہ تمام ذرائع بہم پہونچائیں جن
سے وہ خوش خوش رہے، ساتھ ہی جب ہم لوگوں کی غرض غائی یہ نہیں کہ پھر اُسے وہ
اگلی شہنشاہیت عطا کریں تو یہ ضروری ہے ہم لوگ یہ بھی مدنظر رکھیں کہ اُسے شہنشاہیت
کا خواب دیکھنے کی بھی ترغیب نہ ہو، ایک سفید مو ماہر سیاسیات بھی اس سے زیادہ معقول
بات نہیں لکھ سکتا، اور جب چند سال گزرنے کے بعد وہ دہلی میں ریذیڈنٹ مقرر ہوا
اسے مسائل کے حل و عقد کے اعلیٰ اختیارات حاصل ہوئے تو اُس کے لڑکپن کے خیالات
اور بھی قوی ہو گئے اسے ایسے ایسے امور سے سامنا ہوا جو عقل اور انسانیت دونوں
سے مجرمانہ تھے، لیکن نہ تو وہ خود اور نہ اس کے جانشین اس سے زیادہ کر سکتے تھے، کہ
بعد دیگرے ایسی تدبیر اختیار کریں کہ بتدریج ان خرابیوں کا ازالہ ہو جائے جو ان کے

Marfat.com

رونا تھیں، وقت گزر گیا انگریزوں کے بڑے بڑے مقبوضات محفوظ تھے، انھیں کسی خارجی
دشمن سے خوف نہ تھا اور وہ اپنے اندر ایک زبردست قوت کا احساس پلنے لگے
، وہ ہراس خطرہ کا سامنا کر سکتے ہیں جس سے انھیں سرزمین ہندوستان میں دوچار ہونا
پڑے، اُنھوں نے مضبوط اور جوانمردانہ قدم اُٹھایا۔ اب انھیں ایک حکومت قائم کرنے
کے خیال سے الگ رہنے کی ضرورت نہ تھی، ابتدائے صدی میں جو ایک خطرناک خیال
معلوم ہوتا تھا اب ہم لوگوں کی پوزیشن کا ایک قطعی سانحہ کہا جا سکتا تھا لارڈ ولسلی کے زمانہ
میں وہ بازی عظیم" ناکمل طور پر انجام پائی تھی اور دس سال کے بعد لارڈ ہیسٹنگس نے
دیکھا کہ سمجھوتہ سے کوئی مفید نتائج مرتب نہ ہوئے اور اُنھوں نے ارادہ کر لیا کہ ہندوستان
کی تمام سیاسی قوتوں پر حکومت برطانیہ کا اقتدار قایم کر دیں، وطن اور غیر ممالک دونوں
جگہ زمانہ بدل چکا تھا اور اس کے ساتھ ہمارے احساسات میں تغیر ہو چکا تھا، یورپ میں
ہماری کامیابیوں نے ہم لوگوں کے اندر یہ یقین پیدا کر دیا تھا کہ ہم لوگ ایک بڑی طاقتور
قوم ہیں، اور باوجودیکہ "لیڈن ہال" اسٹریٹ کے رہنما مشرق میں ہماری تمام فوجی اور
سیاسی توسیع کے خلاف صف بستہ تھے، لیکن یہ خیال تھا کہ اگر ہمیں کامیابی ہوئی تو
انگریزی قوم ہماری جوانمردانہ حکمت عملیہ کی داد دے گی، اس زمانہ سے انگلستان کے
ہاتھ میں ہند کے شاہزادوں کی قسمت کے فیصلہ کرنے کی باگ ڈور آگئی اب ہم لوگوں کو
کوئی دریغ نہ تھا کہ ایک سب سے زبردست طاقت کی طرح اپنا طرز عمل اختیار کریں
ہماری تجاویز کا ایک اہم جزو یہ تھا کہ ہم سلطنت دہلی کے فسانہ کو مٹائیں، اب مشرق

Marfat.com

میں لفظ "حکومت" کا الحاق صرف برطانیہ کے ساتھ ہوسکتا تھا اور "تسخیر شہنشاہیت
کے قائم رہنے کی ضرورت نہ تھی جسے ہم لوگوں نے اپنی سیاسی حکمت عملیوں کے لئے پہلے
ضروری خیال کیا تھا، یہ قابل بیان ہے کہ کس طرح تین سال کے درمیان میں آفتاب
شہنشاہیت کی چمک ماند پڑتی گئی، کس طرح ایک گورنر جنرل اور اس کے بعد دوسر
مغلوں کے متکبرانہ دعاوی کو مسترد کرتا گیا، اور خاندان تیموریہ کے اُن اعزازات کو جنھوں
نے عرصہ بعید تک اس کی شان وشکوہ کو قایم رکھا تھا، مٹاتا گیا، ۱۸۳۵ء میں ہندوستان
کے سکہ مروجہ میں یہ تبدیلی واقع ہوئی کہ اس پر مغل بادشاہ کا نام وعلامت کندہ نہیں
تھی بلکہ اس کی جگہ "سکہ کمپنی" نے لی، یہ تمام صورتیں ارباب محل کے پیش نظر تھیں لیکن
وہ لوگ انگریزوں کے روزافزوں اقتدار کے حاجت مند تھے، عظیم الشان محل جو
خود ایک بڑا شہر تھا، بہتیری قسم کی مکروہات کا مخزن تھا، اور ایک مسیحی حکومت کو نسلاً بعد نسل
آزاد مرد اور بدسیرت عورتوں سے تکلیف پہونچ رہی تھی، جو خود اپنے لئے بھی لعنت
ہوئے تھے اور دوسروں کے لئے بھی محکومانہ سرکاری الفاظ میں کہا جاتا تھا کہ شاہی خاندان
کے افراد قانون کے قیود سے آزاد ہیں، وہ کاہلی اور بداطواری میں غرق رہتے، اور ان
عام راستے سے کوئی التفات نہ تھا، حقانیت کو بغیر چھپائے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ محل
کے مقامات میں اُن تمام جرایم کا ارتکاب ہوتا تھا جن کا رواج مشرق میں تھا اور صرف
خدا تعالیٰ ہی اس ہولناک فہرست آزادی کا محاسبہ کرسکتا تھا، ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء کی شام
۸۲ سال کی عمر میں اکبر شاہ نے وفات پائی، چند سال قبل اس نے اپنے ایک عزیز

کے لیے جائز شاہزادہ کی جانشینی کے خلاف خفیہ کارروائی کی تھی، اور اب شاہزادہ ابوظفر اس دور کی سرکاری اصطلاح میں "ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی"[۵] کے لقب سے سریر آرائے حکومت ہوا، وہ اس وقت عمر کا زیادہ حصہ گزار چکا تھا لیکن چونکہ ایک عرصہ سے صاحب حکومت خاندان کا رکن تھا، اس کی زندگی کی ساٹھ سال کی گزری ہوئی مدت نے اس پر برا اثر نہیں ڈالا تھا، خیال کیا جاتا تھا کہ وہ ایک خموش کاہل انسان ہے، جسے صرف شاعری کا شغف ہے اور اسے فطری طور پر سیاسی خفیہ کارروائیوں سے کوئی علاقہ نہیں۔ تاہم شہنشاہ کا خطاب ملتے ہی، اس نے شاہی وظیفہ میں جو اکبر شاہ کو دیا جاتا تھا اضافہ کے لیے اصرار کرنا شروع کیا، سر چارلس مٹکاف گورنر جنرل پبلک کے روپیہ کی اتنی بربادی کرنی نہیں چاہتے تھے، لیکن باوجودیکہ گورنر جنرل کو پورا یقین تھا کہ یہ روپیہ کی تضییع ہے، لیکن اس نے وعدہ کر لیا مگر اس کے لیے شرط پیش کی کہ بادشاہ کو ایک عہدنامہ کے ذریعہ یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ وہ آئندہ برطانوی حکومت پر کسی قسم کے دعاوی نہیں کرینگے، لیکن بہادر شاہ نے وہی کیا جو ان کے والد نے قبل کیا تھا، انھوں نے

---

[۵] ۲۶ شعبان ۱۱۸۳ھ میں قریب غروب آفتاب بہادر شاہ کی ولادت ہوئی تھی، دارالسلطنت دہلی میں بہ عمر ترسٹھ سال دس ماہ شب جمعہ ۱۱ جمادی الثانی کو سریر آرائے حکومت ہوئے۔ مولوی امام بخش صہبائی نے تاریخ کہی

از نشہ دولت بہادر شاہی	بنشست بتخت دولت روز افزوں
شد پر زری طرف باغ دہلی	نزہت بفزود ارتفاع دہلی
تاریخ جلوس آں شہ والا قدر	آمد بہ لب خرد چراغ دہلی

Marfat.com

مجوزہ شرط کو ماننے سے انکار کر دیا، اور ہنوز یہ خیال کرتے رہے کہ وہ انگلستان میں ایک
نائب بھیجکر جو کچھ چاہتے ہیں بلا کسی قید و شرط کے حاصل کرلیں گے اکبر شاہ نے مشہور برہمن رام
موہن رائو کو اپنا نائب مقرر کیا اور اپنے اسی قدیمی نشۂ حکومت میں انھیں ،، راجہ ،، کا خطاب
دیدیا لیکن انگریزی ارباب حل وعقد نے سرکاری طور پر ،، راجہ ،، کے خطاب کو تسلیم کرنے سے
انکار کر دیا، ہر چند وہ اس شخص کی سیرت کا بڑا احترام کرتے تھے، کیونکہ وہ شخص جہلا کو ایک
معاشرتی اور مذہبی مصلح کی طرح روشن خیال بنانے کی کوشش کر رہا تھا مغل بادشاہ کے
نائب کی حیثیت سے رام موہن راؤ نے کوئی مفید کام انجام نہیں دیا اور بہادر شاہ نے دیکھ
کہ معاملات اسی حالت میں تھے جبکہ متوفی بادشاہ کی طرف سے راجہ موہن راؤ نے انگلستان
کا سفر اختیار کیا تھا، لیکن ابھی اسے یقین تھا کہ اگر کسی انگریز نائب کے ذریعہ انگلستان میں
پیام رسانی کی جائے تو مفید ہو سکتی ہے ،اس لئے جب انھوں نے سنا کہ ایک فصیح و بلیغ
خطیب جس نے رنگین اقوام کے حقوق کی نیابت کر کے مغربی دنیا میں بڑی شہرت حاصل
کرلی تھی . ہندوستان میں آیا ہے ، تو انھوں نے اسے دہلی میں مدعو کیا، ان کی خواہش
ہوئی کہ اسے اس خدمت پر مامور کریں انھیں اپنے بہت سے خیالی مصائب کی فریاد کر
تھی لارڈ اڈنبرو نے نذرانہ پیش کرنے کا رواج ختم کر دیا تھا، یہاں تک کہ ریذیڈنٹ کے لئے
بھی اس قسم کا کوئی ہدیہ پیش کرنا ممنوع تھا، نذرانہ پہلے گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف پیش
کرتا تھا، ۱۸۳۷ء بہادر شاہ کی تخت نشینی تک موخر الذکر عہدہ دار یہ عمل کرتا رہا ۱۸۴۲
یا ۱۸۴۳ء کے موسم سرما میں لارڈ اڈنبرا کے ناظموں نے بادشاہ کو نذرانہ پیش کیا گورنر جنرل

Marfat.com

کو اس کی خبر نہ تھی، جب اُسے خبر ہوئی تو وہ نہایت متعجب ہوا، اور پھر اپنے ناظموں پر خفگی کی۔ اور ہمیشہ کے لئے نذرانہ پیش کرنے کی رسم کو اُٹھا دیا، اس طور سے خاندان تیموریہ کی آخری شاہانہ شان بھی انگلستانی حکومت کے زیر اثر جاتی رہی[1] ہر چند اس کے معاوضہ میں روپیہ دیا جاتا تھا، لیکن بادشاہ کے دماغ کو یہ تغیر بھی تکلیف دے رہا تھا، کمپنی نے کسی مزید وظیفہ کے تقرر سے اُس وقت تک کے لئے انکار کر دیا جب تک شاہی خاندان اُن مفصلہ شرائط کو منظور نہ کرلے، حقیقتاً کوئی سبب بھی نہ تھا کہ وظیفہ بڑھایا جائے، ایک لاکھ روپیہ ماہانہ کافی تھا، اس ماہانہ لاکھ روپیہ کے وظیفہ کے علاوہ بہادر شاہ کو بعض شاہی اراضی کی آمدنی بھی تھی، اور انہیں شہر سے بعض جائداد کا کرایہ بھی آتا تھا[2]۔

بہادر شاہ کو برطانوی حکومت سے کوئی گلہ نہ تھا، اور غالباً بادشاہ کو کامل قناعت نہیں تو ایک مطیعانہ امن کے ساتھ اس حالت میں بسر کرتے۔ لیکن حرم کی خفیہ ریشہ دوانیوں نے جن کا ہر مشرقی بادشاہ شکار رہا کرتا ہے، بہادر شاہ کو زیر اثر کر لیا تھا اُنھوں نے ایک نوجوان لڑکی سے شادی کر لی تھی، اور پیری میں انہیں اس سے ایک لڑکا بھی پیدا ہوا تھا، وہ عورت خیر و شر کے متعلق بادشاہ پر اثر رکھتی تھی جیسا کہ ہوتا چلا آیا ہے، نواب زینت محل

---

[1] ولیم کے نے اس منظر کا نہایت دلچسپ مرقع پیش کیا ہے، جبکہ دو انگریز افسر بہادر شاہ کو نذرانہ دینے گئے ہیں، ان میں ایک انگریز کا بیان ہے کہ اُس نے باوجود ردِ عمل خاندان تیموریہ کے اس آخری نشیمن جلال میں جس وقت قدم رکھا، تو اُس پر ایک خاص قسم کا رعب اور ہیبت طاری تھی یہ آخری نذرانہ تھا جو مغل خاندان کے اس آخری فرمانروا کو برطانیہ کی طرف سے دیا گیا تاریخ جنگ سپاہیان جلد ۲۔

[2] مسٹر سنڈرز کی شہادت بابتہ مقدمہ بہادر شاہ

Marfat.com

کے زیر اثر بادشاہ نے کوشش شروع کی کہ حقیقی جانشین کا حق مسترد کر کے اس بچے شہزادہ کو اپنا جانشین مقرر کر دے، جیسا کہ اکبر شاہ نے خود بہادر شاہ کے خلاف کیا تھا اسی طرح اس نے بھی یہ نامنصفانہ طرز عمل اختیار کیا تاکہ اس کی محبوبہ کو تسلی ہو، لیکن اس میں بادشاہ کو جلدی کرنے میں ناکامی کا خطرہ تھا اس نے بہتر یہی سمجھا کہ جب تک بچہ جوان بخت جوان نہ ہولے موقعہ کا انتظار کیا جائے۔

جانشینی کا قصہ

۱۸۴۹ء میں شہزادہ دارا بخت وارث تخت نے وفات پائی، اس وقت بہادر شاہ کے ستر سے زیادہ بیٹے تھے جانشینی کے سوال نے گورنر جنرل کو بہت تکلیف پہونچائی، لارڈ ڈلہاوزی ایسا نہ تھا کہ مغل بادشاہ کی اس تمسخرانہ بادشاہت کو تسلیم کرتا، اس کے سامنے دوسرے لوگ تھے جو قدیم خاندان کی روایات پر زیادہ متاثر تھے اور وہ غم و ملال کے ساتھ اس حالت کی برقراری چاہتے تھے، جس کے خلاف عقل و حقانیت بغاوت کر رہی تھی، "بہادر شاہ کی وفات کے بعد،" شاہ دہلی "کے خطابی شکوہ کے متعلق" ایسٹ انڈیا کمپنی "میں مباحث ہوئے، اگست ۱۸۴۴ء میں" مجلس رہنمایان "نے یہ خیال ظاہر کیا، گورنر جنرل نے ریجنٹ کو ہدایات بھیجی ہیں کہ شاہ دہلی کی وفات کے بعد اُس کے جانشین کے اس خطاب کے اختیار کرنے پر کوئی ایسا قدم نہ بڑھایا جائے جو اس خطاب کے تسلیم کرنے پر مشتمل ہو، اگر ان ہدایات میں خطاب کے مسترد کرنے کا خیال ظاہر کیا جاوے گا تو ہم لوگ اسے منظور نہیں کرینگے، جب تک ہم لوگوں کو تمہاری طرف سے بیشتر معلومات نہ موصول ہوں اور جب تک ہم لوگوں کو اس خلاصہ سفارشات

Marfat.com

پر جو پیش کیا جاویگا غور و فکر کرنے کا وقت نہ ملے، اس تجویز سے لیڈن ہال چیمبر میں مختلف جماعتیں ہوگئیں اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ کوئی عملی قدم بڑھانے میں دیر ہوئی، ڈلہاوزی نے دیکھا کہ مسئلہ اس وقت کے لئے لاینحل رہا جب تک ہندوستان سے مشورے ارسال نہ کئے جائیں، دارا بخت کی وفات نے مسئلہ کے طے پانے کا موقعہ دیا جس سے ڈلہاوزی جیسے مزاج کا آدمی چوک نہیں سکتا تھا، دوسرا جانشین اسلامی قانون کے مطابق شاہزادہ فخرالدین ہوتا تھا جس کی عمر اس وقت تیس سال کی تھی اور وہ یوروپین سوسائٹی کا شایق اور برطانوی حکومت کا روادار تھا اس کے ذریعہ لارڈ ڈلہاوزی تغیرات پیدا کرنا چاہتا تھا۔

ڈلہاوزی کی تدابیر

برطانوی حکومت سہولت کے ساتھ وقت کا انتظار کرتی تھی دارا بخت وہ اخیر شہزادہ تھا جو مغلیہ خاندان کی حکمرانی کے زمانہ میں پیدا ہوا تھا اُسے خیال تھا کہ دہلی کی بادشاہت کا مالک ہوں گا، اس وقت ان اُمیدوں اور آرزوں کے مٹانے میں بڑی دقت ہوتی، فخرالدین ایک وظیفہ خوار پیدا ہوا تھا اسے اس وقت کی یاد نہ تھی جبکہ دہلی کا بادشاہ تخت پر بیٹھتا، اور وہ اس وقت تک ہندوستان میں سب سے زبردست اقتدار رکھتا تھا برطانوی حکومت کے اغراض و مصالح کے خلاف یوں تو بہت سی باتیں قابل اصلاح تھیں، لیکن دو مسائل بہت اہمیت رکھتے تھے، خاندان مغلیہ میں لقب "شاہ" کا استقلال، اور شاہی محل پر ان کا قبضہ۔ لارڈ ڈلہاوزی ان مسائل کی اہمیت سے ناواقف نہ تھا وہ چاہتا تھا کہ بہادر شاہ کے بعد "شاہ" کا خطاب اس خاندان میں باقی نہ رہے، اور شاہی محل پر انگریزوں کا تصرف ہو جاے۔

Marfat.com

لارڈ ڈلہاوزی نے اپنے دورِ حکومت ہی میں "عدالت رہنمایان کی مجلس مخفیہ" کو لکھا کہ اب ضرورت ہے کہ حکومت کی طرف سے ایسے احکام جاری ہوں جن کے ماتحت موجودہ بادشاہ کے بعد اس کے جانشین کو شاہ کا لقب اختیار کرنے کا حق نہ رہے دوسرا حکم ان کے نقل مکان کے متعلق ہونا چاہیئے، ڈلہاوزی کی تجویز تھی کہ شاہی خاندان اب "قطب" میں جا رہے، اور شاہی محل پر انگریزوں کا قبضہ ہو، اگر بادشاہ ان تجاویز کو نہ مانیں تو وظیفہ بند کر دیا جائے، ان تجاویز پر دلچسپ مباحث ہوئے۔ بورڈ نے ڈلہاوزی کے نظریات کی تائید کی، لیکن "مجلس رہنمایان" نے اختلاف کیا اور بتایا کہ یہ تجاویز صرف گورنر جنرل نے ارسال کی ہیں، مجلس شوریٰ کی رائیں اس پر ثبت نہیں، بورڈ نے جواب دیا کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بورڈ نے دکھلایا کہ گورنر جنرل لکھتا ہے کہ ہر چند خاندان تیموریہ سے کوئی خدشہ نہیں لیکن جب مسلمان باشندے جوش میں آکر برطانوی اقتدار کو صدمہ پہونچانا چاہیں تو ان کے لئے اسباب موجود ہیں، ایک بادشاہ ہے ایک مستحکم قلعہ ہے، اس رد و کد کا نتیجہ یہ ہوا کہ بورڈ نے آخری فیصلہ یہ کیا کہ قلعہ سے شاہی خاندان کا اخراج مستحسن نہیں، لارڈ ڈلہاوزی کو یہ خط ابتدائے موسم بہار ۱۸۵۰ء میں موصول ہوا، خط پانے کے بعد اس نے لکھا کہ ہر چند میرا سیاسی عقیدہ ان مرسلہ نظریات کے متعلق پہلے بھی وہی تھا اور اب بھی ہے لیکن جب انگلستان کے ارباب حل و عقد نے جن کے خیالات کو ہندوستانی سیاسیات کے متعلق بہت اہمیت ہے، اپنی تشویش اور خطرہ کا اظہار کیا ہے۔ تو یہ تجویز ابھی عمل میں نہیں لائی جاویگی۔

Marfat.com

محل کی ریشہ دوانیاں بادشاہ نے شاہزادہ فخرالدین کی جانشینی کے متعلق احتجاج کیا، اپنی بیوی زینت محل کے زیر اثر اُنھوں نے اُس کے لڑکے کے لئے جو اس وقت گیارہ سال کا ایک بچہ تھا جانشینی کی رائے ظاہر کی، بادشاہ نے جو اسباب عذر پیش کئے تھے ان میں ایک نہایت دلچسپ عذر یہ تھا کہ شاہزادہ فخرالدین مختون تھا، اس لئے خاندان تیموریہ کی روایت کے مطابق کہ کوئی شخص جس کا کوئی عضو کٹا ہو تخت نشین نہیں ہوسکتا، فخرالدین سلطنت کا حقدار نہیں، ہمایوں کے وقت تک سلاطین مغلیہ مختون تھے، لیکن یہ رسم بعد میں منقطع ہوگئی، بعض جسمانی علت کے اعتبار سے فخرالدین کے ساتھ یہ استثنیٰ تھا اور زینت محل کو ایک بہانہ مل گیا. جانشینی کے سوال کے متعلق انگریزی ماہرین سیاست کا یہ متفقہ فیصلہ ہوگیا کہ بادشاہ کی حیات تک تمام امور غیر متغیر رہیں، شاہزادہ فخرالدین نائب بادشاہ متصور ہو، لیکن اس کے حریف مقابل سے اگر یہ فایدہ حاصل ہو کہ وہ شاہی محل کو چھوڑ کر قطب میں جارہے، تو موقعہ ہاتھ سے نہ دیا جائے اگرچہ وظیفہ میں اضافہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے.

برطانوی حکومت اور فخرالدین سے معاہدہ سرکاری ہدایات کے مطابق دہلی کا ایجنٹ سر ٹامس مٹکاف نے شہزادہ فخرالدین سے خفیہ ملاقات کی اور اُن کے سامنے یہ تجویز پیش ہوئی کہ اگر وہ ایک عہدنامہ کے ذریعہ اس امر پر راضی ہو جائے کہ بادشاہ کا جانشین ہونے کے بعد شاہی محل سے دست بردار ہو کر قطب میں اپنا مقام سکونت منتقل کر دے گا تو انگریز جانشینی کے مسئلہ میں اسکی طرفداری

Marfat.com

کرینگے، شہزادہ نے یہ تجویز منظور کرلی، ایک عہدنامہ مرتب ہوا، شہزادہ نے اس پر دستخط کیا لوگوں کی شہادتیں ثبت ہوئیں، جب یہ خبر قلعہ میں پہونچی تو لوگ بہت متاثر ہوئے اور خصوصیت کے ساتھ ملکہ زینت محل کو زیادہ رنج ہوا۔

فخرالدین کی ناگہانی وفات

۱۰ر جولائی ۱۸۵۶ء میں فخرالدین نے مرض استفراغ سے اچانک انتقال کیا۔ قرائن بتاتے ہیں انہیں زہر دیا گیا، شاہی حکیم احسان اللہ کو بلایا گیا لیکن وہ نہ آسکے یا اُنھوں نے آنے میں حیلہ حوالہ کیا، نتائج سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ رات ملکہ زینت محل کے کمروں میں کس طرح بسر ہوئی ہوگی، یقیناً یہ رات ریشہ دوانی اور عمل سازی کی رات ہوگی۔ دوسرے دن سرٹامس مٹکاف ملنے آیا تو بادشاہ نے ایک رقعہ دیا جس میں شہزادہ جواں بخت کی جانشینی کے متعلق حکومت سے استرضا کیا گیا تھا، اس میں بادشاہ کے دوسرے لڑکوں کے دستخط بھی مندرج تھے اس کا خلاصہ یہ تھا کہ زینت محل کا لڑکا جواں بخت، عقل خوبی علم اور عادات وخصایل کے اعتبار سے بادشاہ کا جانشین بننے کا مستحق ہے اس میں شاہی خاندان کے شاہزادوں کی مہر تھی، لیکن دوسرے دن مرزا قریش بڑے لڑکے نے حکومت برطانیہ میں ایک یادداشت (میموریل) بھیجی کہ بادشاہ نے شاہزادوں کو لالچ دلائی تھی کہ اگر وہ دستخط کریں گے تو اُن کا وظیفہ بڑھا دیا جائے گا، ورنہ بند کردیا جاویگا، بادشاہ نے مرزا قریش کو بھی کچھ دیکر راضی کرلینا چاہا، مرزا نے ایک مطیع اولاد کی حیثیت سے بادشاہ کے ان تمام خواہشات کو قبول کرنا چاہا اگر وہ اسے جانشین

Marfat.com

مقرر کریں لیکن جب اُس نے دیکھا کہ زینت محل کے اغوا سے بادشاہ تلے ہوئے ہیں کہ اسے جانشینی سے محروم کر دیں تو اُس نے حکومت برطانیہ میں ایک یادداشت بھیجی، اور دکھلایا کہ میں سب سے بڑا ہوں، میں نے حج کیا ہے، حافظ قرآن ہوں، اور ملاقات کے وقت میری بقیہ استعداد معلوم ہو سکتی ہے۔

لارڈ کیننگ کے نظریات سیاسی

لارڈ ڈلہاوزی نے جو سیاسی طرزِ عمل اختیار کیا تھا، نہایت مدبرانہ تھا ہر چند ان کا یہ عقیدہ غلط تھا کہ دہلی کے مسلمان خاندان تیموریہ سے کوئی قلبی علاقہ نہیں رکھتے اور ان کا یہ بھی خیال غلط تھا کہ اگر شاہی خاندان کو شاہی محل سے قطب میں منتقل کر دیا جائے تو مسلمان غیر متاثر رہیں گے لیکن ان پر آفرین ہے کہ اُنھوں نے باوجود اقتدار، اپنے نظریات سیاسی کو، جب ان سے بالا دست ارباب حل و عقد نے اختلاف کیا تو جامۂ عمل نہیں پہنایا۔ لارڈ کیننگ نے خیال کیا کہ قلعہ کا خاندان تیموریہ کے قبضہ میں رہنا نہایت خطرناک ہے، اسے برطانیہ کے قبضہ میں رہنا چاہیئے جس میں سپاہ اور آلات حرب کا ذخیرہ جمع رہے، چونکہ لارڈ کیننگ کو ہندوستان میں آئے ہوئے ابھی چند ماہ گزرے تھے اور وہ بھی کلکتہ میں، لہٰذا وہ مسلمانان دہلی کے احساسات سے ناواقف تھے، بنا بریں اُنھوں نے خیال ظاہر کیا کہ بتدریج دہلی کے "تمغہ بادشاہت" سے تمام اختیارات سلب کر لئے گئے، تو "شاہ" کا لقب بھی چھین کر کیوں نہ خاندان تیموریہ کی شاہانہ عظمت کا خاتمہ کر دیا جائے، اس نے مرزا قریش کی جانشینی کے لئے مجلس ارباب حل و عقد سے

Marfat.com

سفارش کی، کاؤنسل نے گورنر جنرل کے مراسلہ پر غور و فکر کرنے کے بعد مفصلہ ذیل ہدایات ارسال کیں۔

(۱) دہلی ایجنٹ کے ذریعہ بادشاہ کو یہ جواب دیا جائے کہ گورنر جنرل مرزا جوان بخت کی جانشینی قبول نہیں کر سکتا۔

(۲) مرزا قریش کو بھی یہ امید نہیں رکھنی چاہئے کہ ان کی جانشینی ان شرائط پر منظور کی جائیگی جن پر مرزا فخرالدین سے معاہدہ ہوا تھا اور یہ کہ مسئلہ جانشینی کے متعلق بادشاہ کی زندگی تک حکومت کے ساتھ کوئی نامہ و پیام نہ ہوگا۔

(۳) بادشاہ کی وفات کے بعد مرزا قریش جانشین ہوں گے، اور ان کے ساتھ وہی شرائط ملحوظ رہیں گی جو فخرالدین کے ساتھ تھیں لیکن انہیں بادشاہ کے لقب کے بجائے "شاہزادہ"، کا لقب اختیار کرنا ہوگا، ساتھ ہی یہ بھی تحریری اقرار یا معاہدہ کی صورت میں نہیں پیش کیا جائے، بلکہ یہ کہا جائے کہ حکومت کا یہ ارادہ ہے کہ ایسا ہی ہو۔

(۴) محل کے ان افراد کی ایک فہرست مانگی جائے، جنھیں وظیفہ دیا جاتا ہے، اور یہ کہ وظیفہ کہاں تک محدود رہے گا، بیٹے اور پوتے تک؛ لیکن کسی بادشاہ کے دور کے رشتہ دار اس کے مستحق نہ ہوں گے۔

(۵) مقررہ وظیفہ میں سے پندرہ ہزار سالانہ شاہی خاندان کے وارث کو ملے گا۔

زینت محل کی خفیہ کارروائیاں | بادشاہ اپنی زندگی کی بقیہ گھڑیاں اطمینان

Marfat.com

اور امن سے گزار دیتا۔ لیکن ملکہ زینت محل کی ریشہ دوانی نے اسے بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اس نے کبھی یہ اُمید منقطع نہیں کی کہ میرا لڑکا دہلی کا بادشاہ ہوگا ایک پردہ حایل تھا وہ موت سے دور ہوگیا دوسرا بھی اسی طرح دور ہوجاویگا اگر حکومت برطانیہ نے جواں بخت کی جانشینی کو تسلیم نہیں کیا تو دوسری زبردست قوتوں سے استمداد کیا جائے۔ بادشاہ کو اس میں اغماض نہ تھا کہ وہ شاہی محل کو چھوڑدے اور نہ اسے اپنے جانشین کے فواید سے چنداں دلچسپی تھی، جیسا کہ بادشاہ کے مقدمہ میں حکیم احسان اللہ کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے لیکن زینت محل کی ریشہ دوانیوں نے اُسے روکا، جب فخرالدین نے شاہی محل کو چھوڑ دینے کی شرط پر دستخط کردیئے تو باوجود اس کے کہ وہ اس "نائب بادشاہ" سے نفرت رکھتی تھی لیکن اُس نے شور وشغب برپا کیا۔ وہ جانتی تھی کہ فخرالدین کوئی غیرفانی ہستی تو ہے نہیں؛ اس عرصہ میں وہ شاہزادہ جس کے اندر انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ پرورش ہورہا تھا، وہ انگریز رعایا کے سامنے بھی یہ کہنے سے باز نہیں آتا تھا کہ میں تھوڑے عرصہ میں انگریز قوم کو اپنے قدموں کے سامنے جھکا ہوا دیکھوں گا۔ مسز فلیمنگ ایک انگریز سرجنٹ کی بیوی قلعہ میں گئی تھی، اُس کی لڑکی مسز ایسکلی بھی اس کے ساتھ تھی جواں بخت نے اس لڑکی کے سامنے بھی انگریزوں کے مقابلہ میں اپنی فتح ونصرت کا نغمہ گایا لڑکی نے ماں سے شکایت کی کہ یہ نوعمر بدمعاش اس قسم کے خیالات ظاہر کرتا ہے اس پر انگریز خاتون نے کہا کہ اگر تمہارے خیالات ایسے ہیں تو سب سے پہلے تمہاری گردن ماری جاویگی، شاہزادہ جواں بخت اس قسم کے خیالات اکثر عورتوں کی

Marfat.com

محلوں میں ظاہر کیا کرتا تھا، اور جب سرجنٹ کی بیوی نے خشمگیں لہجہ میں اسے یہ جواب دیا تو کہنے لگا کہ اہل ایران آرہے ہیں ماں بیٹی کو ہم لوگ قلعہ میں پناہ دینگے، اور اسی طرح اکثر باتیں بنا دیا کرتا محلسرا میں اسے اپنی ماں سے یہی تعلیم مل رہی تھی، اور انھیں احساسات کے ساتھ نشو ونما پا رہا تھا۔

ہر چند دہلی یا اس کے باہر مسلمانوں کو اس سے دلچسپی نہیں تھی کہ کون شاہزادہ جانشین ہوگا لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اہل محل کی پیہم کوششیں جاری تھیں کہ مسلمانوں میں یہ خیال پیدا کریں کہ عالم غیب سے کوئی ایسا آدمی پیدا ہونے والا ہے، جو خاندان دہلی کی زوال پذیر حکومت کو پھر برسر عروج لا دیگا، اور ہندوستان کے مسلمانوں کو پھر وہ دولت اور عزت حاصل ہوگی جس سے انگریزوں کے غصب کے باعث وہ محروم ہو گئے ہیں۔

احساسات دہلی | دہلی میں اخبارات نے پیشین گوئی کرنی شروع کی کہ ایک بہت بڑا انقلاب رونما ہونے والا ہے جس سے انگریزی سیاسیات کو نقصان پہونچے گا، اہل فارس ہندوستان پر حملہ آور ہوں گے، ایک مرتبہ شور ہوا کہ ایرانی اٹک تک آ چکے ہیں دوسری خبر یہ پھیلی کہ ایرانی فوج درہ بولن کو طے کرتی ہوئی آرہی ہے، اور اس حملہ کی توجیہ یہ کی گئی کہ شاہ فارس پانچ پشت سے فوج اور سامان حرب جمع کر رہا تھا تاکہ ہندوستان کو فتح کرے زار روس شاہ کا ساتھ دے گا اور تقریباً پچاس ہزار روسی فوج مع سامان حرب اہل فارس کی مدد کے لئے پہونچ گئی ہے، اور اگر یہ فوج کافی نہیں ثابت ہوئی تو روس سے مزید کمک آ دیگی، اس صورت حال میں، ترکی، اور فرانس کا طرز عمل ظاہر ہے، وہ بھی

Marfat.com

شاہ کا ساتھ دینگے، بعض اخبارات کا یہ نظریہ تھا کہ دوست محمد خاں امیر کابل ہرچند انگریزوں کا وظیفہ خوار اور ظاہری دوست ہے۔ لیکن وہ بھی دونوں طریق عمل اختیار کریگا کفار سے معرکہ آرائی اور فارس کے ساتھ قسمت آزمائی۔ بازار، گلی کوچہ دوکان اور شاہی محل تمام مقامات میں ایک سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ شہر ہیبت و استعجاب کا ایک مجسمہ بنا ہوا تھا اور شاہ نعمت اللہؒ کی اس پیشین گوئی نے اور بھی اس سنسنی خیز خبر کو مستحکم کر دیا تھا کہ ایک سو برس کے بعد انگریزوں کو زوال ہوگا اور ایک مقامی خاندان برسر اقتدار ہووے گا۔ ۱

بادشاہ اور شاہ فارس کے سیاسی تعلقات کے متعلق ایک مقامی نامہ نگار نے ۶ مارچ ۱۸۵۷ء میں شمالی مغربی صوبجات کے لفٹنٹ گورنر کو اطلاع دی کہ شاہی محل اور خصوصیت کے ساتھ بادشاہ کے خاص کمروں میں۔ شبانہ روز اہل فارس کی آمد کا چرچا رہتا ہے حسن عسکری نامی ایک شخص تھا اس کے خاندان میں پیری مریدی کا سلسلہ تھا، شاہی محل کے دہلی دروازہ کے نزدیک اس کا مکان تھا۔ ایرانی حکومت کے ساتھ سیاسی تعلق کرنے کے لئے یہ شخص ہمیشہ مستعد رہا کرتا تھا اس نے بادشاہ کو متاثر کر لیا کہ اسے کشف کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ ایرانی حکومت، دہلی بلکہ تمام ہندوستان میں وسیع ہو جاویگی اور دہلی کی بادشاہت کو از سر نو عروج ہوگا کیونکہ شاہ فارس پھر دہلی حکومت کو تاج و تخت عطا کر دیگا تمام اہل محل خصوصیت کے ساتھ بادشاہ بہت مسرور ہیں یہاں تک کہ اس کے لئے نماز پڑھی جاتی ہے حسن عسکری غروب آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل روزانہ عمل اور ریاضت کیا کرتا ہے تاکہ اہل فارس جلد آویں اور انگریزوں کو نکالیں۔ لفٹنٹ گورنر جنرل کالون نے جب یہ خط بھیجا

Marfat.com

تو مضحکہ اور حقارت سے دیکھ کر بے توجہی کے ساتھ اسے ڈال دیا اُس نے واقعہ کی اہمیت پر نظر
نہیں ڈالی، ہر چند شاہ فارس کے ساتھ شاہ دہلی کا سیاسی تعلق ہو یا نہ ہو شمالی ہند کے مسلمانوں
کا خیال تھا کہ یہ خبر صحیح ہے، لیکن اس خبر سے عام باشندوں میں جو سنسنی اور احساس پیدا ہو رہا
تھا وہ نہایت اہم تھا انگریز مدبرین کا یہ نقص تھا کہ وہ اپنے اندران لوگوں کے وجدان کا صحیح
اندازہ لگانے کی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ جو ان کے ارد گرد رہتے تھے بادشاہ اور شاہ
فارس کے نامہ و پیام کا قصہ محض کہانی نہیں تھا، ہر چند اس کے متعلق صحیح واقعات نہیں ملتے
کہ کوئی صحیح نتیجہ نکالا جا سکے لیکن بہادر شاہ کے مقدمہ میں جو گواہ گزرے ان میں سب سے معتبر گواہ
احسان اللہ شاہی حکیم کی روایت یہ ہے کہ بادشاہ نے خواہ اپنے ذاتی خیال کی بنا پر یا اپنے
بعض رشتہ داروں کی تحریک سے جو اودھ میں سکونت رکھتے تھے، شیعہ مذہب اختیار کرنا چا
مرزا حیدر جو بادشاہ کا بھتیجہ، اور اودھ میں سکونت رکھتا تھا دہلی میں آیا اور جب واپس گیا تو یہ
خبر شائع کی کہ بہت تغیر ہو گیا ہے۔ مغل بھی شیعہ مذہب اختیار کرنا چاہتے ہیں ممکن ہے بادشاہ
کو یہ ترغیب دی گئی ہو کہ ان کے تبدیل مذہب کی خبر سے بادشاہ اودھ اور شاہ فارس ا
بھی بر ضا و رغبت مدد کریں گے چونکہ بادشاہ جانشینی کے متعلق اپنی بیوی کی خواہش پوری نہ
کر سکتا تھا لہذا ممکن ہے اس نے یہ پہلو اختیار کیا ہو کہا جاتا ہے کہ اس نے شاہ فارس کو اپنے معتمد
کارپردازوں کے ذریعہ خطوط لکھے، شبہ ہے کہ اس نے زار روس کو بھی خطوط لکھے لیکن یہ پہنچے نہیں
اسی طرح ایک دن دہلی جامع مسجد کے دروازہ پر ایک اشتہار چسپاں تھا جس کا خلا
یہ ہے کہ شاہ فارس نے مسلمانان ہند کو خطاب کیا ہے کہ ایک ایرانی فوج آ رہی ہے، اور

Marfat.com

ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس فوج سے بازو ملا کر کفار کے مقابلہ میں جنگ کریں معلن کا نام محمد صادق تھا لیکن پتہ نہیں لگا کہ یہ محمد صادق ہے کون شخص عوام پر اسکا کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ چسپاں ہونے کے چند ساعت کے بعد پھاڑ دیا گیا، لیکن مقامی اخباروں نے اس اشتہار کا خلاصہ شائع کر دیا، بہادر شاہ نے ابتدائے موسم بہار ۱۸۵۷ء میں کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا، بلکہ ان کے نام سے لوگوں نے شور و فتنہ برپا کیا جس کا خمیازہ انھیں اٹھانا پڑا، مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ کے اندر سپاہیوں میں بڑا جوش و خروش پیدا ہوا اور دہلی کے ملکی افسروں کو دعوت دی گئی کہ وہ آنے والی کشمکش میں حصہ لیں۔

اس کے بعد سیاسیات ہند میں وہ نازک حالتیں پیدا ہوگئیں جنھوں نے مغل خاندان کو "قطب" کی بجائے ہندوستان کے مختلف مقامات میں "جزوِ منتشر" بنا دیا، اور اب نہ تو شاہی محل کے خالی کرنے کا کوئی سوال باقی رہا اور نہ کسی شاہزادہ سے "شاہ" کے ترک لقب کے لئے عہدنامہ کی ضرورت، خاندان مغل کا یہ بدقسمت فرمانروا ایک ملزم کی حیثیت سے برطانوی عدالت میں پیش ہوا، اور اسے رنگون میں زندگی کی بقیہ تکلیف دہ ساعتیں تمام کرنی پڑیں، غالب مرحوم اس وقت زندہ تھے غالباً طلسم ہستی کے اسی دردانگیز منظر کو دیکھ کر انھوں نے کہا تھا ؎

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

Marfat.com

دولتِ خلجیہ کا آخری نظّارہ

عہدِ شباب کی معصیت کوشیاں، پیری کی بیچارگی و ناتوانی صحت کی عشرت پسندیاں، مرض کی درماندگی، امیری کا نشہ، غریبی کی حسرتیں، جاہ و مراتب کا غرور، حقارت و ذلت کا ملال، الغرض دورِ حیات کے تمام مراتب ایک چیتاں بن کر رہ جاتے ہیں اور دنیا کا ہر ذوقِ سلیم رکھنے والا دماغ اس کارگاہ ہستی کے مختلف اور متضاد نمایش ضناعانہ پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے، کہ آیا زندگی کا تعمیری پہلو بہتر اور خوشگوار ہے، یا تخریبی؟ انسان کی تمدنی روش، معاشرانہ نظام، اور پرستارانہ طلب و جستجو سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کا تمام ظاہری سامان نشاط اور ان کا حصول ہی زندگی کا نصب العین ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس طرح حیات کا "تعمیری پہلو" اپنے اندر جاذبیت کا سامان رکھتا ہے، اس سے "تخریبی پہلو" کسی طرح کم نہیں، فرق صرف یہ ہے کہ پہلا عوام کو دھوکے میں ڈالتا ہے اور دوسرا خاص کو حقیقت تک پہنچاتا ہے۔ صوفی ادبیات دیکھئے، زوال دول کے افسانے پڑھئے۔ جانے دیجئے، ان دونوں کو۔ ہر ترقی کے آخری نتیجہ، اور تنوداد تعا کے آخری مرحلے پر غور کیجئے، جمالیات کو شباب تک محدود نہ رکھئے، بلکہ اسے آخری منزل میں مشاہدہ کیجئے جہاں ناحقیقت

Marfat.com

شناس افراد "لذت نظر" کو "جراحت ہستی" بنا کر چھوڑ دیتے ہیں، اور ان کا تمام نالۂ وبکا ان کی تمام وارفتگی دخیرہ سری، ان کا تمام جوش و ولولہ صرف زحمت تیسح و مرقع کھینچنے والے اور بے اثر طریق طلب کے لئے وقف ہو جاتا ہے، اگر جمالیات کا وجود ہے تو اسے صرف جسم و مادہ ہی تک کیوں محدود رکھا جائے؟ یا پھر ہم اسے ظاہری خط و خال اور عامیانہ لطافت و پاکیزگی کیوں سمجھیں؟ کیوں نہیں رومی کی طرح مادہ اور جسمانیات کی دنیا سے ایک بلند تر سطح پر پہنچکر اس حقیقت کو تسلیم کریں۔

بہ عذار جاں نگر کہ خوش و خوشگوار باد
بہ عذار جسم منگر کہ بپوسد و بریزد

جب ہر ترقی کا آخری نتیجہ تنزل ہے، جب نشو و ارتقا کی ایک ایسی منزل بھی ہے جہاں اوراق وجود کا بکھر جانا ناگزیر ہے تو پھر اس چند روزہ لطف کو شباب کی کورانہ فکر و عقاید، اور پیری کے افسردہ ذکر و شغل میں کیوں ضائع کیا جائے، کیوں نہیں ہم ایک تیسرا راستہ قائم کریں جو دونوں سے ممتاز اور شکوہ، "حسرت حاصل" سے پاک ہو تاریخ اور آثار اپنے اوراق میں ایسی بیشمار داستانیں پوشیدہ رکھتے ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد انسان کی تمام حوصلہ آزمائیاں افسردہ ہو کر رہ جاتی ہیں اور وہ حیات کے اس عجیب و غریب فلسفہ پر غور کرنے لگتا ہے کہ ہر رفعت پستی کی طرف کیوں آتی ہے، ہر عروج کو زوال کیوں ہوا کرتا ہے؟ مانا ایک قوم فلسفہ حیات کی گہرائیوں تک نہیں پہنچتی، یہ اس کی لاعلمی اور ناتجربہ کاری تھی، لیکن جب دوسروں کے اسباب زوال میرے پیش نظر ہوتے ہیں تو ہم متنبہ کیوں نہیں ہوتے؟ ہم بے اختیارانہ نکبت کی طرف کیوں کھنچے

Marfat.com

چلے جاتے ہیں، یہ خیالات ہیں جو قدرتی طور پر حکومتوں کے قیام و انحطاط، اور خاندانوں کے بننے بگڑنے کا حسرت اندوز نظارہ کرنے کے بعد دماغ میں پیدا ہوتے ہیں اور درد و رقت کی پذیرائی میں انسان مادیات کی دُنیا سے ایسی بلند روحانی سطح پر پہنچ جاتا ہے، جہاں وہ ایک فلسفی کی طرح اپنی خودی اور انانیت (Egoism) فراموش کر بیٹھتا ہے، اس کی اُلجھنیں بڑھنے لگتی ہیں، اور شوق جستجو بیتاب ہو جاتا ہے، اب اسکے نزدیک فقر و دولت، ذلت و اعزاز، وصل و فراق، ترقی و تنزل بلکہ موت و حیات میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ آپ ڈاکٹر زکی مبارک کی کتاب "مدامع العشاق" دیکھئے، شعرائے معلقات کی خرابہ نشینوں، اور اُنکی درد پذیریوں کے حالات پڑھئے، آپ عربی شعرا کے "بکار ممالک" کا مطالعہ کیجئے، بحتری چوتھی صدی کا ایک مشہور عربی شاعر ایوان کسریٰ میں پہنچتا ہے، اس کے محراب اور ستونوں کا طواف کرتا ہے، اور کچھ اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ والہانہ انداز میں کہہ بیٹھتا ہے ؎

لَوْ تَرَاہُ عَلِمْتَ اَنَّ اللَّیَالِی ۔۔۔ جَعَلَتْ فِیْہِ مَاتَمًا بَعْدَ عُرْسٍ

(ترجمہ) اگر تم دیکھو تو معلوم ہوگا کہ رات (لیالی ؟ لیلیٰ !) نے اس کے اندر شادی کے بعد ماتم برپا کر رکھا ہے[1]

---

[1] پہلے میرا خیال تھا کہ خاقانی نے اپنے "ایوان مداین" کے فاجعہ (Tragedy) میں معلقات بعد کے ابتدائی اشعار سے مدد لی ہے (دیکھو نگار بابتہ جولائی ۱۹۳۰ء) لیکن ڈاکٹر زکی مبارک کی جدید تصنیف "موازنہ بین الشعراء" میں بحتری کے وہ تمام عربی اشعار درج ہیں جو ایوان کسریٰ کی تباہی کے متعلق ہیں اسی طرح عہد آخر کے مشہور شاعر شوقی کا "بکار اندلس" بھی نہایت تاثر انگیز ہے (بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ پر)

Marfat.com

اسی طرح عہد آخری کا ایک مصری شاعر "شوقی" قصر الحمراء کے کھنڈروں میں پہنچتا ہے اور اپنی عربی شاعری کے ایک نہایت دلگداز انشا میں قصر شکستہ کے نقوش عبرت پیش کرتا ہے اس کے بعد قصر ویران کے وحوش و طیور، گل و نسرین باغ و حوض کا تذکرہ کرتا ہے، اور رقت آمیز لہجہ میں کہتا ہے ؎

مشت الحادثات فی غرف الحمراء مشی النعی فی دار عرس

(ترجمہ) قصر حمراء کے بالا خانوں میں حوادث زمانہ اس طرح آئے جس طرح شادی بیاہ کے گھر میں کوئی موت کی خبر لاتا ہے۔

اسلامی تاریخ میں یوں تو بہتیرے خاندانوں کے علو و حضیض، استقلال و اضمحلال کے دردانگیز واقعات ملتے ہیں یہ ہستی کا زبردست اور ناگزیر کلیہ ہے کہ جو بنا ہے وہ ایک دن

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) بحتری کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ خاقانی نے "معلقات" کی بجائے اسی سے بڑی حد تک استفادہ کیا ہے، ڈاکٹر زکی مبارک نے پُرزور دلیل سے ثابت کیا ہے کہ نزول قرآن کے قبل شعرائے عرب کے خیالات میں دردپذیری یا عبرت آموزی کے جو احساسات ہیں وہ محض فردیت (یا Individual) کا نتیجہ ہیں اس وقت تک ان میں اجتماعی محاسن نہیں تھے لیکن قرآن مجید نے مختلف قوموں کی ترقی و تنزل کے عبرت آموز واقعات بتائے۔ اس کے بعد شعرائے عرب کے یہاں "بکار مالک" شاعرانہ خیالات کا موضوع مقرر ہو گیا یوں تو جاہلی شعرا نے بھی اپنے محبوب کے اُجڑے دیار کے خوب خوب نقوش پیش کئے ہیں لیکن اس موضوع کا تعلق اجتماع سے نہیں بلکہ انفرادی خیالات تھے، چنانچہ جاہلی شعرا کے متعلق ڈاکٹر زکی مبارک لکھتا ہے:-

کانت عواطف الشعراء عواطف فردیة لا اجتماعیة

Marfat.com

ضرور بگڑے گا لیکن جس طرح ترقی کی مختلف صورتیں ہوا کی ہیں اسی طرح تنزل کے بھی علیحدہ اسباب اور بربادی کے مختلف زینے ہوئے ہیں۔ امویوں کی حکومت مشرق میں (۴۱ھ سے ۱۲۷ھ) تقریبًا ایک صدی اور ہسپانیہ میں (۱۳۸ھ سے ۴۱۶ھ) تقریبًا تین صدیاں تک قائم رہی، لیکن جب بُرے دن آئے تو مشرقی سلطنت کا حکمراں مروان الحمار دشمنوں کے خوف سے بھاگ کر ایک کنشت میں پناہ لیتا ہے، اعدا تعاقب کرتے ہیں اور وہیں اسکا سر کاٹ لیا جاتا ہے۔ ہسپانیہ کی سلطنت طوائف الملوکی خانہ جنگیوں، اور نسلی امتیازات میں ہاتھ سے گئی، اپنے غیر ہوتے گئے، دشمنوں کو زور ملتا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ساری قوم اس طرح بے عزتی سے نکالی گئی جس طرح دنیا میں مسلمان کہیں سے نہ نکلے۔ اگر مسلمانوں کی کہیں اجتماعی اور قومی تذلیل ہوئی تو وہ صرف ہسپانیہ ہے، یوں تو دنیا کے مختلف حصوں میں اُنھوں نے حکومتیں قائم کیں، بنے بھی، بگڑے بھی لیکن جمہوریت اسلامیہ اور قومیت مسلمہ کو کوئی عالمگیر نقصان نہ پہنچا زیادہ سے زیادہ ایک برسر اقتدار خاندان برباد ہوا، اُسے اپنی عشرت پسندیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑا، لیکن قومیت، اجتماع، اور مذہب کے اعتبار سے مسلمان مفتوح ہو جانے کے بعد بھی اس سرزمین میں عزت کے ساتھ زندگی گذارتے رہے، اسی طرح بنی عباسیہ کو لیجئے، تاریخ اسلامیہ کے تمام صفحات کا بغور مطالعہ کر جایئے آپ کو بنی عباسیہ کی طرح مستقل اور طویل زمانہ حکومت کا کہیں نشان نہیں ملیگا اُنھوں نے بغداد میں (۱۳۲ھ سے ۶۵۶ھ) پانچ صدیوں تک قاہرہ میں دو صدیوں سے زیادہ حکومت کی، لیکن جب ان کا زمانہ ادبار آیا، تو خدا نے مغلوں کو ان پر مسلط کیا، اُنھوں

Marfat.com

نے اپنی ہیبت اور دہشت، اپنے اندھے جوش اور فتح اور بڑھتے ہوئے حوصلہ غارتگری میں خاندان عباسیہ کو جس طرح برباد کیا اُسے پڑھ کر تاریخ کا مطالعہ کرنے والے آج بھی نہایت متاثر ہوتے ہیں۔ ہلاکو باوجود عہد امان خاندان عباسیہ کے اس آخری نام لیوا خلیفہ المعتصم اور اس کے عزیزوں کو قتل کر دیتا ہے، تمدنی لطائف اور علمی کارنامے برباد ہوتے ہیں، دریائے دجلہ کوسوں تک نوع انسانی کے خون سے رنگین ہو جاتا ہے، علمائے یونان، اسکندریہ وعرب کی تحقیقات یا تو دریا کی نذر ہوتے ہیں، یا شعلہ ملتہب کی، بنی فاطمہ اُٹھے اُنھوں نے بھی (۲۹۷ھ سے ۵۵۵ھ) ڈھائی سو صدیوں تک حکومت کی، وہ بھی مٹ گئے، آل سامان (۲۶۱ھ سے ۳۹۵ھ) نے ۱۳۴ سال اور غزنوی خاندان نے ۳۶۶ھ سے ۵۵۵ھ تک حکومت کی لیکن غوریوں کا دور دورہ شروع ہوا تو انھیں ان کے لئے حکومت سے دست بردار ہونا پڑا، ہندوستان میں ۵۸۹ھ سے ۱۲۵۳ھ (عہد ظفر) ۶۶۴ سال تک غلام، خلجی، تغلق، سید، لودھی، سور، مغل، سات خاندانوں نے حکومت کی، اس میں شک نہیں سات سو سال کے اس طویل زمانے میں ہندوستان کی اسلامی حکومتوں میں بہت سے انقلابات ہوتے رہے، تیمور کا طنطنہ اسکندری، نادر شاہ کا فاتحہ سیلاب، احمد شاہ ابدالی کے حوصلے، اپنے اپنے زمانہ میں تمدن اور انسانیت کو تسرا کر نسیا منسیا ہو گئے، ایک خاندان نے دوسرے خاندان کے دامن تربیت میں جوان ہو کر اخلاق اور انسانیت کا جو خون کیا ہے تاریخ کا کوئی نادر واقعہ نہیں، اس میں شک نہیں حکومت مغلیہ کی بربادی سے ہندوستان کے مسلمان بہت

Marfat.com

زیادہ متاثر ہوئے اور ابھی صدیاں باقی ہیں، جبکہ یہ جراحت مندمل ہو، لیکن خلجیہ کا عروج و زوال تاریخ کے طالب العلم کے سامنے انقلاب کا ایسا دلگداز نظارہ پیش کرتا ہے کہ جس کی نظیر بہت مشکل سے ملتی ہے۔

میں اس وقت یہ بحث چھیڑنا نہیں چاہتا کہ کن واقعات کے ماتحت جلال الدین خلجی نے غلام خاندان سے حکومت حاصل کی، اور نہ اس وقت خاندان خلجیہ کے اسباب عروج سے بحث کرنا چاہتا ہوں، بلکہ مجھے اپنے موضوع کے لحاظ سے صرف انکی حکومت کا وہ آخری منظر پیش کرنا ہے، جو "ان فی ذالک لعبرۃ" بن کر ہستی کا وہ روشن پہلو پیش کرتا ہے، جسے جہالت انسانی اپنی تعبیر ناقص میں افسوس کے ساتھ "زوال" سے موسوم کرتی ہے، حالانکہ میرے نزدیک یہ ہر کمال کا التزامی اور آخری نتیجہ ہے، اقبال کی یاوری اور بخت کی نگونساری دریا کے مد و جزر سے زیادہ اصلیت نہیں رکھتی، ہر فرد ہر خاندان اور ہر قوم کی زندگی دریا کی ایک لہر ہے، ترقی کو "مد" کہہ لیجئے تنزل کو جزر سمجھئے، اگر آپ دولت و مکنت رکھتے ہیں، اگر آپ میں حسن و جمال اور زور و توانائی ہے، تو نشہ میں نہ آیئے یاد کیجئے اُس ساعت کو جبکہ زندگی کی اس بڑھتی ہوئی لہر (مد) میں رجعت (جزر) ہوگی، اور آپ کو دولت کی بجائے فقر حسن کی جگہ بے رونقی اور طاقت کے بدلے ضعف و نقاہت گھیرے لے گی، وجوہ یومیذ باسرہ تظن ان یفعل بھا فاقرہ (بعض چہرے اس دن بے رونق ہوں گے گمان کرینگے کہ ان کے ساتھ کمر توڑنے والا معاملہ ہوگا) دولت خلجیہ کی بنیاد ہی اُس وقت پڑی تھی جبکہ اسکے بانیوں

Marfat.com

کو اس حقیقت سے بالکل بے حسی تھی۔ سنہ ۶۸۹ھ سے سنہ ۷۲۱ھ تک خلجیہ کی حکومت رہی، تقریباً ۳۲ سال کے اس قلیل عرصہ میں اُنھوں نے عروج وزوال کے وہ تماشے دیکھے کہ شاید اس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملیگی۔ کہاں علاؤالدین کی وہ سکندرانہ اولوالعزمی، وہ جلالت وسطوت، وہ فتح وظفر کہاں، اس کے دوسرے جانشین مبارک شاہ کی بربادی ناموس اور بے یارومددگار ہو کر خسروخاں جیسے ایک درباری کے ہاتھ سے قتل ہونا، اللہ اللہ، اس زمانہ ناساز گار پر کیا اعتماد کیا جائے اہل دنیا جو چاہیں اپنی جگہ فیصلہ کریں لیکن قدرت نے خلجیہ کے ساتھ انتقام لینے میں جس حوصلہ سے کام لیا ہے، وہ تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے سبق آموز ہے۔

دولت خلجیہ کا بانی جلال الدین خلجی، سلطان علاؤالدین کا حقیقی چچا تھا، اس نے بھتیجہ سے اپنی لڑکی بھی بیاہ دی تھی، اس پر سلطان اپنی خاص نظر التفات رکھتا تھا، لیکن جس جبلی ونارت سے کام لے کر علاؤالدین نے اپنے محسن نیک خصال اور محسن چچا کو مار ڈالا تاریخ کا بچہ بچہ جانتا ہے، بادشاہ کے مرنے کے بعد ملکہ جہاں نے اپنے چھوٹے لڑکے رکن الدین ابراہیم کو تخت پر بٹھادیا، مرحوم سلطان کا بڑا لڑکا ارکلیخاں جو سخاوت اور شجاعت میں مشہور تھا اور رعایا بھی اس کی گرویدہ تھی، اس وقت ملتان میں تھا اگر ملکہ جہاں بادشاہت کے لئے ارکلیخاں کا انتخاب کرتی تو یقیناً علاؤالدین کو حصول تخت میں دقتیں لاحق ہوتیں، آخر کار علاؤالدین اپنی سیاسی قابلیتوں، اور حربی خصوصیات کی بدولت دہلی پر حملہ کر کے تخت نشین ہوا، اور پھر خاندان جلالی کے ساتھ جو کچھ کیا اس سے جہالت اور

Marfat.com

بہیمیت شرما گئی۔

ملک نصرت خاں کوتوال کہ از دہلی تعین شدہ بود بہ الماس بیگ الغخاں رسیدہ در چشم پسران بادشاہ جلال الدین، فیروز شاہ خلجی، والغو خاں نبیرۂ چنگیز خاں کہ داماد جلال الدین فیروز شاہ بود و ملک احمد حبیب کہ نائب امیر حاجب شدہ بود میل کشیدہ حشم و اموال ایشاں را متصرف گشت و آں ہر دو شاہزادہ مظلوم را در قلعہ ہانسی محبوس ساختہ، دو پسران ارکلیخاں را شہید گردانید، ملک احمد حبیب بکوتوال و حرمہائے سلطان فیروز شاہ خلجی و حرمہائے پسران او را، مع ملکہ جہاں بہ دہلی آوردہ در حبس نگاہ داشتند۔

وہ چچا جس نے محبت سے آغوش میں پالا، لڑکی دی، شوکت و عزت کا شاہی سامان عنایت کیا.................. اُسے ایک احسان فراموش بھتیجہ نہایت بیرحمی کے ساتھ اپنے حصول اغراض کے نشہ میں جان سے مار ڈالتا ہے، یہی نہیں اس کے دو نور نظر ارکلیخاں اور سلطان رکن الدین اور ایک داماد الغو خاں کو اندھا کر کے قید کر دیتا ہے، اس کے دو معصوم پوتوں کو اندھا کر کے شہید کر ڈالتا ہے۔ اور اس خاندان کی تمام عورتوں کو داغ بیوگی دیکر دہلی میں مقید رکھتا ہے .... یہ تھیں سلطان علاؤ الدین کی وہ ظالمانہ کارروائیاں وہ بہیمیہ اقدام، وہ وحشیانہ احسان فراموشی، جنھوں نے آسمان و زمین کو ہلا دیا، جن سے انسانی قلوب بیتاب ہو گئے اور آخر کار قدرت مجبور ہوئی کہ اُس کے خاندان سے بھی ایسا ہی سخت بدلہ لے جو دنیا کے لئے موجب عبرت ہو، اس میں شک نہیں افغانی سلاطین دہلی میں

Marfat.com

علاؤ الدین سب سے زبردست اور ماہر سیاسیات بادشاہ گزرا ہے، جاہل تھا لیکن سیاسیات مدن میں اسے ید طولیٰ حاصل تھا حربی خصوصیات، اور فاتحانہ جوش و اقدام میں تو اسے سکندر ثانی تسلیم ہی کیا جاتا ہے، اس کی بیس سالہ (۶۹۵ھ سے ۷۱۶ھ) حکومت ایسے استقلال اور رعب و داب کے ساتھ گزری کہ اس کے جانشین اگر صاحب اہلیت ہوتے تو یقیناً ہندوستان کی تاریخ میں افغانی عہد کو دوسرے عنوان کے ماتحت لکھا جاتا، لیکن قدرت کو ظلم اور غداری کا بدلہ لینا تھا خود علاؤ الدین اپنی حکومت کے آخری زمانہ میں اپنا مدبرانہ طرز عمل کھو بیٹھا، اس نے اپنے ایک درباری ملک نائب کو حضرت عثمان غنیؓ کے مروان کی طرح حکومت کا تمام نظم و نسق سپرد کر دیا، اس پر اس قدر اعتماد کرتا کہ جو امور سیاسیات کے منافی ہوں ان سے بھی کبھی اختلاف نہ کرتا، دوسری غلطی یہ کی کہ اپنے بیٹوں کو تربیت اور تکمیل تعلیم کے قبل حرم سرا سے نکال کر دربار میں داخل کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہوا پرستی اور لہو ولعب میں لگ گئے، اس اثنا میں صحبت نسواں اور گل چینی جمال کے باعث سلطان کو ایک سخت مرض لاحق ہو گیا، اس کی بیوی ملکہ جہاں اور خضر خاں اس وقت جشن اور تقریبات میں مشغول تھے، اور بادشاہ کی تیمارداری میں کوئی سرگرمی نہیں کرتے، چنانچہ تاریخ میں ہے۔

چوں خضر خاں و ملکہ جہاں درآں ایام بہ جشن و طویہائے خیر بکار مشغول بودہ بمعالجہ و مداوای اولمی پرداختند بادشاہ بعدم صحت، را از بے پرداوئی ایشاں دانستہ از تہ دل رنجید، وازایشاں بربرف۔ اداے چند سری زد کہ رنجش بادشاہ د

Marfat.com

بدگمانی او زیادہ می شد، چہ کہ خضر خان بجز مجلس آراستن و شراب خوردن و ساز و نغمہ شنیدن و چوگان باختن، و فیل بہ جنگ انداختن کارے دیگر نداشت و مادرش ہم بغیر از جشن نمودن و عروس فرزند زادہا کردن و سر تراشی و ختنہ بہیچ امرے نمی پرداخت و چیزے کہ بہ خاطر ایشاں نمی رسید بادشاہ علاؤالدین و بیماری او بود۔

یہ تھا قدرتی انتقام کا پہلا زینہ! بادشاہت قائم ہے، اولاد موجود ہے، بیوی زندہ ہے، آپ سخت بیمار ہیں لیکن کوئی توجہ بھی نہیں کرتا۔ لطف یہ ہے کہ سب جشن منا رہے ہیں بادشاہ نے خلوت میں ملک نائب سے بیوی اور اولاد کی شکایت کی، ملک نائب تو ہمیشہ ملکہ جہاں اور خضر خاں سے متوہم رہا کرتا تھا اس نے موقعہ پا کر عرض کیا کہ یہ لوگ اور الغ خاں بادشاہ کو دفع کرنے میں متفق اور اعلیٰ حضرت کی موت کے متمنی ہیں، اس عرصہ میں ملکہ جہاں نے الغ خاں کی لڑکی سے اپنے لڑکے شادی خاں کے بیاہنے کی اجازت چاہی، ملک نائب نے پھر بادشاہ کو متوحش خبریں سنائیں۔ سلطان نے بر بنائے احتیاط خضر خاں کو سیر و شکار کے لئے امروہہ جانے کی اجازت دی اور کہا کہ جب صحت ہو جاویگی تمہیں بلاؤں گا خضر خاں نے منت مانی کہ سلطان کو صحت ہو جاویگی تو امروہہ سے پاپیادہ مشائخ دہلی کی زیارت کے لئے آؤں گا چنانچہ جب بادشاہ کو صحت ہوئی تو بلا اجازت اپنے خاص لشکر کے ساتھ پیادہ ننگے پاؤں امروہہ سے دہلی آیا، ملک نائب نے پھر بادشاہ کو خضر خاں سے بدگمان کیا کہ شاہزادہ صاحب خیال فاسد لے کر آئے ہیں لیکن بادشاہ نے بدگمانی کے بجائے اس کے

Marfat.com

سر آنکھوں کو بوسہ دیا اور محل میں جانے کی رخصت دی، عشرت پسند طبیعتیں بھی کہیں باز آتی ہیں چند روز کے بعد پھر اسی طرح امور جہانداری کو تباہ نہ سکا اور لہو و لعب میں مشغول ہو گیا ملک نائب نے پھر شکایت کی کہ خضر خاں فلاں فلاں کے اتفاق سے حضور کی جان لینا چاہتا ہے اور اپنے دعوی میں غلاموں اور خواجہ سراؤں کی شہادتیں بھی پیش کیں اور کسی طرح خضر خاں اور شادی خاں کی قید کا حکم لے کر انھیں قلعہ گوالیار میں بھجدیا، ملکہ جہاں کو محل سے نکال کر پرانی دہلی میں محبوس کیا۔ خضر خاں کے خالو الغ خاں اور اس کے بھائی نظام الدین کو قتل کرادیا، ان خانگی فتنہ سازیوں سے اغیار کو موقعہ ملا، گجرات، دکن اور راجپوتانہ میں بغاوت اور بدامنی ہونے لگی، آخر کار بادشاہ کا مرض بڑھتا گیا، کوئی دوا موثر نہیں ہوتی تھی، اسی غم و غصہ میں ۶ رشوال ۷۱۶ھ کی رات کو اس نے ہمیشہ کیلئے آنکھیں بند کرلیں

میں یہاں سلطان علاؤالدین کے خزانہ اور خدم وحشم کا کوئی تفصیلی تذکرہ کرنا نہیں چاہتا، اقبال نے ہمیشہ اس کا ساتھ دیا لیکن اس کی آخری زندگی سخت غم و غصہ میں بسر ہوئی۔ اس کی حیات میں چھوٹی بڑی ۸۴ لڑائیاں ہوئیں اور سبھوں میں فتح و ظفر اس کے شامل حال رہا، صاحب تاریخ فرشتہ لکھتے ہیں:۔

شوکت او ازیں تصور نمایند کہ ہفتاد ہزار شاگرد پیشہ داشت از انجملہ ہفت ہزار معمار و بیلدار و گلکار بودند، و عمارتے کہ ازاں بزرگ تر نباشد چوں طرح می کرد، در دو ہفتہ باتمام می رسانیدند و عمارتہائے خورد در سہ، روز باتمام می رسید و انآں موعد کہ سلطان حکمی کرد، قدرت آں نداشتند

Marfat.com

کہ تجاوز نماید و او اولین کسے است کہ عماری بر پشت فیل نہادہ سواری فرمود

دولت اور خدم وحشم اس قدر تھا کہ سلطان محمود غزنوی کو بھی میسر نہ ہوا تھا، لیکن جب زندگی کی آخری گھڑیاں آئیں تو مرض کی مصیبت اٹھاتا رہا، بیٹوں کو جیل بھیجدیا، بیوی کو اپنے سے جیتے جی جدا کر دیا اور نہایت کلفت اور حزن ملال کے ساتھ دنیا سے گزر گیا۔ یہ تھا قدرت کا وہ ابتدائی انتقام جو خاندان جلالی کے مٹنے کے بعد علاؤالدین سے لیا گیا۔ لیکن اس کے بعد دولت خلجیہ پر جو آفتیں آئیں، جیسی بربادی ناموس ہوئی، وہ ایسی باتیں نہیں جنھیں پڑھ کر آنسو کے دو قطرے ٹپکائے بغیر کوئی سرسری طور پر گزر جائے۔

علاؤالدین کی وفات (جو ملک نائب کی سازش کا نتیجہ بھی کہی جاتی ہے، چونکہ بعضوں کا شبہ ہے کہ اس نے سلطان کو زہر دیدیا) کے دوسرے دن ملک نائب نے اہل دربار کے حضور میں ایک شاہی نوشتہ پیش کیا جس کا مضمون یہ تھا کہ ہم نے خضر خاں کو معزول کیا اور اس کی جگہ شہزادہ شہاب الدین عمر کو اپنا جانشین بنایا۔ اس وقت شاہزادہ کی عمر سات سال کی تھی، خود نائب بن گیا اور اس کی والدہ (حرم سلطان علاء الدین) کے ساتھ شادی کرلی۔ دربار کے ایک شخص ملک سیل کو باربک کا عہدہ دیکر گوالیار میں بھیجا۔ جس نے سلطان کے دو بیٹوں خضر خان اور شادی خاں کو اندھا کر دیا۔ ملک نائب نے ملکہ جہاں کو قید کیا اور موقعہ کی تاک میں تھا کہ مبارک خاں (بن علاء الدین) کی آنکھوں میں بھی سلائی پھروا دے۔ ایک مرتبہ قدیم نوکروں کو مخفی طور پر مبارک خاں کے قتل

Marfat.com

کر ڈالنے پر مستعد کیا لیکن جب وہ مُبارک خاں کے پاس آئے تو حق نمک یاد دلایا اور ایک ہار دے کر اپنی جان بچائی۔ وہ نوکر ہار لئے ہوئے دو نمک حلال درباریوں بشر و بشیر کی خدمت میں آئے۔ اور تمام واقعہ بیان کیا اُن کی رگ حمیت جوش میں آئی اور اُنھوں نے ملک نائب نمک حرام کو سلطان علاء الدین کی وفات کے پینتیس دن کے بعد قتل کر ڈالا اور مُبارک خاں کو قید سے نکال کر بھائی کا نائب مقرر کیا لیکن قدرت کا غضب ابھی کم نہیں ہوا۔ ابھی یہ انتقام کا دوسرا زینہ تھا، مبارک خاں اہل دربار کو ملا کر خود بادشاہ بن بیٹھا، اور اپنے بھائی سلطان شہاب الدین عمر کی آنکھوں میں سلائی پھیر وا کر قلعہ گوالیار میں قید کر دیا۔ سلطان جلال الدین اور اُس کے خاندان کو جس طرح علاؤالدین نے خراب و برباد کیا اُس سے کہیں زیادہ مصیبتیں خاندان علائی کو پیش آئیں، سلطان کے تینوں بیٹوں خضر خاں، شادی خاں، سلطان شہاب الدین کی آنکھیں نکلوائی گئیں، ملکہ جہاں مقید ہوئیں، حرم سلطانی کو ایک نمک حرام درباری اپنی زوجیت میں لے آیا، اس کے علاوہ خود سلطان نے جس حسرت اور رنج میں آخری دن گزارے سطور بالا سے ثابت ہو چکا۔ اس وقت دہلی میں ایک مجذوب شیخ بشیر دیوانہ تھے ان سے لوگوں نے پوچھا کہ علاؤالدین کے گھرانہ میں یہ آفتیں کیوں بپا ہیں اُنھوں نے جواب دیا اور کیا خوب کہا:۔

چوں علاؤالدین خاندان عم و ولی نعمت خود بر انداخت با او نیز ہمیں معاملہ می رود

مبارک شاہ خاندان خلجیہ کا آخری فرمانروا تھا۔ اس نے ۷۱۶ھ سے ۷۲۰ھ تک

Marfat.com

حکومت کی، جلوس کے بعد اُس نے بہتیرے درباریوں کو نئے نئے خطابات عطا کئے، اُن میں ایک ملک شادی تھا، جسے سلطان علاؤالدین نے پالا تھا، یہ مبارک شاہ کا نائب خاص تھا۔ اس پر زیادہ التفات کی، اور خسرو خاں کا خطاب دیکر ملک شادی (پسر علاؤالدین) اور ملک نائب (نمکحرام) کا تمام مال اُسے دیدیا اور چونکہ اس کا بیحد شیفتہ جمال تھا منصب وزارت بھی اس کے سپرد کر دیا حالانکہ اس میں اس منصب کی مطلق اہلیت نہ تھی، آخر میں یہی خسرو خاں خاندان علائی کے لئے وہ ہوا جو ٹھیک جلال الدین اور اُس کے گھرانہ کے لئے سلطان علاؤالدین ثابت ہوا تھا، اگر انسانی قلوب میں احساس ہے، اگر دیدۂ بصیرت میں مشاہدہ کی استعداد باقی ہے، اگر عبرت اور اثر پذیری کی کیفیات موجود ہیں تو خاندان خلجیہ کے اس عبرت انگیز انقلاب سے سبق لینا چاہیئے۔

پہلے پہل تو مُبارک شاہ کی سلطنت نہایت استوار اور زبردست تھی، لیکن آخر میں وہ ایسے ایسے افعال کرنے لگا جو موجب زوال ہو گئے۔ چنانچہ اس نے اپنے خاندان کے طرفداروں کو بے قصور بعض متعصب افراد کی اغوا سے قتل کر ڈالا، حضرت نظام الدین اولیا اللہ جیسے اہل اللہ اور مقدس انسان سے دشمنی رکھنے لگا، اور آپ کی شان میں طعن اور بدزبانیاں کیں، وجہ صرف یہ تھی کہ خضر خاں آپ کا مُرید تھا۔ طرفہ یہ کہ عورتوں کا زیور اور لباس پہن کر عام مجمع میں آتا، اور ہزال، آبرو باختہ عورتوں کو محل ہزار ستون کے بالائی حصّہ میں طلب کرتا وہ اس کے اشارہ سے اکابر دربار کے ساتھ نامناسب حرکات کرتیں ان کے سامنے ننگی مادرزاد آتیں اور ان کے کپڑوں پر پیشاب کرتیں، بادشاہ کسی مدبر

Marfat.com

کی بات نہیں سنتا تھا۔ اگر کوئی اصلاح دولت کا مشورہ دیتا تو اُسے نہایت ذلیل کرتا اس وجہ سے کسی کو صلاح دینے کی جرأت بھی نہ تھی، خسرو خاں پر سلطان عاشق تھا، اُس کا زور روز بروز بڑھتا گیا اور زور کے ساتھ اس کی ہوس پیمائیاں بھی زیادہ ہوتی گئیں، کسی کو یارا نہ تھا کہ خسرو خاں کے خلاف بادشاہ کے حضور میں شکایت کرے، اور کسی کی شامت آئی تو اُسے شکایت کا نہایت بُرا خمیازہ بھگتنا پڑا، ادھر خسرو خاں نے اپنی جمعیت درست کرنی شروع کی، دکن کے ایک ہندو خاندان سے اس کا تعلق تھا بادشاہ کی اجازت سے اُس نے اپنی قوم کے آدمیوں کو نوکر رکھنا شروع کیا، اور ایک خاص لشکر تیار کرلیا۔ بادشاہ تو اس کا شیدائے جمال تھا اُسے اُس کے خلاف کوئی اندیشہ ہی نہیں ہوسکتا تھا، خسرو خاں نے اپنی خنونت، اپنے دلربایانہ انداز، اپنی رعنائیوں اور عشوہ فروشیوں سے سلطان کے دل میں ایسی جگہ کرلی تھی کہ وہ جو کہتا سلطان پورا کردیتا۔ اب خسرو خاں کی ہوس جادۂ اعتدال سے گزرنے لگی۔ اُس نے سلطان کے قتل کی سازش کی، تاج و تخت کے حصول کا خیال باندھا، ہوا خواہوں نے بادشاہ کو خبر پہنچائی لیکن خسرو خاں نے اپنی نسائیت نما اداؤں سے حریم عشوہ و ناز میں بیٹھ کر، عورتوں کی طرح رو رو کر سلطان پر اپنی معصومیت ثابت کی، بھلا ایک حسین اور شگفتہ صورت محبوب، خلوت کی صحبتیں، نیاز کے جذبات، ایسی باتیں نہ تھیں جو سلطان جیسے بدچلن اور نادان آدمی کو مسحور نہ کرلیتیں ہوا خواہان دولت کو جب خسرو خاں کے خلاف شکوہ کرنے کا بُرا نتیجہ اُٹھانا پڑا تو انہوں نے بالکل چشم پوشی کرلی، قاضی ضیاء الدین تنہائی میں ابھی سلطان کو خسرو خاں کے فاسد

Marfat.com

ارادہ سے مطلع کر کے جاتے ہیں کہ یکایک یہ فتنہ روزگار آتا ہے، اور تنہا ایک معشوقانہ انداز میں پہلوئے سلطانی میں عورتوں کے مثل ساتوں سنگار کئے ہوئے بیٹھ جاتا ہے چنانچہ تاریخ نے خسرو خاں کی رعنائیوں اور سلطان کی ہوس رانیوں کا عجیب وغریب واقعہ نہیں بھلایا، فرشتہ میں ہے۔

ہماں لحظہ کہ خسرو خاں خود را ہمچوں زناں ہر ہفت کردہ وآراستہ از در درآمد سلطان .... از گرد راہ در آغوش کشیدہ آنچہ قاضی گفتہ بود، مذکور ساخت، اشک بہ رخسارہ رواں کردہ گفت چوں بادشاہ را بہ حال من لطف بسیار است وزیادہ از حد و نہایت است تمام مردمی بہ قصد قتل من برخاستہ اند و تا مرا بہ کشتن نہ دہند از پا نہ خواہند نشست، پادشاہ را از گریہ او دل بہ درد آمدہ او را در کنار گرفت و بوسہ بر رخسارہ اش دادہ گفت خاطر جمع دار کہ یک موئے سر ترا بہتر از بادشاہی خود میدانم چہ جائے آنکہ در خاطر تو دعدغہ بدگویان باشد۔

سیرت انسانی کا یہ تاریک پہلو دیکھنے کے بعد دنیا کو یہ واقعہ سن کر غالباً زیادہ تعجب نہ ہوگا کہ اسی رات کو عین "ہزار ستون" (کسی محل کا نام تھا) میں خسرو خاں نے مبارک شاہ کا سرتن سے جدا کر لیا اور اس کے بعد اس کی تمام فوج حرم شاہی میں گھس گئی، اور اپنے ولی نعمت کے ساتھ جو کچھ کیا وہ ایسے واقعات ہیں جنھیں دہرانے سے قبل خود بخود آنکھوں میں پانی بھر آتا ہے۔

Marfat.com

خسرو خاں کا بھائی حسام الدین اور چچا جاہر ہندوؤں کے ساتھ حرم میں داخل ہوا سلطان علاؤ الدین کی حرم محترم کو قتل کر ڈالا، سلطان کے تین بیٹوں فرید خاں، علیخاں اور عمر خاں کی جان لی۔ خسرو خاں نے خود سلطان علاؤ الدین اور سلطان قطب الدین کے کثیر التعداد غلاموں کو قتل کرایا۔ ان کی عورتیں اور ان کی اولاد ہندوؤں کو عطا کیں، اپنے بھائی کو خانخاناں کا خطاب دے کر سلطان علاؤ الدین کی لڑکی اُسے بخشدی اور سلطان قطب الدین کی بیوی پر خود قابض ہو گیا، اسی طرح سلطان علاؤ الدین اور قطب الدین مبارک شاہ کی بقیہ بیبیاں اور بیٹیاں اپنے آدمیوں کو عطا کیں۔ سلطان کے بھانجے نصرت خاں کو جس نے عرصہ سے درویشی اختیار کر لی تھی مار ڈالا، قرآن مجید میں جہاں امم سابقہ کی تباہی کا حال لکھا گیا ہے وہاں اُن کی اُجڑی ہوئی بستیوں کے متعلق ایک نہایت پُر کیف مثال آتی ہے۔ "کان لم یغنوا فیہا"، یعنی عاد و ثمود، اصحاب مدین وغیرہ کے مساکن اب ایسے ویران نظر آتے ہیں معلوم ہوتا ہے ان میں کبھی آبادی ہی نہ تھی، یہی حال دولت خلجیہ کا ہوا۔ ان کے خاندانی افراد بہت کثیر تعداد میں تھے۔ اگر باہمی اتفاق کے ساتھ حکومت کرتے تو غالباً اُن کی حکومت صدیوں قائم رہتی لیکن جس طرح جلد بنے تھے جلد بگڑ گئے، خسرو خاں نے چن چن کر شاہی خاندان کے افراد کو قتل کر ڈالا۔ اور دنیا میں شاید اُن کی نسل ہی ختم ہو گئی۔ ہر چند وہ نہ رہے لیکن ان کی تباہی ناموس اور بربادی کا افسانہ رہ گیا۔ حضرت امیر خسرو زندہ تھے۔ خضر خاں اور وہ دونوں پیر بھائی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے خضر خاں اور دول رانی کے۔

Marfat.com

عشقیہ حالات پر اپنی مشہور مثنوی "قرآن السعدین" لکھی۔ خضر خاں اور اُس کے بھائی شادی خاں کو تو پہلے ہی سے ملک نائب نے اندھا بنا کر گوالیار میں قید کر دیا تھا۔ مبارک شاہ نے شہاب الدین عمر کو اندھا کیا، اور کچھ دنوں کے بعد تینوں کو قتل کرا دیا، اور خضر خاں کی منکوحہ اور محبوبہ دولدیٔ کو اپنے حرم میں داخل کر لیا، یہ ہوا علاؤ الدین کے خاندان کا حشر، غداری اور احسان فراموشی نے آخر رنگ دکھایا، بھتیجے نے چچا اور اُس کے خاندان کو مٹایا، قدرت انتقام پر کمربستہ ہوئی، بھتیجے کے گھرانے کو خود اُس کے ایک پروردہ (ہندو) غلام سے برباد کرا ڈالا۔ اولاد کی جان گئی، خواتین کی عزّت وناموس پر دھبہ آیا، نسل منقطع ہو گئی۔ وہ کل مظالم اور سفاکیاں ہوئیں، جن سے قلوب ہل گئے، غیروں کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، اور آخر کار ایک فلسفی اس نتیجہ پر پہنچا کہ عروج وزوال محض رسمی اصطلاحات ہیں لیکن لازم وملزوم، بقا دونوں میں کسی کو نہیں ہم طلسمی پتلے ہیں اس تماشا گاہ ہستی میں اپنا اپنا ایکٹ کر رہے ہیں۔ دنیا میں بسنے والی قومیں آئیں دہر کی ان بوقلمنیوں کا تماشا دیکھیں، میرا خیال ہے اگر افراد اور اجتماع کے سوانح زندگی اور ان کی جزئیات سے بحث کی جائے۔ تو ایک بڑے سے بڑا انسان ترقی اور تنزّل کے اعتبار سے کسی مفلوک اور پست سے پست آدمی سے بھی زیادہ با اقبال کہلانے کا مستحق نہیں چونکہ میرے نزدیک لذّت والم کے احساس پر ترقی وتنزّل کی بنیاد قائم ہے۔ بہت ممکن ہے بہ ظاہر جو اقبال مند نظر آتا ہو فی الواقع وہ پرلے درجہ کا بدنصیب ہو، چونکہ اس میں لذّتِ احساس مفقود ہے

Marfat.com

چونکہ اس کی باطنی زندگی نشاط سے بالکل معرا ہے۔ اسی طرح ایک گدڑی پہننے والا، برہنہ پا برہنہ سر، انسان کسی بادشاہ سے بھی زیادہ خوش نصیب ہو، چونکہ اس کی خلوت گاد رازمیں ایک روح نشاط ہو وہ .... "انہٗ کان فی اھلہ مسرورا" کا مصداق ٹھیرے، یہ ہے میرے نزدیک ہستی کا روشن پہلو، اور یہ ہے مساواتِ انسانی اور اطمنان خاطر کا بہترین کُلیہ زندگی ....

Marfat.com

عہد طاہریہ کی ایک وفا کیش حسینہ

خلیفہ مامون (۱۹۸ھ و ۲۱۸ھ) کا زمانہ ہے۔ بغداد علوم و معارف کا مرکز بنا ہوا ہے۔ مامون اپنی محفل نشاط میں بیٹھا ہوا مے نوشی کر رہا ہے کہ اس عرصہ میں طاہر ذوالیمین مجلس میں آیا۔ مامون نے ساقی کو اشارہ کیا اُس نے چند ساغر طاہر کو پلائے۔ اس عرصہ میں مامون کی آنکھوں سے بے اختیارانہ آنسو بہنے لگے طاہر نے کہا حضور! مشرق سے مغرب تک آپ کے قبضہ میں ہے آپ خود مختار شہنشاہ ہیں آپ کو کون سا غم ہے مامون نے جواب دیا دنیا میں کوئی انسان بے غم نہیں میرے رونے کی ایک خاص وجہ ہے۔ میں اسے ظاہر نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا راز افشا کرنا موجب ذلت ہے اسکے بعد مامون پر کچھ ایسی رقت طاری ہوئی کہ طاہر کو دوبارہ سوال کرنے کی ہمت نہ پڑی۔

مجلس سے واپس آنے کے بعد طاہر کو اس کی فکر ہوئی کہ مامون کی گریہ زاری کا راز دریافت کرے۔ حسین خادم خلیفہ کا ساقی تھا۔ طاہر نے اس کے ایک خاص ملازم کو دو لاکھ درم دیا کہ وہ اپنے آقا کے ذریعہ مامون کے رونے کا سبب دریافت کرے۔ دوسرے دن حسین خادم مامون کو شراب پلانے کے لئے آیا۔ خلیفہ نے شراب

Marfat.com

سب کی حسین نے کہا حضور میں شراب اُس وقت نہیں پیش کروں گا جب تک آپ
ں کی گریہ وزاری کا سبب نہ بتائیں۔ خلیفہ مامون نے کہا تجھ کو ان باتوں سے کیا
سروکار، آخر اس نے اصرار کیا تو مامون نے کہا میں راز بتاتا ہوں لیکن کسی پر ظاہر کر دیگے
تمہاری گردن مار دوں گا اس کے بعد فرمایا حسین! میری نظر جب طاہر پر پڑتی
ہے۔ تو میرا بھائی امین مجھے یاد آجاتا ہے اس نے کس ذلت سے اُس کو قتل کیا۔ اس
سے میں بالکل بے قابو ہو جاتا ہوں۔ حسین نے طاہر کو اس بات سے آگاہ کر دیا۔
طاہر نے احمد بن ابی خالد وزیر کو بلایا کہ وہ اس کو دارالخلافہ سے کہیں دور دراز بھیج دے
کہ مامون کا سامنا نہ ہو۔ احمد مامون کی خدمت میں آیا اور عرض کیا حضور چند راتوں
سے نیند حرام ہے کیونکہ مملکت خراسان کا انتظام اچھا نہیں ہے ترکوں کی فوج نزدیک
آ گئی ہے۔ عنان جو اس صوبے کا گورنر ہے اس کی پوری حفاظت نہیں کر سکتا خلیفہ
نے کہا پھر کیا کرنا چاہیئے۔ وزیر نے موقع پا کر عرض کیا کہ طاہر بن حسین کو اس کا حاکم
مقرر کیا جائے۔ چنانچہ مامون نے اجازت دی اور طاہر کو خراسان کی حکومت مل گئی۔

طاہر ایک اولوالعزم افسر تھا۔ بخت نے مساعدت کی، وقت اور ماحول نے
اس کی حوصلہ پیمائیوں کو فروغ دیا اور وہ خراسان کا مطلق العنان بادشاہ بن بیٹھا
اس کی وفات کے بعد اس کے خاندان میں طلحہ بن طاہر، عبداللہ بن طاہر، طاہر ثانی
بن عبداللہ، محمد بن طاہر ثانی نے ۲۰۹ھ سے ۲۵۹ھ تک حکومت کی۔ اس خاندان

Marfat.com

سارے بادشاہ نہایت نیک نفس، رحمدل اور عادل گذرے ہیں۔ محمد بن طاہر ثانی اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا جس کو یعقوب لیث صفّار نے قید کر کے خاندان صفاریہ کی بنیاد ڈالی۔

خانوادۂ طاہریہ کی آخری شمع محمد بن طاہر ثانی تخت خراسان پر جلوہ فگن ہے اس کو خبر ملتی ہے کہ نیشا پور میں محمود وراق کے پاس ایک ایسی لونڈی ہے جو حسن بدیع کے ساتھ اخلاق جمیل میں بھی یگانۂ روزگار ہے۔ وہ شعر و ادب کا پاکیزہ مذاق رکھتی ہے اور بربط نوازی میں بے مثل ہے۔ محمد بن طاہر کو غائبانہ اس لونڈی سے محبت ہو گئی اس نے ارادہ کیا کہ لونڈی کو خرید لے۔ ایک بڑی رقم دیکر محمود وراق کے پاس اپنے آدمی بھیجے۔ لیکن محمود خود ہی اس لونڈی پر فریفتہ تھا اس نے اس کو فروخت کرنا پسند نہ کیا۔ اسی طرح کچھ دن گذر گئے، محمود وراق کے پاس جو کچھ مال و زر تھا وہ صرف ہو چکا، آقا اور کنیز دونوں عسرت اور پریشان حالی کے شکار ہوئے مشکلات سے تنگ آکر محمود نے امیر محمد بن طاہر کے پاس پیغام بھیجا کہ میں لونڈی کو بیچنا چاہتا ہوں، امیر محمد ایک مدت سے کشتہ فراق تھا بیحد خوش ہوا اور بہت سی دولت لے کر محمود کے پاس پہونچا، محمود مال لے کر گھر کے اندر آیا اور حسرت کے ساتھ لونڈی سے کہا کہ ہماری فاقہ مستیاں اب روح فرسا ہو گئیں۔ افلاس نے میری جو حالت بنا رکھی ہے وہ اس قدر میرے لئے پریشان کن نہیں لیکن تمہارا خیال ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کو امیر خراسان

Marfat.com

محمد بن طاہر کے ہاتھ بیچ ڈالوں وہاں تم شاہی محل میں ملکہ ہو گی، تمہاری مصیبت کے دن ختم ہو جائیں گے۔ میری محبوبہ میرا دل تو نہیں چاہتا کہ تجھ کو اپنے سے جدا کردوں لیکن تیری بے بسی اور بدحالی دیکھی نہیں جاتی جا اُٹھ محل میں جانے کی تیاری کر۔ کنیز نے آقا کی بات سنی۔ اُس کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے دست بستہ عرض کیا۔ میرے آقا! مجھے اپنے سے جدا نہ کیجئے، میں محنت مزدوری کرونگی اور آپ کے اور اپنے لئے کھانے پینے کا انتظام کردں گی۔ کنیز زار زار رو رہی تھی، محمود اس کو سمجھا رہا تھا۔ باہر امیر محمد موجود تھا اس نے کنیز کی داستان محبت اپنے کانوں سے سُنی، وہ حد درجہ متاثر ہوا۔ کنیز کے نوامیس جمیل نے اس کو بہت بڑا درس اخلاق دیا اور اس نے محمود کو چار توڑے ہدیۃً عطا کئے، اور لونڈی کو اسی کے پاس چھوڑ دیا آج ہزار برس سے زیادہ گزر گئے نہ محمود دراق ہے نہ اُسکی شبستان کی دوشیزہ پارہ دنیا اُن کا افسانہ محبت بھول چکی ہے۔ لیکن امیر محمد کی فیاضی اور اخلاقی عظمت تاریخ کے صفحات پر آج بھی موجود ہے اور ایسی ہزاروں صدیاں گزر جائیں گی لیکن دنیا اپنی فراموشیوں کے باوجود اس روایت کو کبھی دل سے محو نہیں کر سکتی۔

Marfat.com

بنی فاطمہ کی سیاسی تحریکیں اور اُن کا تاریخی انجام

عہد امویہ و عباسیہ کی داستانِ خونیں کے چند صفحے

نگار :۔ ہمارے عزیز دوست مولوی عبدالمالک آروی نے جس سوز و درد کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے، اُس سے کس کو ہمدردی نہ ہوگی، لیکن سوال یہ ہے کہ امویہ و عباسیہ کی تمام سختیاں علوئین کے خلاف کیوں تھیں؟ کیا اسلئے تھیں کہ وہ آلِ رسول و معاذین آلِ رسول تھے؟ کیا محض اس وجہ سے تھیں کہ بانی اسلام کا خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا تھا؟ نہیں؛ بلکہ یہ مخالفت صرف اس لئے تھی کہ وہ ڈرتے تھے کہیں اُن کی حکومت نہ چھن جائے اور اُن کی سلطنت پر قابض نہ ہو جائیں پھر جب یہ امر مسلم ہے کہ عہد خلافت کے بعد، امیر معاویہ کے عہد سے اسلام میں خالص دنیاوی حکومت شروع ہو گئی تھی اور بنی امیہ و بنی عباس میں جن جن کو خلفاء کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے وہ سب کے سب اُنھیں اصول سیاست کے ماتحت اپنی حکومتوں کو قائم رکھنا چاہتے تھے، جو دنیا کے حکمرانوں نے ہمیشہ اختیار کیے ہیں، تو پھر اُن کے مظالم کا شکوہ کیوں کیا جائے؟

Marfat.com

اگر تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ امویہ و عباسیہ نے علوئین پر ظلم کیے تو یہ بھی ثابت ہے کہ علوئین نے ہمیشہ در پردہ اپنی کوششوں کو جاری رکھا اور بارہا امویہ و عباسیہ کے خلاف خروج بھی کیا۔ اس لئے اگر امویہ و عباسیہ نے اُن کے ساتھ وہی سلوک کیا جو دنیا کے ارباب حکومت نے ــــــ اپنی سلطنت کے تحفظ کے لئے ہمیشہ کیا ہے اور ہمیشہ کریں گے تو کیا الزام ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر امویہ و عباسیہ اس قدر سختیاں نہ کرتے، اتنی احتیاط سے کام نہ لیتے تو علوئین کا برسر اقتدار ہو کر حکمراں ہو جانا یقینی تھا اور امویہ و عباسیہ اُسے کس طرح گوارا کر سکتے تھے۔ اگر وہ سمجھتے کہ آل رسول واقعی مستحق خلافت ہیں اور حکومت و سلطنت انھیں کو ملنا چاہیئے تو یہ جھگڑا بڑھتا ہی کیوں ــــ الغرض تمام دنیاوی حکومتوں کے قیام کی تاریخ اسی طرح کی خونیں داستانوں سے معمور ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اگر علوئین برسرِ حکومت ہوتے تو امویہ و عباسیہ کے ساتھ وہ کوئی دوسرا سلوک کرتے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ امویہ و عباسیہ اگر واقعی مسلمان ہوتے تو آل رسول کے ساتھ اس قدر بد تمیزی کا سلوک کبھی نہ گوارا کرتے اس پر دونوں جانب سے بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور اس قسم کے مباحث کو چھیڑنا اب بالکل بیکار ہے جبکہ مسلمانوں سے خلافت و حکومت دونوں چیزیں چھین لی گئی ہیں اور علوئین و غیر علوئین سب کے لئے یہ "باب نزاع" الحمد للہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا ہے۔

Marfat.com

یہ وقت اس بحث کا نہیں کہ اس سے قبل ہم پر کیا گزر گیا۔ بلکہ یہ دیکھنے کا ہے کہ آئندہ ہم پر کیا گزرنے والا ہے۔ یعنی اب ضرورت گزشتہ اختلاف کے دہرانے کی نہیں ہے بلکہ آئندہ کسی ایک امر پر متفق و متحد کر دینے کی ہے۔

بحث و جدل بجائے ماں، میکدہ جوئے کاندراں
کس نفس از جمل نزد، کس سخن از فدک نراند

(نیاز)

ہر انسان پر خواہ وہ زاہد شب زندہ دار ہو، یا رند معصیت کوش زندگی کے بعض ایسے معصوم اور برگزیدہ لمحے بھی گزرجاتے ہیں، جب اشیاء و مناظر کی حقیقت پر بھی اُسے غور کرنا پڑجاتا ہے پھر اُس کا موضوع فکر کبھی خود اس کی ذات ہوتی ہے اور کبھی ماورائے ذات۔ چنانچہ فلسفہ کے مختلف مذاہب، شاعری کے مختلف اسالیب اخلاقیات و عمرانیات کے مسائل اسی خیال کی تحلیل کا نتیجہ ہیں۔

سب سے پہلے انسان کی نظر زندگی اور اس کی حقیقت پر پڑتی ہے اور اسی عقدہ کے حل کرنے کے بعد انسان ماورائے ذات کے ساتھ اپنے ربط و علاقہ کی تعیین کرتا ہے۔ حقیقت زندگی کیا ہے؟ اس کے جواب میں خیالات کا ایک عمان بے پایاں سامنے آجاتا ہے، لیکن بیچین قلوب کو نہ افلاطون کے "تصورات" کی موشگافیاں تسکین پہونچا سکتی ہیں نہ ارسطو کی ثنویت اور اس کے آفریدگار کی بے نیازیاں سے

ازیں چہ سود در یاں در کمال حکمت او   کہ بوعلی مقر و ارسطو بہ انکار است

Marfat.com

مذہب کو ان کے پرستاروں کی انانیت اور خود غرضیوں نے سیاسیات سے زیادہ بلند سطح پر رکھا اس لئے اس کے مکارم و معانی، نشو و ارتقا کی تدریجی رفتار کے ساتھ فنا ہونے لگے اور آخر کار مذہب اپنے خود پرستاروں کی وجہ سے ہلاکت و فساد کا ایک خوفناک نظام بن گیا۔ اس لئے انسان اپنی ہی طرف دیکھتا ہے، اور سوال کرتا ہے زندگی کیا ہے؟ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اگر محرومیاں اور کامرانیاں دونوں آئندہ چل کر خواب و خیال بن جاتی ہیں تو پھر ہم مستقبل کے ساتھ اس قدر آرزومندانہ انہماک کیوں رکھتے ہیں ہم ساری آرزؤں کو کیوں نہیں تیاگ دیتے اور پھر سوال یہ ہے کہ اس افسردگی تمنا کے بعد ہم میں جینے کا حوصلہ کیوں باقی رہتا ہے۔ غالب اپنے فلسفیانہ انداز میں اس کا جواب دیتے ہیں ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید　　　ناامیدی اُس کی دیکھا چاہیے

مرزا کا عقیدہ ہے کہ زندگی محض اُمیدوں کے سہارے قائم رہتی ہے۔ اگر اُمیدیں باقی نہ رہیں گی۔ تو موت اُمید بن جائیگی۔ یعنی انسان زندہ رہنا پسند نہیں کریگا۔ غالب کا یہ شعر زندگی کی بالکل حقیقت ہے۔

انسان فطرتاً رجائیت کا جذبہ لے کر آیا ہے، اور جب تک وہ زندہ رہتا ہے محرومیوں کے باوجود مستقبل کے ساتھ ایک آرزو رکھتا ہے۔ زمانہ اور اُس کا انقلاب یا تو انسانی قلوب کو مدفن تمنا بنا دیتا ہے۔ یا گلشن تمنا۔ لیکن انسان جب ماضی کا جائزہ لیتا ہے تو اس کی کامرانیاں بھی محرومیوں سے زیادہ ناکام نظر آتی ہیں: ناکامی تو خیر

Marfat.com

خلش دل بن کر زندگی کا ساتھ دیتی ہے، لیکن کامرانیوں کا انجام تو بے کیفی اور افسردگی کے سوا کچھ نہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ انسان کیفیت چاہتا ہے خواہ وہ درد ہو یا نشاط، رونا بھی آرزو کے وجود کی دلیل ہے، کیونکہ انسان روتا بھی اُسی وقت ہے جب دل میں کوئی آرزو ہوتی ہے۔ آہ! اصل رونا تو نہ رونے کا ہے۔ دل کی حسرتیں ختم ہو جاتی ہیں تو آنسو بھی خشک ہو جاتے ہیں۔ ظہوری اس نفسیاتی مسئلہ کے متعلق اپنے شاعرانہ انداز میں فرماتے ہیں ؎

گریۂ حسرت اے ظہوری چند　　　آرزو ہا ہمہ ز دیدہ چکید

فلسفی شاعر کہتا ہے، کہ انسان کب تک روئے، ارے ساری آرزوئیں تو آنکھوں کی راہ بہہ گئیں اب آرزو ہی نہیں تو روئیں کیا۔ یہ صرف شاعری نہیں ہے، بلکہ شاعر نے ایک نفسیاتی واقعہ بیان کر دیا ہے۔

الغرض ماضی کا جائزہ لینے اور مستقبل کا تجزیہ کرنے کے بعد انسان اس نتیجہ پر پہونچتا ہے، کہ زندگی نام ہے دراصل ماضی کے خواب و خیال بن جانے اور مستقبل کے ساتھ آرزوؤں کی وابستگی کا۔ بس یہی زندگی کی حقیقت ہے۔ اب سوال یہ ہے، کہ اس انکشاف کے بعد ہم پر یاس و بے حسی کیوں نہیں طاری ہو جاتی۔ یہیں پہونچ کر نظامِ فطرت انسان کو اندھا بنا دیتا ہے، اور جب تک انسان کے قویٰ باقی رہتے ہیں وہ فطرت کے ذوق آرائش میں زندگی تباہ و برباد کرتا رہتا ہے۔ عمرانیات کا سازِ نشاط، حکومتوں کی ساری حکمت عملی، ذہن و جسم کی تمام پیداوار ایک اسی فریب

Marfat.com

خیال کا نتیجہ ہیں ورنہ سلف کے تمدنی کارنامے قدما کے آثار حکومتوں کا قیام وزوال خاندانوں کا عروج و انحطاط ہمارے اندر کیوں نہیں ایک نفسی ردعمل پیدا کر دیتا ہے، آخر ہم کیوں آرزوہائے خیالی کے دیوانے ہیں ہم دل کے اندر اُمیدوں کی پرورش کیوں کرتے ہیں اور ان کے پورا ہونے کے لئے اس قدر سرگرداں کیوں ہیں؟ قرآن نے اپنے اچھوتے فلسفیانہ انداز میں اس کی طرف ایک جگہ اشارہ کیا ہے

اتبنون بکل ریع آیۃً — کیا تم ہر اونچے مقام پر ایک یادگار بناتے

تعبثون ۰ وتتخذون مصانع — ہو جو بالکل عبث ہو اور بڑے بڑے محل

لعلکم تخلدون (شعراء) — تیار کرتے ہو جیسے ہمیشہ تم کو دنیا میں رہنا ہو

یہ ہے اسلامی عمرانیات کا وہ سہل وسادہ اصول جو انسان کو دنیا کی بہت سی ابلہ فریبیوں سے بچا سکتا ہے۔ لیکن انسان کے اندر جس وقت جذبۂ انانیت پیدا ہوتا ہے وہ دولت و جاہ، امارت و حکومت، شہرت و عزت خود غرضی و کامرانی کے نشہ میں سرشار ہو جاتا ہے اور ایسے ذرائع ڈھونڈھنے لگتا ہے جن کی بدولت اسکو ابنائے جنس پر تفوق و برتری حاصل ہو، یہیں سے اخلاقیات کی ساری فرومائگی شروع ہوتی ہے اور انسان کے نوامیس اخلاقی رفتہ رفتہ رخصت ہونے لگتے ہیں یہانتک کہ وہ ایک درندہ بن جاتا ہے۔ جس کی بیشمار مثالیں صفحات تاریخ میں موجود ہیں۔ اچھا تو آیئے آج کی صحبت میں "بنی فاطمہ" کی مظلومیت اور امویہ و عباسیہ کی خون آشامیوں پر ایک نگاہ ڈال کر فطرت انسانی کی ہوسناکیوں کا مطالعہ کریں۔

Marfat.com

مختصراً اگر میں کہنا چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ تاریخ کے صفحات علویہ و اہلبیت کے خون سے رنگین نظر آتے ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ حضرت زید شہید کو جس طرح فنا کے گھاٹ اتارا گیا وہ ہشام و ولید کو ابدی لعنت میں گرفتار رکھنے کے لئے کافی ہے۔ حضرت یحییٰ بن زید کا سر کاٹ کر بی بی ریطہؓ کے آغوش میں دنیا ایک ایسی وحشت ہے ا جس پر چنگیز و ہلاکو بھی رشک کریں گے۔ محمد نفس الزکیہ اور ابراہیم کو جس غداری اور بیدردی کے ساتھ قتل کیا گیا وہ خلیفہ منصور کے دامن پر ایسا دھبہ ہے، جو کبھی نہیں مٹ سکتا ہارون الرشید اسلامی دنیا کا ایک نامور خلیفہ سہی اس کی بیدار مغزی اس کی سیاسی اہلیت اس کا فاتحانہ جوش و خروش مسلم لیکن آہ! یحییٰ بن عبداللہ محض کو امان دے کر زہر دلا دینا کیا معمولی واقعہ ہے۔ اور کیا اس کو آسانی کے ساتھ معاف کیا جا سکتا ہے۔ کیا ابوالحسین ابن علی العابد کا واقعہ اور مصائب "فخ" محض اس بنا پر فراموش کئے جا سکتے ہیں کہ خلیفہ ہادی کے حکم سے یہ بلا انگیزیاں نہیں ہوئی تھیں امام محمد تقی کہا کرتے تھے۔

لم یکن لنا بعد الطف — کربلا کے بعد سب سے بڑی مصیبت جو ہم

مصرع اعظم من فخ — پر نازل ہوئی وہ واقعہ فخ ہے

کیا امام جعفر صادق جیسے گوشہ نشین عالم کو زہر دینا خلیفہ منصور (۱۳۶ھ۔ ۱۵۸ھ) کی معمولی دنارت تھی، کیا حضرت امام موسیٰ کاظم کو زہر دینے کے بعد بھی رشید (۱۷۰ھ۔ ۱۹۳ھ) اسلامی دنیا کا ہر دلعزیز تاجدار کہا جا سکتا ہے، کیا امام

Marfat.com

علی نقی کو زہر کا پیالہ پلا دینا خلیفہ المعتز (۲۵۲ھ تا ۲۵۵ھ) کا ایسا کارنامہ ہے جس پر دنیا عباسیہ کے جاہ و جلال اور اسلامی شان و شکوہ کی داد دے سکتی ہے۔ الغرض کہاں تک عباسیہ کی سیہ کاریوں کا شمار کیا جائے۔ میں مانتا ہوں کہ انھوں نے اپنی جلالت و عظمت، علمی و سیاسی خدمات، معاشرتی و عمرانی ترقیوں کے ذریعہ سے عربوں کو دنیا کی ملتوں کے سامنے بہت سربلند کر دیا، لیکن کیا دنیا میں صرف سربلندی حاصل کر لینا ہی اسلام کا اصل پیام ہے، کیا ترقی کا حقیقی معیار اسلام کے نزدیک یہی ہے کہ بغداد میں مدینہ جیسی شاندار عمارتیں بنا دی جائیں، یونانی زبان کی خرافات کا عربی میں ترجمہ کیا جائے، عباسی حکومت کو اطراف و اکناف عالم تک وسیع کر دیا جائے، کیا یہ سب کچھ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی تھی، بالفرض ہو بھی تو بنی فاطمہ کے ساتھ ان کا سلوک کیا ان کو اسلامی دنیا کے لئے رحمت بتا سکتا ہے۔

زید شہید | حضرت زید بن امام علی زین العابدین فریادی بن کر ہشام اموی کے دربار میں تشریف لے جاتے ہیں، ہشام اپنے افسر فوج کو حکم دیتا ہے کہ زید ہمارے لشکر میں بہنے نہ پائیں۔ حضرت زید یہ سن کر فرماتے ہیں کہ جو شخص تلوار کی زد نا پسند کرتا ہے وہ ذلیل ہوتا ہے،، لوگوں نے یہ خبر دربار میں پہنچا دی ہشام سمجھا کہ آپ اس پر خروج کریں گے۔ وہ مکہ میں آیا، اور حضرت زید، داؤد بن علی بن عبداللہ بن عباس اور محمد ابن عمر بن حضرت علی کو گرفتار کیا اور الزام یہ لگایا کہ خالد قشیری کا مال اُن کے یہاں موجود ہے۔ جب یہ لوگ گرفتار کر کے کوفہ میں

Marfat.com

یوسف ابن عمر ثقفی کے پاس بھیجے گئے تو ان لوگوں نے قسم کھائی کہ خالد کا مال ان کے ذمہ نہیں ہے۔ چنانچہ یوسف نے ان کو رہا کر دیا اس کے بعد شیعہ زید کو قادسیہ سے کوفہ کی طرف لائے اور آپ سے بیعت کی۔ جو لوگ آپ کے ساتھ ثابت قدم رہے، زیدیہ کہلاتے ہیں اور جنھوں نے آپ کو چھوڑ دیا "رافضہ" کہلاتے ہیں صرف کوفہ میں زید کے ساتھ پندرہ ہزار آدمی موجود تھے، اس کے علاوہ مدائن بصرہ، واسط، موصل، خراسان، رے، جرجان، جزیرہ وغیرہ کے باشندوں نے بھی ساتھ دیا۔

۱۲۱ھ میں آپ نے لوائے خروج بلند کیا رفتہ رفتہ آپ کے رفیقوں نے آپ کو چھوڑنا شروع کیا یہاں تک کہ صف آرائی کے دن آپ کے ساتھ صرف تین سو آدمی تھے، امویہ کی طرف سے یوسف ابن عمر ثقفی دس ہزار فوج لیکر آیا تھا میدان کارزار گرم تھا کہ یوسف ابن عمر ثقفی کے ایک غلام نے جس کا نام "راشد" تھا ایک تیر مارا جس سے حضرت زید کی پیشانی زخمی ہو گئی آپ کو سواری سے اُتارا گیا آپ کا سر مبارک مسلم ابن محمد خیاط کی گود میں تھا، آپ کے صاحبزادے یحییٰ ابن زید تشریف لائے اور رو کر کہا "ابا جان! بشارت ہو کہ آپ حضرت رسول اللہ، علی، فاطمہ، اور حسن و حسین سے ملیں گے"، حضرت زید نے فرمایا "میرے عزیز بچے اب تم کیا کرو گے؟ حضرت یحییٰ نے جواب دیا "ابا جان میں تن تنہا بھی اُن سے لڑوں گا"۔ حضرت زید نے فرمایا "ہاں میرے بچے یہی کرو، چونکہ تم حق پر ہو اور وہ ناحق پر اگر انھوں نے تم کو شہید کیا تو تم جنت میں داخل ہو گے اور اگر وہ مارے گئے تو واصل جہنم ہونگے۔

Marfat.com

اس کے بعد تاریخ میں حضرت زید کا وہ حسرتناک انجام مرقوم ہے، جسے علامہ سراج الدین رفاعی نے اس طرح لکھا ہے[۵]:۔

پھر تیر آپ کی پیشانی سے، نکالا گیا اور اسی کے ساتھ آپ نے رحلت کی سعید بن خثیم کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہم لوگ آپ کو ایک چشمہ کے نزدیک لائے۔ جو ایک باغ کے اندر جاری تھا آپ کی لاش دفن کردی اور ہمارے ساتھ ایک سندی غلام تھا اس نے یوسف کو خبر کردی۔ صبح کے وقت آپ کی لاش چشمہ سے نکالی اور ایک کینہ میں سولی دیدی اور چار برس تک سولی پر لٹکائے رکھا (اس عرصہ میں، ہشام نے قضا کی اور ولید ثانی ابن یزید ثانی دسویں ۱۲۵ھ تا ۱۲۶ھ) نے یوسف کو لکھا کہ تم کو جس وقت میرا خط ملے فوراً اہل عراق کی طرف جاؤ اور (زید کو) جلا کر آپ کی خاک دریا میں منتشر کردو، یوسف نے سولی سے لاش اتاری اور جلا کر راکھ ہوا میں منتشر کردی۔

یحییٰ ابن زید شہید حضرت زید کے چار بیٹے تھے یحییٰ، حسین ذوالدمعہ، عیسیٰ موتم الاشبال، اور محمد۔ حضرت یحییٰ سب سے بڑے صاحبزادہ تھے، آپ لاولد مرے حضرت زید کی شہادت کے بعد آپ مدائن میں آگئے خلیفہ ولید اموی کے گورنر یوسف ابن عمر نے آپ کو بلایا آپ رے کی طرف چلے گئے وہاں سے نیشاپور اور سرخس میں آئے اس کے بعد یوسف نے نصر ابن سیار

[۵] صحاح الاخبار فی نسب السادۃ الفاطمیۃ الاخیار

Marfat.com

کی سرکردگی میں ایک فوج بھیجی تین دن تک سخت لڑائی ہوئی لوگوں نے جمعہ کے دن عصر کے بعد ۱۲۵ھ میں آپ کو جام شہادت پلا دیا۔ شہادت کے وقت آپکی عمر اٹھارہ سال کی تھی، آپ کا سر مبارک ولید کے دربار میں آیا، جسد مبارک سولی پر لٹکا دیا گیا، ولید نے سر مبارک مدینہ میں بھیجا کہ آپ کی والدہ ماجدہ حضرت بی بی ریطہ بنت عبداللہ بن محمد بن علی بن ابی طالب کے گود میں ڈالدیا جائے بی بی ریطہؓ حضرت شیر خدا کی پروتی تھیں آپ کی رگوں میں وہی خون جاری وساری تھا آپ نے سر کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور امویوں کی طرف خطاب کر کے کہا۔

شردتموہ عنی طویلا واھد — ایک عرصہ تک تم نے مجھ کو اس کا داغ فراق

یتموہ الی قتیلا صلوات اللہ — دیا اور اب، قتل کر کے اس کا تحفہ دیتے ہو

علیہ بکوۃ واصلا — اللہ تعالیٰ کی بخششیں اس پر صبح و شام ہوا کریں

ایک غیر متعصب طالب علم امویوں کی ان سیہ کاریوں کی داستان پڑھ کر حیرت میں آجاتا ہے کہ اموی مسلمان تھے یا ننگ اسلام!

بنو حسن کی سیاسی جدوجہد

بنو حسن نے بدسلوکیوں کے باوجود نہ تو قائم شدہ حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی نہ سیاسیات میں کوئی حصہ لیا تھا۔ علی ثانی (امام زین العابدین) کی اولاد عزت گزین زندگی گزارتی اور علمی و فلسفیانہ مشاغل میں مصروف رہتی تھی، انھوں نے خود کو بنی عباس

Marfat.com

کی سیاسی تحریکوں سے بالکل علیحدہ رکھا، البتہ زید شہید اور آپ کے صاحبزادہ نے مظلومیت کی بنا پر ہشام اور یزید کے خلاف اسلحہ اٹھایا اور اپنی زندگی قربان کر دی۔ بنو حسن اور بنو حسین مدینہ میں رہتے تھے اور بحی کچھی قلیل جائداد کچھ تجارتی منفعت اور مدارس کی غیر متعین آمدنی پران کی بسر ہوتی تھی لیکن اس فلاکت کے باوجود، مقامی باشندے ان کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، مدینہ میں خلفائے ثلاثہ عبداللہؓ بن زبیرؓ اور اکابر صحابہ کی اولاد بھی رہتی تھی، اور یہ سب علویہ کے ساتھ علاقہ رکھتے تھے۔ علویہ کے اس اثر ورسوخ اور عزت وبرتری کو دیکھ کر منصور عباسی کو خوف ہوا کہ جس آسانی کے ساتھ بنی مروان تباہ ہوگئے کہیں اس کا خاندان بھی نہ برباد ہو جائے۔ چنانچہ اس نے مختلف طریقوں سے پتہ لگانے کی کوشش کی کہ کہیں بغاوت کا سامان تو نہیں، اس نے اپنے آدمیوں کو یہ ہدایت کر کے علویہ کے یہاں بھیجا کہ وہ ان کے معتمد بن جائیں اور ان کو بلاخوف بولنے کی ترغیب دیں، تاکہ اس کو دار وگیر کے لئے حجت مل جائے اس طرف جب امویہ کی حکومت کو زوال ہو رہا تھا تو فطری طور پر علویہ اس سے دلچسپی لے رہے تھے، مدینہ میں ایک جلسہ ہوا جس میں بہت سے بنو حسن اور بنو حسین جمع ہوئے، منصور بھی اس میں شریک تھا۔ اس جمعیت میں امام حسن کے پوتے محمد جو بنو حسن کے سردار تھے، خلیفہ منتخب ہوئے آپ کی صداقت وشرافت اخلاق کے باعث آپ کو "نفس الزکیہ" کا لقب ملا تھا۔ سارے مجمع نے مع ابوجعفر منصور متفقہ طور پر آپ کی لیاقت وفضیلت کا اعتراف کرتے ہوئے آپ سے بیعت کی جب منصور تخت خلافت پر بیٹھا۔ اس ناقابل

Marfat.com

فراموش بیعت کی یاد سے اس کی زندگی تاریک نظر آنے لگی، اور اس کا شک قوی ہو گیا، اور اس نے محمد نفس الزکیہ اور آپ کے بھائی ابراہیم کو گرفتار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ لوگ فرار ہو گئے اس نے خاندان کے بڑے بڑے لوگوں کو گرفتار کیا جن میں ضعیف العمر حضرت عبداللہ محض اور آل عثمان کے سردار محمد العثمانی بھی شامل تھے جن کی صاحبزادی ابراہیم کی زوجیت میں تھیں ان کو پابہ زنجیر کوفہ میں بھیجا گیا اور قلعہ میں قید کیا گیا۔ محمد العثمانی کو اہل شام بڑے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، اس لئے اُن کی شخصیت بھی تخت عباسیہ کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی، چنانچہ آخر کار آپ کو کوڑے لگائے گئے اور پھر قتل کر دیا گیا۔ دوسروں کے ساتھ بڑی سختی کی گئی۔ یہاں تک کہ غریب مظلوموں نے اعتراف کیا کہ وہ اس لحاظ سے تو دور اموی ہی میں اچھی طرح بسر کرتے تھے محمد اور ابراہیم کی گرفتاری کے لئے چاروں طرف لوگ سرگرم تھے، بدؤں کو پانی کے مقامات پر متعین کیا گیا کہ وہ جاسوسی کریں۔ جن لوگوں پر پناہ دینے کا شبہ تھا ان کو کوڑے مارے گئے قید کیا گیا۔ آخر ناامید ہو کر محمد نے اپنے بھائی ابراہیم کو اہواز اور بصرہ کی طرف تحریک کے لئے بھیجا، اور خود مدینہ میں تشریف لائے، منصور کے عزل کا اعلان بیک وقت بصرہ اور مدینہ میں ہونا قرار پایا۔ اگر یہ کارروائی کامیاب ہو جاتی تو غالب گمان تھا کہ عباسیہ کی حکومت کا خاتمہ ہو جاتا لیکن محمد پر اُن کے بھائی کی تیاریوں کے قبل اعلان کرنے کا زور دیا گیا اور اس لئے منصور باری باری دونوں پر حملہ کرنے کے لائق ہو گیا منصور کا عامل جو مدینہ میں تھا گرفتار کر کے قید کر دیا گیا اور چند دنوں کے اندر سلسے

Marfat.com

حجاز اور یمن نے محمد کو دنیائے اسلام کا خلیفہ مان لیا۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک نے محمد کی تائید میں فتویٰ دیا۔ منصور نے جب اس تحریک کو توقع سے زیادہ خطرناک پایا تو اپنی رسمی روباہ بازی سے کام لیا اور محمد نفس الزکیہ کو ایک خط لکھا اور اُن کو اجازت دی کہ جہاں جی میں آئے رہیں اسی کے ساتھ ایک بڑے وظیفہ کی لالچ دی اور ان کے رشتہ داروں کے حق میں بھی رعایت کا وعدہ کیا۔ محمد نے اس کا جواب دیا کہ آمرزش اور مہربانی کرنے کا حق تو ہم کو ہے، کیونکہ حقیقت کے اعتبار سے خلافت میری چیز ہے، اور امان کے متعلق یہ لکھا کہ اس کی حقیقت اسی امان کی سی تو نہیں جو ابومسلم، عبداللہ علی اور یزید بن ہبیرہ کو دی گئی تھی۔ منصور اس تلخ جواب سے جل گیا اور اُس نے محمد نفس الزکیہ کو ایک طویل خط لکھا اور اس پر زور دیا کہ چونکہ آنحضرت نے کوئی اولاد ذکور نہیں چھوڑی اسلئے آپ کی صاحبزادی کی اولاد کو وراثت نہیں پہونچتی، بلکہ اس کی حقدار آپ کے چچا عباس کی اولاد ہوئی۔ منصور نے اپنے بھتیجہ کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ روانہ کیا تاکہ وہ نفس الزکیہ کو کچل ڈالے۔ جنگ کے قبل محمد نفس الزکیہ نے اپنے رفقا سے کہا کہ جس کے جی میں آئے میرے ساتھ رہے، اور جو جانا چاہے چلا جائے۔ اس پر آپ کے معاذین کی اکثریت نے اپنے اپنے گھر کا راستہ لیا اور آپ صرف تین سو آدمیوں کے ساتھ منصور کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے رہ گئے۔ آپ کے تمام ہمدرد ایک ایک کر کے شہید ہوگئے اور ان کی لاشیں حسب دستور دار پر لٹکائی گئیں اہلبیت کی ایک خاتون نے عیسیٰ سے اجازت لے کر مقتولین کو مدینہ کے نزدیک "روضۃ الشہدا،"

Marfat.com

میں دفن کردیا۔

اسمٰعیلیہ و ادارسہ عباسیہ نے فاطمیہ کو تباہ کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا، ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ وہ خراب و خستہ رہیں، لیکن فطرت اپنا اصول کب چھوڑتی ہے، جہاں تک ان کو ستایا گیا جہاں تک ان کی جمعیتیں پریشان کی گئیں، اتنا ہی لوگوں کے دل ان کے گرویدہ ہوتے گئے اور یہ بھی تاریخ کا عجیب و غریب واقعہ ہے کہ اس پریشان حالی بے سروسامانی اور فلاکت کے باوجود فاطمیہ کی دو زبردست حکومتیں اسمٰعیلیہ اور ادارسہ قائم ہو ہی گئیں۔ حضرت امام حسین کی اولاد نے باستثنائے حضرت زید و یحییٰ کوئی ایسی سیاسی تحریک نہیں کی، پھر بھی حضرت اسمٰعیل ابن امام صادق کی اولاد نے مغرب میں جلالت و شکوہ کے وہ کارنامے چھوڑے کہ دول اسلامیہ کی تاریخ میں ان کو ایک خاص امتیاز و اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے عبید اللہ المہدی سے فاطمیہ مصر کے آخری فرمانروا العاضد لدین اللہ (۲۹۷ھ تا ۵۵۵ھ) تک ڈھائی سو صدیوں سے زیادہ زمانہ ہوتا ہے، انھوں نے صقلیہ تک اپنی حکومت وسیع کی آل حسن نے عباسیہ کے لئے ایسی ایسی سیاسی نزاکتیں پیدا کردیں کہ منصور و رشید کے ہوش پراگندہ ہو گئے، محمد نفس الزکیہ اگر منصور کی طرح سیاسی چالبازیوں سے باخبر ہوتے تو آج اسلام کی تاریخ میں عباسیہ کی جگہ فاطمیہ و علویہ ہی نظر آتے، اگر رشید حضرت یحییٰ کو دیلم سے بلاکر زہر نہ دلا دیتا تو وہ دیلم کے بادشاہ ہو چکے ہوتے، اور تاریخوں میں "صاحب الدیلم" ہی کے لقب سے مشہور ہیں۔ حضرت عبد اللہ محض

Marfat.com

ابن حسن مثنیٰ ابن امام حسنؑ کے چار صاحبزادوں محمد، ابراہیم، یحییٰ، ادریس نے ظلم و ستم
سے اُکتا کر ایسی ایسی تحریکیں کیں کہ عباسیہ خوفزدہ ہو گئے لیکن سیاسیات کے مکر و فریب
سے باخبر نہ ہونے کے باعث اُن کو ناکامیاں ہوئیں صرف ادریس کو خدا نے مغرب
کا بادشاہ بنایا اور اس طور سے یہ دوسرا فاطمی خاندان ہے، جس کو حکومت و سلطنت
ملی۔ ۱۶۹ھ سے ۳۱۹ھ تک ان کی حکومت رہی۔ یحییٰ سوم کے زمانہ ۳۰۹ھ میں
دارالسلطنت مصر کا خاتمہ ہو گیا اس کے بعد ادریسی خاندان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم
ہوئیں جن پر ۳۱۹ھ میں امویہ اندلس اور اسمٰعیلیہ متصرف ہو گئے۔

یحییٰ فرمانروائے دیلم آپ صاحب الدیلم مشہور ہیں جیسا کہ مشہور نسابہ سیّد
عمید الدین حسینی نے بیان کیا ہے، آپ حضرت امام
حسن کے پوتے تھے، آپ کے والد کا نام عبد اللہ محض ابن حسن مثنیٰ بن امام حسن ہی
آپ خلیفہ رشید کے زمانہ میں بھاگ کر دیلم پہونچے وہاں کے باشندوں نے
آپ سے بیعت کی اور آپ کے پاس جمع ہو گئے، آپ کی شان و شوکت بڑھی،
ہارون الرشید کو اس کا بڑا صدمہ و قلق ہوا اُس نے فضل ابن یحییٰ برمکی کو لکھا
یحییٰ نے میری آنکھوں میں کانٹے چبھوئے ہیں، جو وہ چاہیں اُن کو دو اور اُنکی
طرف سے میرا اندیشہ دور کر دو، فضل بن یحییٰ ایک بڑا لشکر لے کر آ دھمکا اور خوف
و طمع ہر دو طرح سے اُن کو پیام دیا۔ یحییٰ نے امان طلب کی فضل نے رشید کے وکیل
کی حیثیت سے امان نامہ لکھ دیا بعض روایت میں ہے کہ آپ دیلم میں غلامی کی حالت

Marfat.com

یں پہونچے وہاں کے باشندوں نے ایک لاکھ دینار میں آپ کو فضل سے خرید لیا حضرت یحییٰ مدینہ میں چلے گئے اس قیام مدینہ کے زمانہ میں عبداللہ بن مصعب بن ثابت بن عبداللہ زبیرؓ نے آپ کے خلاف رشید سے کہہ دیا کہ وہ مجھ سے بیعت لینا چاہتے تھے۔ رشید نے دونوں کو بلایا یحییٰ بھی مدینہ سے آئے جب آپ کے زبیری (عبداللہ بن مصعب) کا سامنا ہوا تو اس نے کہا "تم نے ہمارے خلاف سازش کی اور ہماری حکومت کی تباہی کا ارادہ کیا"

یحییٰ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا تم کون ہو؟ رشید کو بے اختیار ہنسی آگئی: یحییٰ نے کہا یا امیر المومنین یہ شخص جو آج ہم پر تہمت رکھ رہا ہے ہمارے بھائی نفس الزکیہ کے ساتھ آپ کے جد منصور کے خلاف خروج میں شامل تھا اور یہ اسی نے کہا ہے،

قوموا ببیعتکم ننھض بطاعتنا ان الخلافۃ فیکم یا بنی حسن

ترجمہ:- اے آل حسن! اپنی بیعت کے لئے اٹھ کھڑے ہو، ہم تمہاری فرمانبرداری کیلئے مستعد ہیں خلافت تمہاری چیز ہے۔

اور اے امیر المومنین یہ شخص جو تہمت رکھ رہا ہے وہ آپ کی محبت اور آپ کی حکومت کے ساتھ ہمدردی رکھنے کا نتیجہ نہیں بلکہ ہم تمام اہل بیت کے ساتھ عناد بروری کا مظاہرہ ہے، میں حلف اٹھانے کو کہتا ہوں اگر وہ حلف اٹھائے گا کہ میں نے اس سے بیعت کے لئے کہا تھا تو پھر میرا خون آپ کے لئے حلال ہوگا"

Marfat.com

جب عبداللہ نے جھوٹا حلف لیا تو۔ یحییٰ نے کہا یا امیر المومنین مجھے تین دن تک حوالات میں رکھئے۔ اگر عبداللہ پر کوئی بلا نازل نہ ہو تو میرا خون حلال ہے، رشید نے یحییٰ کو فضل برمکی کے سپرد کیا۔ فضل روایت کرتے ہیں کہ اللہ کی قسم ہم نے ابھی اس دن عصر کی نماز بھی نہ پڑھی تھی کہ عبداللہ بن مصعب کے گھر سے چیخنے کی آواز آئی، میں نے دریافت حال کے لئے آدمی بھیجے معلوم ہوا کہ وہ جذام کے مرض میں مبتلا ہو گیا میں اس کے یہاں گیا لیکن میں نے اس کو نہیں پہچانا، وہ سیاہ کوئلہ کے مثل ہو گیا تھا۔ میں رشید کے پاس گیا تاکہ اس کو خبر دوں ابھی میں نے بات بھی پوری نہیں کی تھی کہ اس کی موت کی خبر آئی۔ مگر رشید کا ظلم تو دیکھئے کہ وہ اس پر بھی باز نہ آیا اس نے امان نامہ پھاڑ ڈالا، اور یحییٰ کو جیل خانہ میں بھجدیا، چند دن گذرنے کے بعد قاضی اور اہل دربار جمع ہوئے بعضوں نے کہا کہ امان نامہ صحیح ہے، اس میں کوئی خرابی نہیں۔ یحییٰ خاموش تھے حاضرین میں سے کسی نے کہا آپ چپ کیوں ہیں؟

آپ نے اپنے منہ کی طرف اشارہ کیا کہ مجھ میں بولنے کی طاقت نہیں اور اپنی زبان نکالی آپ کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا رشید نے کہا یہ تم کو وہم دلا رہے ہیں کہ ان کو زہر دیا گیا ہے۔ پھر آپ کو جیلخانہ میں واپس کر دیا اس کے بعد آپ کی کوئی خبر نہ ملی۔

آپ کے واقعہ شہادت کے متعلق مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہیں ایک روایت

ﮯ (نگار) حیرت ہے کہ یحییٰ کے خلاف جھوٹی قسم کھانے پر ایک شخص تو مبتلائے جذام ہو جائے۔ لیکن خدا ان لوگوں کو چھوڑدے جو واقعی ظلم وستم کے بانی تھے۔ اس نوع کی روایات ماننے میں مجھے بہت تامل ہے نیاز

Marfat.com

تو یہ ہے۔ کہ ایک حوض میں بھوکے شیروں کے سامنے چھوڑ دیا گیا اور وہ آپ کو نوچ کر کھا گئے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ سندی ابن شاہک کے گھر میں ایک کمرہ کے اندر بند کر دیا اور اس کو مٹی سے بھر دیا۔

ابو الحسین ابن علی عابد

آپ حضرت حسن مثلث ابن حسن مثنیٰ ابن امام حسنؑ کی اولاد میں تھے، آپ نے خلیفہ ہادی ابن مہدی عباسی کے زمانہ میں علویہ کی ایک جماعت کے ساتھ مکہ میں خروج کیا محمد ابن علی ابن عیسیٰ اور محمد ابن سلیمان بن منصور نے بمقام فخ ۱۶۹ھ میں آپ کو جام شہادت پلایا اور آپ کی گردن مبارک کاٹ کر خلیفہ ہادی کے دربار میں بھیجی، ہادی کو ان کی یہ حرکت پسند نہ آئی امام محمد تقی ابن امام علی رضا فرمایا کرتے تھے کہ کربلا کے بعد سب سے بڑی مصیبت واقعہ "فخ" ہے جو ہم لوگوں پر گزری۔

Marfat.com

زاہد فریب جوگن

عورت کائنات کے جمالیاتی پہلو کا سب سے بڑا حصہ ہے، اور اس سے تو کوئی انکار ہی نہیں کر سکتا کہ ہستی کے بہترین نقوش محض نسائیات کے منت پذیر ہیں یہ میں کسی خاص عصبیت یا نیایش کے رنگ میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ دعاوی اُن علمائے نفسیات کے ہیں جنھوں نے انسانی فطرت اور عملیات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اپنی کتابوں میں لکھے ہیں، فرانس کا ایک مشہور نفسی باڈوئن اپنی کتاب "تصریح نفسیات" میں علامہ فرائیڈ کا نظریہ تجدید (Sublimation) پیش کر کے انسان کے ذوق صناعانہ کو محض جذبہ جنسی کی متغیر صورت بتاتا ہے، فاسٹر اسکاٹ اپنی کتاب "شعور جنسی" میں فنون جمیلہ شعر و ادب، رقص و سرود الغرض کمالات اور نمود کمالات کو صرف جمالیات نسواں کا مظاہرہ ثابت کرتا ہے، اسی طرح میکڈوگل اپنی کتاب "نفسیات اجتماع" کے ایک باب شعور جنسی میں نفسیاتی اصول کے مطابق ان مباحث پر غور کرتا ہے کہ ادب لطیف اور فنون جمیلہ کو شعور جنسی سے کیا تعلق ہے اور اس تعلق کے کیا اسباب ہیں؟ وہ لکھتا ہے

"شعور جنسی اور صناعانہ پیداوار میں بہتر سے اعتبار سے ایک بلا واسطہ تعلق پایا جاتا ہے، تہیج جنسی کی تحریک جسم میں ایک قوت اور دماغ میں معمولی جذبہ اور ایک ناقابل

Marfat.com

تصریح آرزو پیدا کر دیتی ہے، اور یہ مزید قوت جس کے پیش نظر شعوری طور پر کوئی خاص
منزل مقصود نہیں رہتی اور چونکہ اُسے موقع اور حالات دستیاب نہیں ہوتے جہاں
یہ حرکت و خیال کے ذریعہ اپنی قوت کا مظاہرہ کرے۔ تو یہ ایسی حرکت و عمل کی صورت
اختیار کر لیتی ہے، جس میں ذاتی طور پر اس کا سامان سکون پیدا ہو جاتا ہے
جیسے بازیچہ گری (Gamboling) رقص و سرود وغیرہ، اگر یہ تسلیم کر لیا
جائے تو یہ دقت طلب مسئلہ حل کرنا باقی رہ جاتا ہے، کہ کیسے اور کیوں شعور جنسی کے
بر سر عمل لانے کے لئے یہ طریقے ایسی صورتیں اختیار کر لیتے ہیں جنھیں ہم لوگ اصطلاح
میں "صناعانہ" کہتے ہیں، غالباً فنون جمیلہ (Asthetics) کا بنیادی مسئلہ
ہے اگر ہم لوگ حیوانی زندگی کی سادہ سطح پر واقعات کا مطالعہ کریں تو میرا خیال ہے کہ
ہم لوگوں کو شعور جنسی اور ذوق صناعانہ کے باہمی ربط کی کنجی دستیاب ہو جائے گی
ہم لوگ شبہ نہیں کر سکتے کہ مادہ بلبل نر کے نغمہ کی بہ نسبت کسی دوسری آواز سے نہیں
تھرتھراتی اور یہ کہ نر کبوتر کی نشو و نما مادہ کبوتر کو زیادہ پسند ہے ان دونوں صورتوں میں
یہ صحیح ہے کہ شعور جنسی اس طریقہ سے منظم رہتا ہے کہ ان خیالات سے متحرک ہو جائے
شعور جنسی کی ترغیب مرد و عورت کے اندر ایک احساس لذت پیدا کرتی ہے، اور
یہ اس وقت بھی جبکہ اس کے (لذت) مزید حصول کا خیال بھی نہ ہو، اس کے ثبوت
ہم لوگ اس حد تک مطالعہ کرتے ہیں جس حد تک تہیج جنسیہ کی گدگدی کے ذریعہ صنعت
ادب، اور لطف عوام کی ادنی صورتوں پر عام دعوت نشاط دینے کے لئے اعتبار

Marfat.com

کیا جا سکتا ہے، جب مصوری اور نقاشی میں انسان کے حسین مرقعے تیار کیے جاتے ہیں تو اُن میں بھی یہی عنصر کارفرما رہتا ہے، لیکن یہ فنون اپنے اظہار کے اعلیٰ مدارج میں اِن چیزوں کو اس صورت میں پیش کرتے ہیں جن سے جذبات حیرت و احترام بھڑک اُٹھتے ہیں، اُس وقت نقاش یا مصور کی روش جذبات اعزاز و تقدیس سے بھری ہوئی رہتی ہے جو سلسلۂ خیالات پر تہیج جنسیہ کا استقرار قائم نہیں رہنے دیتے اور اسے (مصور) مظاہر جسمانیہ سے بچا کر اس کی اس قوت جنسیہ کو دوسری راہوں پر لگا دیتے ہیں[1]۔ یہ تفریحی قوت ایک ذہنی چستی پیدا کر دیتی ہے جس کی ضرورت خطوط، نور اور رنگ کا توازن و تناسب سمجھنے کے لئے لاحق ہوتی ہے، یعنی جو قوت شعور جنسیہ کی نمائش میں صرف ہوتی تھی اب خالص ادراک جمالیاتی کی چستی کے لئے وقف ہو جاتی ہے،

---

[1] اسی لئے مصورین اسلام کے کارناموں میں اکثر جسمانیات کے اعتبار سے کوئی جمال رائعہ نہیں پایا جاتا لیکن مصوری کے وہ تمام محاسن پائے جاتے ہیں جن کے اسباب حدوث پر میکڈاوگل نے سطور بالا میں بحث کی ہے، اسلامی مصوری ایک پیام روح ہوتی ہے اسکے بغور مطالعہ سے انسان کے قلوب میں ذکر و احساس کی ایک تموج پیدا ہو جاتا ہے اسلامی مصوری کو اگر مادی آرائشوں اور جسمانی کثافتوں کی نظر سے دیکھیں تو ایک فضول چیز سمجھ سکتے ہیں لیکن نیرنگئی خیال، پاکیزگی ذوق اور جمالیات روحانیہ کے اعتبار سے اسکی رفعت اور گرانمائگی کا اعتراف کرنا پڑیگا "مرقع چغتائی" میں ایک حد تک یہ خصوصیت پائی جاتی ہے لیکن فن سے قطع نظر، تاریخ، معاشرانہ فضا، (موجودہ) اور دعوت و تبلیغ کے اعتبار سے اس میں چند در چند نقائص موجود ہیں، اور میں کسی وقت ایک مستقل مضمون کے ذریعہ اس پر روشنی ڈالوں گا۔ ع۔م

Marfat.com

اسی کو اصطلاح نفسیات میں ،، اشتقاق جذبی Derived Emotion کہتے ہیں،
اور وہ قانون تجدید،، اسی کی ایک ارفع صورت کا نام ہے۔ جب انسان کے جذبات
حیوانیہ رفعت خیال اور علوئے روحانیہ کی اس منزل پر پہونچ جاتے ہیں تو اسی کو
قانون تجدید کا نتیجہ " یا ،، ارتفاع جذبہ " کہتے ہیں۔

جب انسان بلاواسطہ جذبۂ جنسی کی کامرانیوں میں فائز نہیں ہوتا تو یہ ولولہ دوسری
صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ یہیں سے ہم ارتقاء تمدن کا مسئلہ بھی حل کر سکتے ہیں جہانتک شہوات
بہیمیہ پر انسان قابو پاتا جائے گا، اس کا جنسی ولولہ روحانی لطافتوں کے ساتھ مل
کر جسمانیات اور مادیات کی دنیا میں وہی روحانی پاکیزگی، وہی باطنی لطافت۔ وہی روحانی
کیفیات پیدا کر دیگا جن کی بنا پر فنون جمیلہ اور ادب لطیف کی تخلیق ہوئی اعورت پیدا
ہوئی تو ایک قدرتی حسن اس کے ساتھ تھا اور اس کی فضائے ماحول میں ایک فطری
کشمش ہنگامہ آفریں تھی، مرد ازل سے ایک اثر پذیر دل لے کر آیا تھا اس نے جلوہ گاہ
ناز پر نظر ڈالی تو بیخود ہو گیا، درد اٹھا تو درماں طلبی سوجھی حسن کو غرہ، عشق کو نیایش، وہاں
انانیت، یہاں عبودیت، آخر سامانِ سکون ہو تو کیسے ہو۔ مجبوراً عشق نے دوسری تدبیریں
نکالیں اس نے پُر درد نغموں کے ساتھ اپنے جوش و ولولہ، اپنے جذبات و احساسات،
اپنی اثر پذیری و وارفتگی، اپنی درماندگی و بیچارگی کے حالات قلمبند کرنا شروع کئے،
اصطلاح میں اسی کا نام ،، غزل ،، ہو گیا۔ لیکن تصور نے بتایا کہ صرف روح اور خیال کی دنیا
اثر نہیں رکھتی، ناچار عشق نے چند مشت خاک یا ایک پارۂ سنگ سے دل بہلانا شروع کیا

Marfat.com

جمال یار کا نقشہ جا ہوا تھا اسی نقشہ کی مثال بنانا شروع کی، اور بڑی کاوش و محنت، بڑی شوق و ذوق، بڑے اہتمام و اعزاز کے ساتھ مجسمہ تیار کیا، مدتوں اُس کی پرستش کی، درد دل کہا، اشک حسرت بہایا، لیکن کوئی فائدہ نہ نکلا حسن نے شرط کی اور عشق سے عمارت بنوانی چاہی یہ مرد میدان تیشہ لے کر اُٹھا، اور پہاڑ کھود ڈالا، اور ایک خاص نشہ میں تنہا وہ کر گیا جو شاید سیکڑوں مل کر بھی انجام نہ دے سکتے، اس پر بھی ناکامی رہی، آخر کار ان تمام ہنگامہ آفرینیوں اور شورشوں کے بعد عشق اس نتیجہ پر پہونچا کہ اس وابستگی دامان جاناں، سے اتنے مراحل طے کرنے کے بعد بھی سرائیگی روح میں کمی ہوئی، نہ کوئی کامل لطف حیات میسر آیا، زحمت "من و تو" نے سرگردان رکھا، کیوں نہیں اپنی ہی عقدہ کشائی کی جائے کہیں میرا سکون اور بہجت روحانی میرے اندر ہی تو پنہاں نہیں عشق کی اسی آخری منزل پر پہنچکر رومی نے اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا ؎

من ز تو بے من و تو جمع شویم از سر ذوق   خوش و فارغ ز خرافات پریشان من و تو

فرائیڈ کے "نظریہ تجدید" کو میکڈاوگل نے بھی "نفسیات اجتماع" میں تسلیم کیا ہے اور یہ اس قدر اہم مسئلہ ہے کہ میکڈاوگل کے نزدیک فرائیڈ کے تمام افکار و آراء قابل اعتراض ہیں یا کم از کم ایسے ہیں کہ ان سے فاضل محقق کو اپنی کتاب میں استفادہ کرنے کی ضرورت نہ پڑی، لیکن فرائیڈ کے نظریہ تجدید پر میکڈاوگل کو بھی گردن تسلیم خم کر دینا پڑی۔ نظریہ تجدید کا ماحصل یہ ہے کہ جب اصل جذبہ بلا واسطہ اپنی نمایش میں کامیاب نہیں ہوتا تو دوسری صورتیں اختیار کر لیتا ہے، یعنی اب اُس کی نمایش تمدن اور معاشرت کے اقتبا

Marfat.com

سے نافع اور خوشگوار ہوتی ہے تو اُس کو قانون تجدید کا نتیجہ کہتے ہیں۔ میں نے علی حزیں (مطبوعہ نگار بابت اکتوبر ۱۹۳۳ء) کے سلسلہ میں لکھا تھا کہ غزل گوئی قانون تجدید کا نتیجہ ہے اور آج صوفیانہ ذوق کو اسی نظریہ کے ماتحت لانا چاہتا ہوں۔

صوفی ادبیات کی ایک مشہور تصنیف "منطق الطیر" سے کون واقف نہیں حضرت شیخ فرید الدین عطار اس کے مصنف ہیں۔ اور ایک مشہور فرانسیسی عالم گارسن ڈی ٹاسی کے فرنچ ترجمہ کی بدولت مغربی دنیا میں بھی اس نے کافی شہرت حاصل کر لی ہے، یہ وہی کتاب ہے جس نے رومی کے خیالات پر گہرا اثر کیا لے۔ اس میں حسن و عشق کی ایک ایسی روایت جمیل لکھی ہوئی ہے کہ پڑھنے کے بعد انسان دل ہی دل میں محسوس کرنے لگتا ہے کہ اُسے کوئی روحانی درس ملا، اُس کی روح بےچین ہونے لگتی ہے، اور یہ بےچینی شاید اس ساعت کی یاد کا نتیجہ ہوتی ہے جبکہ روح کو وہ بلند نشیمن حاصل تھا جہاں عشقیات و جمالیات کے سوا نہ کوئی دوسری چیز ہے نہ سکون، و بہجت روحانی کے علاوہ کوئی دوسرا منظاہرہ، یہی "صوفیانہ ذوق" جس کی بنا پر نکلسن اپنے "مقدمہ دیوان شمس تبریز" میں تصوف کو عشق و جمال کا مذہب بتاتا ہے، اور خود صوفیانہ فکر و عقائد میں سرشانہ نظر آتا ہے، میں

لے میں اس وقت اس مسئلہ پر بحث کرنا نہیں چاہتا، کہ منطق الطیر اور مثنوی رومی میں کیا علاقہ ہے، اور یہ تو ڈاکٹر نکلسن نے بھی لکھا ہے کہ مولانا روم جب قونیہ جا رہے تھے، تو نیشاپور میں حضرت عطار سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے اسرار نامہ دیا، رومی کی خصوصیاتِ شاعری اور یورپ کی موجودہ رومی پرستی، پر میں بہ تفصیل ایک تحقیقی مقالہ لکھوں گا جو جلد ہی شائع ہوگا ۱۲

Marfat.com

س وقت عورت کے صرف ذوق صوفیانہ اور اُس کے جمال بدیع کی زاہد فریبی پر
یک مختصر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔

شیخ صنعان ایک بہت بڑے عارف باللہ اور زاہد گزرے ہیں پچاس سال تک
رم میں چار سو مریدوں کے ساتھ زندگی بسر کی، ظاہر و باطن دونوں میں کامل زمانہ تھے
چاس مرتبہ حج کیا، زندگی بھر عمرہ کرتے رہے نماز روزہ کا خاص شغف تھا سنت کے
ایت پابند تھے، آپ سے کشف و کرامات بھی صادر ہوتے تھے۔ مختصراً یہ آپ کی
ندگی کے حالات تھے، لیکن انھوں نے چند راتوں تک مسلسل خواب میں دیکھا کہ میں حرم تے
ں راہ میں ایک مقام پر ایک بُت کو سجدہ کر رہا ہوں، خواب سے بیدار ہوئے تو سخت
ھبرائے، اپنے تزلزل ایمانی پر بہت نفرین کی، لیکن قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ قدرت
کرنا چاہتی ہے کرتی ہے خواہ اس میں دوسروں کو لذت ملے یا الم، ہمارے دکھ سکھ
ے علیحدہ ہو کر قدرت صرف اپنے نقوش و نگارش سے لطف حاصل کرنا چاہتی ہے،
چنانچہ شیخ صنعان نے مریدوں سے کہا کہ چلو روم کا سفر کریں تاکہ اس خواب کی تعبیر معلوم
و، چار سو مریدوں کی جمعیت طیار ہو گئی جب قافلہ ملک روم میں پہونچا تو وہاں ایک
ست بڑا محل نظر آیا اور اُس کے جھروکے پر آتش پرست کی ایک مہ جبین رعنا کی بیٹھی ہوئی
ظر آئی اُسکے حسن کچھ نکھار اور اعضا کی موزونیت میں سحر کی کیفیتیں تھیں حضرت عطار نے
س کے جمال رایعہ کی صفت میں پوری داد سخن سنجی دی ہے ؎

در سپہر حسن در برج جمال ! آفتابے بود اما بے زوال

Marfat.com

ہر کہ دل در زلف آں دلدار بست — از خیالِ زلف او زنار بست
ہر دو چشمش فتنۂ عشاق بود — ہر دو ابرو یش بخوبی طاق بود
روئے او در زیر زلف تابدار — بود آتش پارۂ بس آبدار
لعل سیرابش جہانے تشنہ داشت — نرگس مستش ہزاراں دشنہ داشت
گوہر خورشید وش در موئے داشت — بُرقع شعر سیہ بر روئے داشت

یہ تھی اس کے جمالِ بدیع کی ایک مختصر تفسیر، شیخ صنعان نے دیکھا تو بیخود ہو گئے اور ایسے کہ نہ اپنی شیخوخیت کا پاس رہا نہ مریدوں کا لحاظ، علم و فضل، زہد و ورع، عبادت و ریاضت کچھ کام نہ آئی۔

شیخ ایماں داد و ترسائی خرید — عاقبت بفروخت و رسوائی خرید

شیخ کی حالت بگڑی، مرید سخت گھبرائے، بعضوں نے ہمدردی سے نصیحت کی، بعضوں کو اس عشقِ پیرانہ سری پر غصہ آیا، نفرین کی، لیکن شیخ پر "برق طور" کام کر چکی تھی اُن کے مذہب عشق میں اب ترسازادی ہی وجود واجب کی حیثیت رکھتی تھی، وہی اُن کا کعبۂ ایمان تھی، اور وہی اُن کا سازِ ہستی! اپنی شد بد نہ رہی، مریدوں اور شیخ میں اس مسئلہ پر پُر لطف بحث و تمحیص شروع ہوئی اسے منطق الطیر میں ایک نہایت لطیف اسلوب سے بیان کیا گیا ہے ؎

مرید: ہمنشیں گفتش اے شیخ کبار — خیز و ایں وسواس را غسلے بیار
شیخ: شیخ گفتش امشب از خونِ جگر — کردہ ام صد بار غسل اے بیخبر

Marfat.com

مرید	وان دگر گفتا کہ تسبیحت کجاست	کے شود کار تو بے تسبیح راست
شیخ	گفت تسبیحم بیفگندم ز دست	تا توانم بر میان زنار بست
مرید	وان دگر یک گفتش اے پیر کہن	خیز و در خلوت خدا را سجدہ کن
شیخ	گفت اگر بت روئے من اینجاستے	سجدہ پیش روے او زیباستے
مرید	آن دگر گفتہ کہ اے دانائے راز	خیز و خود را جمع کن اندر نماز
شیخ	گفت کو محراب ابروئے نگار	تا نباشد جز نمازم ہیچ کار
مرید	وان دگر گفتش پشیمانیت نیست	ذرہ درد مسلمانیت نیست
شیخ	گفت کس نبود پشیمان بیش ازین	تا چرا عاشق نبودم پیش ازین
مرید	وان دگر گفتہ کہ ہر کہ آگاہ شد	کانچنان شیخے چنین گمراہ شد
شیخ	گفت بس من فارغم از نام و ننگ	شیشہ سالوس بشکستم بہ سنگ
مرید	آن دگر گفتش کہ یاران قدیم	از تو رنجورند و ماندہ دل دو نیم
شیخ	گفت چون ترسا بچہ خوشدل بود	دل ز رنج این و آن غافل بود
مرید	آن دگر گفتہ کہ با یاران بساز	تا رویم امروز سوئے کعبہ باز
شیخ	گفت اگر کعبہ نباشد دیر ہست	ہوشیار کعبہ ام در دیر مست
مرید	آن دگر گفت این زمان کن عزم راہ	در حرم بنشین و عذر خود بخواہ
شیخ	گفت سر بر آستان آن نگار	عذر خواہم خواست دست از من بدار
مرید	آن دگر گفتا کہ دوزخ در رہست	مرد دوزخ نیست ہر کہ آگہ است

Marfat.com

پیر	گفت اگر دوزخ بود ہمراہ من	ہفت دوزخ سوزد از یک آہ من
مرید	آں دگر گفتا بہ اُمید بہشت	باز گرد و توبہ کن زیں کار زشت
پیر	گفت چوں یار بہشتی روئے ہست	گر بہشتے بایدم آں کوئے ہست
مرید	آں دگر گفتا کہ از حق شرم دار	حق تعالیٰ را بہ خود آزرم دار
پیر	گفت ایں آتش چو حق در من فگند	من بہ خود نتوانم از گردن فگند
مرید	آں دگر گفتش برو ایمن مباش	باز ایمان آور و مومن بباش
پیر	گفت جز کفر از من حیراں مخواہ	ہر کہ کافر شد از و ایماں مخواہ

مرید مکالمہ سے آسانی کے ساتھ ہر شخص شیخ کی والہانہ زندگی اور از خود رفتہ شیفتگی کا اندازہ لگا سکتا ہے، خیر بڑی مشکل سے حضرت شیخ کے عشق کی پہلی رات تمام ہوئی، مریدوں کی تمام نصیحتیں، طنز آمیز لہجہ بیکار ثابت ہوئے صبح کے وقت پھر وہی ترسازادی کی گلی تھی اور حضرت شیخ کوچۂ یار کے کتے شیخ کی رفاقت اور انس کا سامان تھے۔ اسی طرح چند دن گذرے، شیخ نہایت رنجور ہوئے لیکن آستان یار سے نہیں ٹلے، آخر کار لڑکی کو بھی اُن کی شیفتگی کا حال معلوم ہو گیا شیخ سے تجاہل عارفانہ رنگ میں خطاب کرکے پوچھا کہ آپ کی اس بیقراری کا کیا سبب ہے؟ اب کیا تھا شیخ نے اپنی کیفیات عشق کا ایک دفتر کھول کر رکھ دیا، لڑکی بگڑی اور ایک ایسے لہجہ میں جس میں ظرافت خفگی اور حقارت کے تمام آثار تھے، شیخ سے کہا کہ حضرت، یہ کہنہ سالی اور آپ کا یہ طوفان عشق! جائیے کافور و کفن کا سامان کیجئے، بھلا آپ کو اس دنیا سے کیا سروکار، شیخ نے کہا ایسی ہزاروں صلواتیں سناؤ تو

Marfat.com

کیا، اب ممکن نہیں کہ اس دل سے تمہارا درد نکل جائے لڑکی نے کہا اگر آپ سچے ہیں تو مذہب اسلام ترک کیجئے۔ بت کو سجدہ کیجئے۔ قرآن کو جلائیے، شراب نوش کیجئے اور ایمان سے ہاتھ دھوئیے۔ شیخ نے ترک اسلام کیا، شراب پی اور کہا کہ بقیہ تینوں سے مجھے کوئی علاقہ نہیں نہ قرآن سے مطلب نہ ایمان سے غرض۔ دختر کی خلق آمیز مہربانی، شراب کا نشہ، عشق کا جنون۔ حضرت شیخ آپے میں نہ رہے۔ آتش پرست انھیں دیر میں لے گئے، زنار باندھا۔ شیخ نے دختر سے کہا یہ تمام مصیبتیں میں نے تمہارے وصل کے لئے اٹھائیں اب کیا کہتی ہو؟ اُس نے کہا اجی حضرت، آپ بوڑھے ہوئے کس خیال میں پڑے ہیں۔ میرا آپ کا جوڑ ہی کیسا؟ دل پر جبر کیجئے۔ اگر روپے کی ضرورت ہے تو لیجئے۔ جہاں سینگ سمائے چلے جائیے۔ شیخ نے کہا میں اور آستان یار سے جدائی، جو کچھ گذرے یہیں ہو گا لڑکی کا دل کچھ ملائم ہوا اُس نے کہا میرا مہر یہ ہے کہ میرے یہاں ایک سال تک خوک بانی (سور چرانا) کرو۔ شیخ نے یہ بھی اختیار کیا اور ایک سال تک خوک بانی کرتے رہے ابھی تک مریدوں نے شیخ کا ساتھ دیا تھا، لیکن اب سب کے سب اُن سے علیحدہ ہو گئے۔ اُن کی رفاقت ترک کر دی ایک مرید شیخ کے پاس آیا اور کہنے لگا یا تو ہم لوگ بھی آپ ہی کی طرح ترسائی اختیار کریں اور زنار باندھیں یا جلد از جلد اس سرزمین سے نکل کر خانہ کعبہ میں مقیم ہو جائیں تاکہ یہ دلگداز منظر نہ دیکھ سکیں، شیخ نے کہا تم لوگوں کا جہاں جی چاہے چلے جاؤ مجھے تو فقط دریار سے مطلب ہے۔ جب یہ لٹا ہوا قافلہ مکہ میں پہونچا تو سب ادہر اُدہر چھپ گئے، شیخ کا ایک مرید کہیں دوسری جگہ سے نماتما دیں آیا اور شیخ کی حالت

Marfat.com

دریافت کی، حالات معلوم ہوئے تو مریدوں پر خفا ہوا کہ اگر اُنھوں نے ترسائی اختیار کی تھی تو تم بھی ترسائی اختیار کرتے، اُنھوں نے زنار باندھا تو تم بھی زنار باندھتے، بیوفاؤ! ایسے وقت میں ترک رفاقت کر بیٹھے۔ چلو اور شیخ کی خبر لو، روم کے سفر کے لئے قافلہ تیار ہوا مُرید روم میں پہونچے تمام لوگ معتکف ہو گئے اور شیخ کے لئے دعائیں کرنے لگے، چالیس شبانہ روز اُنھوں نے گریہ وزاری کی، خواب و خور ترک کیا اسی حال میں تھے کہ چالیسویں دن اس جماعت زہاد کا جو امام تھا اُس نے خواب میں دیکھا کہ محمد مصطفٰے تشریف لائے۔ فضا خوشبو سے معطر ہے اور آپ تبسم فرما رہے ہیں لوگ نظارۂ جمال سے حیران ہیں، مُرید سرورِ کائنات کو دیکھ کر اپنی جگہ سے اُٹھا اور آپ سے فریاد کرنے لگا کہ یا رسول اللہ! ہمارے شیخ گمراہ ہو گئے ہیں اُنھیں راہِ حق کی ہدایت کیجئے، آپ نے فرمایا کہ اے بلند ہمت انسان جا، تیری دُعا کارگر ہوئی، تیرے شیخ کو میں نے ہدایت کی، شیخ اور خُدا کے درمیان میں بہت دنوں تک تاریکی تھی، میں نے اُس تاریکی کو دور کر دیا، یہ کلمات جانفزا کہہ کر آپ مرید کی نظروں سے غایب ہو گئے، جب وہ بیدار ہوا تو ایک روح نشاط اس کے جسم کے اندر موج زن تھی، اُس نے سب کو مژدہ سُنایا، سب لوگ شیخ کی خدمت میں گئے۔ دیکھا تو نہ اب شیخ کے منہ میں ناقوس تھا نہ کمر میں زنار، اُنھوں نے آتش پرستوں کی ٹوپی پھینکدی تھی، اور ترسائی کو خیرباد کہہ ڈالا تھا۔ مریدوں پر جب شیخ کی نظر پڑی، شرم سے کپڑے پھاڑ ڈالے اپنے سر پر خاک ڈال کر عاجزی کا اظہار کیا، کبھی آہ کرتے کبھی حسرت سے زرد ہو جاتے اب آپ کا ضمیر روشن اور دل نورِ ایمان سے مشرف

Marfat.com

ہو چکا تھا، تمام بھولے ہوئے کشف و اسرار یاد آ گئے۔ اب آپ روم کے وہ بُت پرست نہ تھے بلکہ فیضِ الٰہی نے آپ کی یزدان پرستی کی طرف رہنمائی کر دی تھی، مریدوں نے شیخ کو سمجھایا کہ حضرت اب اس قدر غم و حسرت، خجالت و ندامت کی ضرورت ہی کیا ہے، خدا نے آپ کی حق کی طرف رہنمائی کی۔ شیخ نے غسل کیا اور مُریدوں کے جھرمٹ میں حجاز کی طرف روانہ ہو گئے۔

ادھر اُس آتش پرست لڑکی نے بھی خواب میں دیکھا کہ میری گود میں ایک آفتاب آ گیا ہے، اور کہہ رہا ہے کہ شیخ کے ہمراہ جا، اُن کا مذہب اختیار کر، وہ راہِ حجاز چھوڑ کر تیرے مبتلا ہوئے اب تو ان کی راہ اختیار کر، تو اُن کی رہزن تھی، اب ان کی رفیقۂ سفر بن، لڑکی کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ قلب ایک بقعۂ نور بنا ہوا ہے اور دل میں درد کی ٹیک موجود ہے۔ ناچار شیخ کے پیچھے روانہ ہوئی۔ حضرت عطارؒ نے ایک خاص موثر انداز میں لڑکی کے جذبات وکیف کی ترجمانی کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

در میان آں ہمہ ناز و طرب	ہمچوں باراں اشک می ریخت لے عجب
نعرہ زن جامہ دراں بیروں دوید	خاک بر سر درمیان خوں دوید
با دلِ پُر درد و شخص ناتواں	از پئے شیخ و مُریداں شد رواں
می ندانست او کہ در صحرا و دشت	از کدامین سوئے می باید گزشت
عاجز و سرگشتہ می نالید زار	روئے خود در خاک می مالید زار
زاری گفت ای خدائے کارساز	عورتے ام ماندہ ام از کار باز

Marfat.com

مرو راہ چو تو ئے زار و زدم | تو مزن بر من کہ بے آگہ زدم
بحر قہاریت را بنشاں زجوش | می ندانستم خطا کردم بہوش
ہر چہ کردم بر من مسکیں مگیر | دیں پذیرفتم بریں بے دیں مگیر
گر بمیرم از کسے یارم نیست | حصّۂ دیگر بجز خواریم نیست

یعنی اس حسن بدیع اور جمال رائع کے ہوتے ہوئے وہ زار و قطار رو رہی تھی، کبھی کپڑے پھاڑتی، صحرا میں دوڑتی، لیکن فکر منزل سے آزاد ہو کر، کبھی خدا سے دعائیں کرتی، خداوندا! میں ایک مجبور عورت ہوں مجھے تو نے اپنا درد دیا، اب میری مدد کر، مجھ بیکس کا کہاں ٹھکانا، جب تیرے ایسے ایسے برگزیدہ بندوں کا یہ حال ہو جاتا ہے تو مجھ پر کیا گذرے گی میری دستگیری کر، میں نے شیخ کو برباد کیا لیکن تو مجھے برباد نہ کر اب نہ مجھے کسی سے محبت ہے نہ دوستی اگر میں مروں تو ذلت ہی میرا حصّہ ہے۔

ادھر شیخ کو کشف ہوا وہ باد صرصر کی طرح اس دلنواز روم کی طرف چلے، مرید چلائے کہ توبہ و استغفار کے بعد پھر عاشقی پر کمر باندھی، انھوں نے اس لڑکی کی حالت بیان کی، قافلہ چلا، اور جہاں وہ خدا رسیدہ عورت بھی پہونچا شیخ کو دیکھ کر عورت کو غش آگیا، شیخ کی اشک ریزی سے اُس کی آنکھیں کھلیں تو زار و قطار رونے لگی، اور اسی حالت زار میں شیخ کے پیر پر گر گئی، شیخ کے وہ تمام نقوش وفا اُس کی نظر کے سامنے آگئے، اُس نے ترسائی ترک کی شیخ کے ہاتھ پر اسلام سے مشرف ہوئی، اور کہا کہ اب یہ میری زندگی کی آخری گھڑیاں ہیں، مجھے معاف کر دیجئے اور میری گستاخیاں در گذر کیجئے، اور یہ کہہ کر آنکھیں

Marfat.com

بند کرلیں۔

این بگفت آں ماہ دست از جاں نشاند	نیم جانے بود بر جاناں فشاند

شیخ پر اس حادثہ نے گہرا اثر کیا اُن کی حالت بھی نازک ہوگئی، صبح کو لڑکی نے انتقال کیا تھا، دوپہر سے قبل شیخ نے بھی عالم بالا کا سفر کیا، شاید خواجہ فریدالدین عطار کی اس حکایت کے مطالعہ یا اسی قسم کے دوسرے مناظر سے متاثر ہوکر رومی نے وہ غزل کہی بھی جس کا ایک نہایت تاثر انگیز شعر یہ ہے ؎

تو باز خاص بدی در وثاق پیرزنے	چو طبل باز شنیدی بہ لامکاں رفتی

اس کے بعد حضرت عطار نے ایک ایسے موثر اور دلکش انداز میں "صور شعریہ" کی مثال پیش کی ہے، کہ بے اختیار دل رٹ جاتا ہے۔ مصر کا ایک جدید ادیب اور لفریب انشا پرداز ڈاکٹر زکی مبارک اپنی کتاب "موازنہ بین الشعراء" میں عربی شعرا کے اس کلام کی نظیریں پیش کرتا ہے، جن میں فنی اعتبار سے "صور شعریہ" پائے جاتے ہیں "صور شعریہ" یہ ہے کہ کوئی شاعر مناظر قدرت یا جذبات وکیفیات کی ایسی ترجمانی کرے کہ پڑھنے والے کو ہو بہو ایسا معلوم ہو کہ وہ کسی منظر فطریہ کا مشاہدہ کر رہا ہے یا خود اپنے ذہن کے اندر جذبات وکیفیات کا طوفان پا رہا ہے، اسی لئے ایک کامیاب شاعر وہی ہو سکتا ہے جس کے ذہن میں حقیقی مصوری کی صلاحیت ہو، شاعری اور مصوری دونوں ایک ہی مرکزی نقطہ کے دو خطوط ہیں، ہر چند ہر شاعر عملیات کے اعتبار سے مصور نہیں ہوتا، لیکن فنی اعتبار سے شاعر کا مصور ہونا ضرور ہے، اس کے خلاف مصور کے لئے ضروری نہیں کہ

Marfat.com

وہ شاعر بھی ہو، شاعری مصوری سے ایک بالاتر فن ہے، خیر ان چند اشاری سطور کے بعد میں حضرت عطار کی اس قدرت کلام کا نمونہ پیش کرنا چاہتا ہوں، جس میں ،،صور شعریہ،، بہ درجہ کمال موجود ہے اور منطق الطیر کی حکایات کے ان آخری سطور میں فطرت نگاری کا ایک ایسا زبردست نمونہ سامنے آجاتا ہے ،، جسے سحر نگاری ،، سے تعبیر کریں تو زیادہ مناسب ہے۔ حضرت عطار صوفی ہونے کے ساتھ ہی ایک بڑے پایہ کے شاعر بھی تھے اور اُن کی شاعری میں وہ تمام نقوش موجود ہیں جنھیں ادب لطیف گراں مایہ قرار دیتا ہے۔

یہ چند آخری سطور ملاحظہ ہوں۔

قبر شیخ و قبر دختر ساختند — ہر دو را پہلوئے ہم پرداختند
چوں دو عاشق را نماند ہوش ہم — چوں دو موزوں دست در آغوش ہم
زاں دو قبر آں دو یار دردمند — دست ازاں حسرت زدہ سرو بلند
وانکہ آنجا ایزد از لطف و کمال — کرد پیدا چشمۂ آب زلال
چند فرسنگ آں جہاں خرم بود — ہمچناں جائے بگیتی کم بود
گر رسی آنجا بہ بینی از خوشی — عرصۂ ہمچوں بہشت از دلکشی
گر دراں منزل ترا باشد قرار — چار فصل آنجا نہ بینی جز بہار
ہیچ فصل از میوہ خالی نیستند — تا نہ پنداری کہ عالی نیستند
ہر دو می آرند بار عاشقی — بوالعجب کاریست کار عاشقی
درمیان کعبہ و روم آں مقام — شد زیارتگاہ خلق از خاص و عام

Marfat.com

خلاصہ یہ کہ شیخ اور "زاہد فریب جوگن" کی قبر پہلو بہ پہلو بنائی گئی، قدرت نے
دونوں کی قبر سے دو سرو کے درخت اُگائے، اور وہ دونوں درخت اس طرح ملے
ہوئے ہیں گویا وہ جوگن اور شیخ اپنی ہم آغوشی کا پتہ دے رہے ہیں وہاں فطری مناظر
ایسے فرحت افزا اور دلکش ہیں کہ دنیا میں اس کی مثال نہیں مل سکتی، لطف ایزدی سے
وہاں میٹھے پانی کا ایک چشمہ بھی ہے، وہاں نہ خزاں کی ویرانگی ہے، نہ برشگال کی
صعوبت، ہمیشہ بہار ہی بہار ہے اور لطف یہ کہ چاروں فصل کے میوے بھی ہمیشہ موجود ہیں
یہ مقام کعبہ اور روم کی درمیانی راہ میں ہے یہاں خاص وعام کا میلہ لگا رہتا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ کسی قدرتی منظر کی اس سے بہتر مثال بھی مل سکتی ہے، فن تعمیر
کے ہزاروں دلکش آثار ملتے ہیں، انسانوں نے اپنی دولت وحکومت کے ذریعہ ہزاروں
اسباب آرائش اور یادگاریں بنائیں لیکن شاید ان میں ایسا جمال رائع نہ پایا جائے گا۔[۵]

مولانا جامی نے نفحات الانس میں بہتیری صالحات، عابدات کی زندگی کے حالات

---

۵ میں اپنے دوست چودھری عزیزالدین صاحب آروی کی معیت میں جب ایک بار نیسر گیا تو حضرت شاہ
نی نیسری قدس سرہٗ کے مقبرہ اور اس کے گرد وجوانب کے مناظر سے کچھ ایسا متاثر ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا
عض اعتبار سے ٹھیک وہی نقشہ تھا جیسا حضرت عطار نے بیان کیا ہے، میں نے ہوش سنبھالا تو خود کو ایک
یر مقلد (اہلحدیث) باپ کی گود میں پایا، میں خوش ہوں کہ میرا قدرتی حق یعنی حریت فکری میری تاریخ
ادت سے میرے ساتھ رہی اور یہ غیر مقلدین کے مسلک کا اہم جزو بھی ہے، نہ صوفی ہوں نہ بادہ پیمانہ
کن نیسر کے اس منظر نے سچ مچ ایک ایسے التہاب درد سے مجھے آشنا کیا کہ شاید یہ چاشنی مدت العمر ہوگا

Marfat.com

لکھے ہیں میرا خیال ہے کہ عورتوں کے تمام کمالات اور اُن کی نمائش مرد کے اندر وہی تخیلات متحرک کر دیتے ہیں جو شعور جنسی (Sex Instinct) کے لطائف سے پیدا ہوتے ہیں لیکن ذوق صوفیانہ اس سے مستغنی ہے اگر ہم کسی خدا رسیدہ عبادت گزار اور پاکدامن عورت کو دیکھ لیں تو ہمارے اندر احترام Admiration کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں، علمائے نفسیات کے نزدیک "احترام" ایک مخلوط جذبہ ہے جس کے اندر مختلف جذبی عناصر کار فرما رہتے ہیں، خود زاہدہ عورتیں اُسوقت کوئی نسوانی جھجک محسوس نہیں کرتیں بلکہ اپنے قلب میں ایک ایسا جذبہ لطیف محسوس کرتی ہیں جسے اصطلاح میں "جذبۂ مادرانہ" (Maternal Instinct) کہتے ہیں، جامی نے جس انداز میں قرون اولیٰ کی ایک جاریہ (لونڈی) بی بی تحفہ کے پاک حالات لکھے ہیں اور اُن کے ساتھ حضرت سری سقطی کی عقیدت و نیاز کے واقعات پیش کئے ہیں انہیں دیکھنے کے بعد نسائیات کا یہ اہم مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ عورت کی بہترین زندگی کیونکر گزر سکتی ہے، اُنکی حقیقی عظمت عاشقانہ شعر گوئی اور افسانہ تراشی میں ہے یا خانگی انتظامات، بچوں کی پرورش و تربیت، شوہر کی اطاعت و محبت، اور عبادت و ریاضت میں، عورت اپنے حسن اور عشوہ فروشی، اپنے ادبی ذوق اور موسیقی نوازی، مغربی تقلید و عریانیت، کورانہ حقوق طلبی اور مساویانہ کشمکش سے مردوں کے قلوب کو مسخر نہیں کر سکتی، ممکن ہے عارضی جوش خیر مقدم مردوں کی صحیح ذہنیت کا معیار متعین کرنے میں اُن کیلئے دقتیں پیدا کرے لیکن یہ انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ عورت ایک ادنیٰ سی درلغزش پا کے بعد کائنات کی زشت ترین چیز بنکر رہجاتی ہے اور کسی کے ہیجان "صنم پرستی" کی فریب خوردہ ہونے کے بعد وہ محسوس کرتی ہے کہ کاش دوسروں کے حالات "آیۃ الکبریٰ" بن کر اُس کی رہنمائی کرتے۔

Marfat.com

سلاطین آستانۂ فقر پہ

ایران کا ایک خوش فکر شاعر ظہوری ترشیزی جو اپنی طنزیات رندانہ کے لئے فارسی ادبیات میں ایک خاص امتیاز رکھتا ہے اپنے مزاحیہ لہجہ میں کہتا ہے۔

زاہد نام کعبہ خود نہ بری   مدہ آلودگی کنشتِ مرا

یہ وہ دور تھا جب زہد و ورع، فقر و درویشی اپنی شان بے نیازی و استغنا کی بدولت ایک قابل رشک چیز سمجھی جاتی تھی اور شعرا اپنی ندرت پسندیوں کے لئے اس کو ایک شگفتہ اور جاذب نظر موضوع خیال کرتے تھے، جب کسی شے کا کمال حقیقت مسلمہ بن جاتا ہے تو دنیا میں ہمیشہ یہ اصول رہا ہے کہ اس کے نقائص کی جستجو کی جاتی ہے، اس کے معائب ملشت از بام کئے جاتے ہیں، اس پر پھبتیاں اڑائی جاتی ہیں، اور یہی شے اپنے کمال و رفعت کے دور سے گذر کر ایک فرسودہ چیز بن کر رہ جاتی ہے تو پھر کسی کو اس کی طرف التفات نہیں ہوتی آج ظہوری زندہ ہوتا تو اس کی ندرت پسند طبیعت کبھی اس کو گوارا نہیں کرتی کہ اس قدر عام اور روزمرہ کے مشاہدات کو شعر و سخن کا موضوع قرار دے۔ بلکہ بجائے یہ خیال کرنے کے کہ زاہد اپنے کعبہ کا نام لے کر میرے بتکدہ کو آلودہ کر رہا ہے، وہ یہ کہتا کہ رند کی معصیت گاہ سے زاہد کے خلوت کدہ کی بو آتی ہے۔

Marfat.com

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ زہد و درویشی کی موجودہ بے مائگی فقرا اور گوشہ نشینوں کی زندگی کے موجودہ افسوسناک تجارب میں کبھی خلوص و پاکبازی کی جلوہ ریزیاں نہ تھیں اب ان کے اخلاق میں سلف کے لطائف طبیعت کی اثر آفرینی نہ سہی، ان کی خلوت میں جلوت میں یگانت مفقود ہو تو ہوا کرے، ان کے پندار خودی نے ان کو انتہائی انکسار کے پردہ میں کبریائی کا دیوتا بنا کر رکھ دیا ہو، ہو سکتا ہے، لیکن ایک زمانہ ایسا گزر چکا ہے، جب درویش فضل وکمال کا ایک ایسا نمونہ خیال کیا جاتا تھا کہ دنیا کے بڑی بڑی گردن کش اور جابر سلاطین اس کی آستان پاک پر جبہ سائی کو فخر جانتے تھے ایک وہ دور بھی گزرا ہے جب صاحب سطوت بادشاہوں اور ناز و نعم کی گود میں پرورش پانے والے امیروں نے انتہائی لاپرواہی اور بے نیازی کے ساتھ فقر کے مقابلہ میں جاہ و ثروت کو ٹھکرا دیا، محلوں کی آسائش میں بسر کرنے والے انسانوں میں ایسے لوگ گزرے ہیں جنھوں نے عرفان ایک جھلک دیکھ کر سارا سازِ نشاط درہم برہم کر دیا انھوں نے قصر کی راحت پر بادیہ پیمائی کو ترجیح دی وہ حسن کی بے مائگی کا احساس کر کے اس سے برداشتہ خاطر ہو گئے وہ بہار سے خزاں کا لطف لینے لگے، شاخسار چمن میں طیور کی نوا سرائیاں اُن کے گداز و رقت کا سامان بن گئیں، خیابان گلستان میں نسرین و نسترن کی پتیوں پر شبنم کے چھوٹے چھوٹے قطرے ان کو کسی باطنی خلش کی یاد دلا کر رلانے لگے، دنیا ان کے پیچھے سرگرداں تھی اور وہ اس سے غزال وحشی کی طرح گریزاں، امرا اور سلاطین ان کے پاس ہدیہ نیاز لے کر جاتے تھے اور ان کی بے نیازیاں ان کو بے پروا رکھتی تھیں ہندوستان کے لئے گوتم بدھ کی زندگی یقیناً

Marfat.com

مایۂ ناز ش ہے لیکن مشرق نے اور بھی ایسے ہی بزرگ پیدا کئے ۔ لوگ حضرت ابراہیم بن ادھم کا اسم مبارک زبان پر لاتے ہیں ڈاکٹر نکلسن کہتا ہے آپ کی زندگی گوتم کی تاریخ زندگی کو دہراتی ہے ذرا تاریخ دیسر کے صفحات اُلٹ جائیے آپ کو شاہ شجاع کرمانی (تیسری صدی)، خواجہ احمد بن حمدان (پانچویں صدی) رکن الدین علاؤ الدولہ (آٹھویں صدی) احمد بن محمد البیابانکی السمنانی، شاہ علی فراہی (آٹھویں صدی) خواجہ ابو احمد ابدال چشتی (چوتھی صدی) کے اسمائے گرامی نظر آئیں گے ۔ یہ لوگ تخت و تاج کے مالک تھے، سلاطین و امرا کے جگر گوشے تھے لیکن زندگی کی فریب کاریوں اور دنیا کی ابلہ فریبیوں کا راز ان پر کھل گیا وہ ،، مایا جال،، کی سحر طرازیوں سے واقف ہو گئے اُنھوں نے حکومت پر فقر کو ترجیح دی ۔

ایک بڑے سے بڑا جابر بادشاہ جب بزم درویشی میں پہونچتا ہے تو فقر کی ہیبت و وقار کے سامنے اس کا سارا پندار حکومت زائل ہو جاتا ہے ۔ اس کا کبر و نخوت اور اس کی انانیت محو ہو جاتی ہے اور وہ خلوص و نیاز کا ایک مجسمہ بن جاتا ہے گویا وہ ایک چینی عقیدت کیش ہے، جو کوان۔ان" (Kuan An) دیوی کے بُت کے سامنے نذر پیش کر رہا ہے یقین نہ ہو تو ذرا پیچھے مڑ کر ہند کے ماضی کا جائزہ لیجئے سلطان علاؤ الدین کیقباد (بادشاہ روم) شیخ بہاؤ الدین کے ہاتھ میں ہاتھ دیتا ہے تو اس کے سارے جسم میں کپکپی ہو جاتی ہے ۔ ناصر الدین قباچہ (حاکم ملتان) کے سامنے دو خطوط پیش ہوتے ہیں جو قاضی شرف الدین اصفہانی اور شیخ بہاؤ الدین زکریا نے سلطان شمس الدین التمش کو

Marfat.com

لکھے تھے اور ناصرالدین کے لوگوں کی بیدینی اور فسق و فجور کی شکایت کی تھی۔ ناصرالدین سخت برہم ہوتا ہے، قاضی کو اور خواجہ کو بلاتا ہے اور پوچھتا ہے کہ یہ خطوط تم نے لکھے ہیں؟ قاضی گردن جھکا لیتے ہیں، سلطان گردن مارنے کا حکم دیتا ہے فوراً وہ راہی عالم بقا ہوتے ہیں، اس کے بعد خواجہ بہاء الدین زکریا سے سوال ہوتا ہے، آپ نہایت بیباکی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ ہاں میں نے لکھا ہے اور حکم خدا سے لکھا ہے، تم کیا کر سکتے ہو؟ ابوالقاسم فرشتہ کہتا ہے ،، ناصرالدین قباچہ بعد از استماع آن لرزہ براندام افتاد،، سلطان محمود غزنوی حضرت خواجہ ابوالحسن خرقانی کو دربار میں بلاتا ہے آپ صاف انکار کرتے ہیں۔ خود حاضر خدمت ہوتا ہے تعظیم کو نہیں کھڑے ہوتے، جب سلطان رخصت ہوتا ہے تو آپ اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ محمود پوچھتا ہے، حضور! جب میں خدمت میں حاضر ہوا تو آپ تعظیم کے لئے نہیں کھڑے ہوئے، اب میں رخصت ہوتا ہوں تو تعظیم کیوں کرتے ہیں؛ خواجہ ابوالحسن خرقانی فرماتے ہیں پہلے تم پندار حکومت لے کر آئے تھے، اب انکسار درویشی لے کر جاتے ہو سلطان شمس الدین التمش خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے آستانہ پر جبہ سائی کے لئے آتا تھا، حضرت خواجہ معین الدین سنجری جب دہلی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مہمان ہوتے ہیں تو خواجہ قطب الدین عرض کرتے ہیں، اجازت ہو تو بادشاہ کو خبر کر دی جائے آپ صاف انکار کر دیتے ہیں اور ملنا نہیں چاہتے، علاؤالدین خلجی بایں شان و شوکت شیخ صدرالدین عارف اور شیخ رکن الدین ابوالفتح کی پیشوائی کے لئے سوار ہو کر جاتا تھا۔ سلطان فیروز شاہ بہمنی اور احمد شاہ بہمنی نے جس خلوص و نیاز کے ساتھ سید محمد گیسو دراز کا خیر مقدم کیا تھا

Marfat.com

کے صفحات شاہد ہیں۔ شیخ طاہر کے ساتھ برہان نظام شاہ کی عقیدتمندیاں، میر صالح ہمدانی کے ساتھ ابراہیم عادل شاہ کی ارادت، میر محمد مومن استرآبادی کے ساتھ قطب شاہ کا انعقاد صاف بتا رہا ہے کہ ارباب حکومت نے ہمیشہ آستانۂ فقراء پر جبیں سائی کی ہے یہ اور بات ہے کہ اب خود فقرا امیروں کے در پر لجاجت وتملق کا مظاہرہ کرتے ہوں۔

فقر و درویشی کی اس کایا پلٹ کا آخر کوئی راز بھی ہے؟ یہ سوال ہے جو قدرتی طور پر تاریخ درویشی کا مطالعہ کرنے کے بعد پیدا ہوتا ہے، فقرا کی بوریا نشینی وہی ہے، خانقاہوں کی رونق میں بھی کوئی فرق نہیں، اربعین (چلہ) وریاضت، ذکر وتسبیح کا ہنگامہ آج بھی دیکھا جاتا ہے، بیعت وارشاد کے مشاغل میں بھی گرما گرمی ہے بظاہر کوئی ایسی چیز نہیں جو آج فقرا کے یہاں ناپید ہو۔ پھر اس زوال کا سبب۔ اس کا صرف ایک راز ہے جس کو غالب کے رشتہ سے شاعرانہ نکات سمجھئے لیکن ہے یہ ایک حقیقت ؎

کفر و دیں چیست جز آلائش پندار وجود   پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دین تو شود

شاعر کہتا ہے کہ اپنی ہستی کے غرور کا نام کفر ہے۔ اور اسی آلائش ہستی سے پاک ہو جانے کا نام دین ہے، آج درویشوں اور فقراء پر جو بلا مسلط ہے وہ "پندار وجود" ہے اسی لئے شاعر مجبور ہو کر اس نتیجہ پر پہنچا ہے ؎

سبحہ و سجادہ دارد صد خطر   در پناہ ساغر و پیمانہ باش

Marfat.com

غربا تختِ شاہی پر

دنیا ایک بازیگاہِ فطرت ہے جہاں خرق والتیام شکست وتعمیر، علو وخفیض، غم ومسرت، اور اسی قسم کے سینکڑوں مظاہرے ہمارے لئے دعوت پریشاں نظری بن گئے ہیں۔ مناظر کی ان بوقلمونیوں کے ساتھ انسانی زندگی کی ایک اہم تقسیم نظر آتی ہے جسے امتیاز فقر وثروت، یا غربت وامارت سے تعبیر کیا جاتا ہے، ایک طرف تو ایک پرشکوہ قصر نظر آتا ہے اور دوسری طرف ایک خرابہ عبرت آگیں، ایک طرف زنگ بو ریشم وحریر، زر وطلا کی ایک عجیب وغریب دنیا دکھائی دیتی ہے۔ عالیشان قصر کے بڑے بڑے کمرے زرکار پردے، نقرئی وطلائی ظروف، برنجی وسنگی مجسمے ماہرانہ نقاشیوں وصناعیوں کا ایک دلکش جلوہ گاہ بن گئے، احاطہ کی وسعت اور چمن وفواروں، طیور ووحوش نے اس قصر ارضی کو ہماری اس دنیائے آب وگل سے کوئی جداگانہ بستی بنا رکھا ہے۔ پھولوں کی نکہت، طیور کی نغمہ سنجیاں، فواروں کا ابل ابل کر خیابان چمن میں بہنا۔ رومانیت کا ایک ایسا بے پناہ منظر پیش کررہا ہے کہ انسان تخیل کی دنیا میں گم ہوجاتا ہے، "ورڈ سورتھ" اور "کالرج" جن کو نقادانِ فن "جھیل کے شعرا" کے نام سے پکارتے ہیں۔ قدرت کی دنیا میں اسی معصوم رومانیت پر مٹے ہوئے تھے اسی

Marfat.com

تناسب سے ایک غریب کی جھونپڑی کہنگی و شکستگی، ظلمت و بے کیفی کا دلگداز منظر پیش کر رہی ہے۔ یہاں ریشم و طلا کی جگہ کاسۂ سفالیں و خرقۂ پارینہ نظر آتا ہے۔ یہاں نہ شعر و موسیقی کی وہ روحانی کیفیتیں ہیں نہ رنگ و بو کی دلربائیاں زندگی یہاں تعبیر ہے، ایک سوزِ دروں سے قدرت کے ساتھ ایک شکوۂ بہم سے اور الم و حزن کی اس دنیا سے جو کبھی ہومر، گرے اور میر جیسے "دردمند" شعرا پیدا کر دیتی ہے، ایک فلسفی جب امعان نظر سے اس پر غور کرتا ہے تو اس کے دماغ میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے تو وہ قدرت کے اس انتخاب اور ذوق چمن آرائی پر نکتہ چینی کرتا ہے، ایک امیر دوسرا غریب کیوں ہوا، ایک ساز و نشاط دوسرا سوز و غم میں کیوں بسر کرتا ہے دنیا ایک کو سر آنکھوں پر کیوں بٹھاتی ہے اور دوسرے کو بلا کسی جرم و تقصیر کے نظر سے کیوں گراتی ہے؟ خیال و تصور کی خارزار وادیوں میں وہ بہروں آوارہ پھرتا ہے! بہت سے کلیات قائم کرتا ہے اور مسترد کر ڈالتا ہے۔ آخر کار ایک دوسرا سوال پیدا کرتا ہے امیر و غریب دونوں میں پہلے کس کا وجود ہوا؟ اب قدرت کے خلاف اس کے شبہات ٹلنے لگتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ ایک فخمندانہ تبسم کے ساتھ قنوطیت سے رجائیت کی طرف کھنچنے لگتا ہے۔

اُمید کی ضوفشانیاں اس کے اندر ایک متفاول روح پیدا کر دیتی ہیں اب وہی دماغ جو قدرت کے خلاف شکوہ سنجیوں اور نقاش فطرت کی صلاح کاریوں پر خردہ بینی سے کام لے رہا تھا، ہنگامۂ ہستی اور زر و خود ہی کا امتحان لیتا ہے، جب حقیقت یہ ہے کہ امارت کا وجود غربت کے بعد ہوا تو ظاہر ہے کہ غریبی ہی امارت کے درجہ تک پہنچی ہوگی

Marfat.com

اب سوال یہ ہے کہ انسان اپنی موجودہ کم ردری دلبستی، اپنی موجودہ بے سروسامانی و خلاکت پر رو رو کر زندگی بسر کر دے یا قدرت کی طرف سے اس کے ذمہ کوئی دوسرا زلیفہ ہے، تھوڑی دیر کے لئے اس خشک اور بے کیف بحث کو چھوڑیئے اور شعروادب کی دنیا میں آیئے، عہد شاہجہانی کا مشہور شاعر میر صیدی کہتا ہے ؎

براہ انتظارش گر گداز دتن چہ خواہد شد　　　زاعضا چشمے وپائے چو نرگس لب بود ما را

اُمید کی یہ انتہا ہے صیدی کا یہ شعر شاعرانہ جھوٹ نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے ایک عاشق ایام فراق کی مصیبتیں اٹھاتے اُٹھاتے جاں بلب ہے، قویٰ مضمحل ہو گئے. عناصر میں اعتدال باقی نہ رہا، ناکامیاں ساتھ ہیں لیکن اللہ رے آرزو کی بے پناہیاں! دیوانہ عاشق اب بھی محبوب کے انتظار کی مصیبتیں اُٹھانے کے لئے تیار ہے. جان جا رہی ہے تو جائے تن خاک میں مل رہا ہے تو ملے، لیکن وہ کہتا ہے کہ نرگس کی آنکھیں اور پیر مجھ سے مل جائیں کہ ٹلنے کے بعد محبوب کے رُخ محبوب کا نظارہ کرسکوں اسی کو انگلستان کا مشہور شاعر "شیلی" کہتا ہے، "اُمید اپنے ویرانہ سے پھر وہ چیز پیدا کرتی ہے جس کا اُسے خیال ہوتا ہے"۔ "ٹینی سن" اسی "طاقتور" اُمید کے متعلق لکھتا ہے "انسان کو انسان بناتی ہے"، "کیمبل" اُمید کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

زندگی کی تاریک راہ کا جمال تیرا ہی حصہ ہے، وہ جمیل تاریکی جو افسردہ دلولہ کو مصروف بازی بنا دیتی ہے۔

اُمید و یاس کے فلسفہ پر مشرقی و مغربی شعرار کی رنگین بیانیاں سُن چکے آیئے

Marfat.com

ماہرین نفسیات کی فلسفہ طرازیاں دیکھئے۔

شلینڈ کہتا ہے:۔

""امید آرزو کی تیزی بڑھا دیتی ہے، مصیبت کے رد کرنے میں معاون ہوتی ہے، اور دبا دینے والے جذبات کے اثر سے محفوظ رکھتی ہے اور دونوں صورتوں میں حصول غرض کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، اُمید ہمیشہ مستقبل کو حال سے بہتر صورت میں پیش کرتی ہے اور اس صورت سے آرزو کو مستحکم کرتی ہے""

میک ڈاؤگل رقم طراز ہے:۔

""اُمید حصول کے خوشگوار خیال کی معاون ہوتی ہے، اور رغایت آرزو کو پختہ کرتی ہے اس کے برعکس افسوس میں ناکامی کے الم انگیز خیال سے ہماری آرزو میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، افسوس میں ہم لوگ جھکے ہوئے سر اور ڈھلے ہوئے بازؤں سے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہیں۔ اس صورت میں ہم لوگ اپنی آرزو میں اپنی پوری قوت کے ساتھ تازگی پیدا کرتے ہیں یعنی اس وقت ہم کو اپنی خودی کا خیال آتا ہے، ہم اپنے بیدار وجود میں اشتعال دیتے ہیں۔

اسی طرح فلسفہ قنوطیت کے متعلق شینڈ (Shand) نے کلیات اربعہ پیش کئے ہیں وہ کہتا ہے کہ یاس آرزو میں ایک ایسا زور اور

Marfat.com

ارادہ میں ایسی قوت پیدا کرتی ہے، کہ ہم نہایت خطرناک اور غیر متعین حرکات کر بیٹھتے ہیں یاس ساری اُمید کو آرزو سے نکال دیتی ہے اور یاس کا وجود ہی اس وقت ہوتا ہے جب ساری اُمیدیں محو ہو جاتی ہیں یاس اس آرزو کو کمزور کر دیتی ہے جو اس سے اثر پذیر ہوتی ہے۔ لیکن اس آرزو کو مضبوط کر دیتی ہے جو اس پر فتح پالیتی ہے۔

پروفیسر میک ڈاؤگل ,, ادبی اصطلاح ،، ,,یاس کی ہمت،، کے متعلق لکھتا ہے جب تک ہماری غایت آرزو کا حصول ناممکن نہیں ہو جاتا۔ ہم ہشیاری اور خبر گیری کے ساتھ اپنے مجوزہ لائحہ عمل پر گامزن رہتے ہیں اور ہر زینہ پر صورت حال کے مطابق متردد انہ خیال کے ماتحت عمل کرتے ہیں لیکن جب ہم لوگ دیکھتے ہیں کہ ہماری کل ہشیاریاں اور دانشمندانہ مجوزات بے فائدہ ہیں تو ہمارے ہاتھ سے ذاتی تصرف کی عنان چھوٹ جاتی ہر ہماری دانشمندانہ کوششیں درہم برہم ہو جاتی ہیں اور ہم نیم وحشیانہ رجحانات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم پر ان رجحانات کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ جن کو ہم نے اپنے تدبر و ہوشیاری سے دبا دبا کر رکھا تھا اب ہم آنکھیں بند کر کے خالص بہیمانہ اور وحشیانہ انداز میں تگ و دو کرتے ہیں۔

ہیوم کہتا ہے :-

,,ہم جیسے تکمیل آرزو کے استحالہ سے واقف ہوتے ہیں ویسے ہی خود آرزو

Marfat.com

ہی ناپید ہو جاتی ہے۔"

پروفیسر میک ڈاوگل کہتا ہے کہ یہ ایک حقیقت کی پیچیدگی ہے۔ حق یہ ہے کہ جب ہمارے ذہن میں غایت غرض کے حصول کا ناممکن ہو جانا معلوم ہو جاتا ہے تو اس کے بعد ہماری تمام کوششیں آخر ہو جاتی ہیں ہم لوگ یا تو حصول غایت کی طرف قدم سعی بڑھاتے ہیں ہم لوگ مافات کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں لیکن آرزو۔ "حسرت" کی شکل میں قائم رہتی ہے شیخ علی حزیں نے اپنے شاعرانہ انداز میں حسرت کا یہی فلسفہ پیش کیا ہے ؎

ازیں دہشت کہ ہجرانے مبادا در کمیں باشد ‌‌ ‌ ‌ ز حسرت ہر نگاہ من نگاہ واپسیں باشد

فرض کرو تم ایک دوست کو مصائب میں مدد دینے کے آرزومند ہو لیکن تم نے بہت تاخیر کر دی اور اس کو مرنے سے بچانے میں ناکافی تدبیریں کیں اس وقت بھی تمہاری آرزو بالکل ناپید نہیں ہو جاتی بلکہ ایک صورت سے یہ زیادہ تیز آہنگ ہو جاتی ہے، تم کہتے ہو۔ "میری کیسی خواہش ہوتی ہے کہ میں فی الفور تدبیریں کرتا"، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اب بھی تمہارا دل اس آرزو کا مستقر ہے اور گو اب کچھ نہیں ہو سکتا پھر بھی تم سب کچھ کر ڈالنے کے آرزومند ہو اگر تم اس وقت ضرورت کی اہمیت محسوس کرتے، ہر ایسے خیال کے اندر جو ہم ظاہر کرتے ہیں ایک محروم اور خوں شدہ آرزو الم کی رنگ آمیزی کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے ایسی طرح وری ہوئی آرزو جس کی تکمیل اب نہیں ہو سکتی اسی کو حسرت کہتے ہیں اور اگر ذاتی ملامت اس کیفیت میں داخل ہوتی ہے، تو "ندامت" کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

یہ تو فلسفیوں اور شاعروں کی خیال آرائیاں ہوئیں ذرا تاریخ کے ورق الٹ جائیے

Marfat.com

صرف اسلامی تاریخ کو لیجیے، آپ کو ایسے ہزاروں افراد اور خاندانوں کا حال ملے گا جنکو زمانہ نے نہایت حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا لیکن وہ اپنی محنت اور کارگزاریوں کی بدولت دنیا میں آفتاب بن کر چمکے اصل زندگی کی افتتاح جذبات کی پامالی سے شروع ہوتی ہے، اگر ناتواں کو یہ احساس ہو جائے کہ وہ کمزور ہی توپھر اسکی برق قہر بڑے بڑے جابرہ اور زور آوروں کے خرمن پندار کو جلاکر خاک سیاہ کر ڈالے گی اگر کوئی بڑا انسان اپنی مشیخت اور بزرگی کا صحیح احساس کرے تو اُس کے بُرے دن زیادہ دور نہیں۔ دنیا میں ازل سے یہی ہوتا آیا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ بدیہیات کا انکار کیونکر کیا جا سکتا ہے، مختلف شاہی خاندان کے بانیوں کی زندگی پر ایک نظر کیجیے۔ صفاریہ کا بانی یعقوب لیث ایک بُت تراش کا لڑکا تھا سامانیہ کا بانی اسمٰعیل ایک چرواہا تھا یا رہزنی کیا کرتا تھا۔ سلسلہ دیالمہ کا پہلا شخص ابو شجاع بویہ ماہی فروش تھا خوارزم شاہیہ کا مشہور حکمراں سلطان تکش بقول صاحب زینۃ التواریخ ملک شاہ سلجوقی اور دوسری روایت کے مطابق سلطان سنجر کا طشت دار تھا، ملوکیوں کی حکومت کا حال معلوم ہے۔ دہلی کے غلام بادشاہوں سے کون نا آشنا ہے، دکن کے بہمنی خاندان کا بانی علاء الدین حسین ایک برہمن کا غریب نوکر تھا عادل شاہی خاندان کا بانی یوسف سادی ایک چرکسی غلام کی حیثیت سے بہمنی دربار میں مول لیا گیا تھا اسی طرح قطب شاہیوں کا بانی سلطان قلی قطب شاہ نظام شاہیہ کا بانی ملک نائب نظام الملک بحری اور عماد شاہیہ اور بریدشاہیہ کے بانی فتح اللہ عماد الملک اور قاسم برید سب غلام تھے۔ حکومت فاروقیہ کا بانی ملک راجہ فاروقی سلطان فیروز شاہ بہمنی کا ایک معمولی نوکر تھا لیکن

Marfat.com

کیا ان عظیم الشان شخصیتوں کو ان کی افتادگی و بیچارگی، ان کی کمزوری و بے سروسامانی نے مضمحل کر دیا کیا یہ واقعہ نہیں کہ جو آنکھیں ان کو ذلیل سمجھ کر نظروں سے گراتی تھیں انھیں نے ان کو آنکھوں سے لگایا، صفاریہ کے رعب و سطوت نے بغداد کے ایوان خلافت میں ہل چل ڈال دی، عضد الدولہ دیلمی کی عظمت کا ادنیٰ کرشمہ یہ ہے کہ وہ خلافت عباسیہ کا حقیقی تاجدار بنا رہا، خوارزمشاہیہ کا ایسا نصیب چمکا کہ مشہور بزرگ خواجہ بہاؤالدین ولد (مولانا رومی کے والد) کی ننہیال ہوا آج صوفیہ فخر و مباہات کی حیثیت سے خواجہ بہاؤالدین ولد کو اس خوارزمشاہی خاندان کا رشتہ دار بتاتے ہیں کیوں؟ اس لئے کہ وہ منصب طشت داری سے بادشاہت تک پہونچ گئے حالانکہ اگر یہ فخر کی بات ہوسکتی ہے تو خوارزمشاہ کے لئے، وہی قطب شاہ غلام سے بادشاہ ہوتا ہے۔ تو شاہ طہماسپ صفوی جیسا رفیع المرتبت بادشاہ جو نہ صرف ایک مشہور بزرگ کی اولاد تھا بلکہ فاطمی الاصل بھی تھا اس سے رشتہ جوڑتا ہے۔ اسی طرح فاروقیہ کے اچھے دن آئے تو ان کے یہاں حکومت کے ساتھ بیعت و رشاد کا بھی سلسلہ شروع ہوا۔ دنیا والوں کی روحانی ارادت بھی انکے شامل ہوگئی۔

اسی طرح شاہی خاندان کے آخری فرمانرواؤں کے حالات و نفسیات پر بھی ذرا غور کر لیجئے، جب عجز کی جگہ پندار و انکسار کی جگہ نخوت اور محنت کی جگہ تن آسانی نے لے لی تو پھر کیا ہوا؟ جا کے ابوعبداللہ (خلیفہ غرناطہ) سے پوچھئے، المستعصم سے سوال کیجئے، شاہ کلیم اللہ بہمنی کے حسرت انگیز واقعات کا مطالعہ کیجئے۔ غلاموں کے آخری فرمانروا

Marfat.com

کا حال پڑھیئے، مبارک شاہ خلجی کی درد بھری کہانی سنئے، یا پھر اپنے عہد سے قریب تر مغلیہ خاندان اور بہادر شاہ ظفر کے مآل پر غور کیجئے خود ظفر کہتے ہیں ؎

نہ پائے گا کوئی ہم کو برنگ نقش قدم ہم ایسا خاک میں اپنا نشاں ملا دینگے

آج جو اپنی کبریائی میں بھولا ہوا ہے کل اس کو دنیا کے سامنے خراب و خستہ ہونا ہے، ماحول پر ایک نظر کیجئے کیا کل جن کا اکابر دا عاظم میں شمار ہوتا تھا آج وہ نان جویں اور ستر پوشی کو محتاج نظر نہیں آتے، علم ان سے رخصت ہو چکا عزت ان کی خاک میں مل چکی اب ان کے پاس سوائے بزرگوں کی باقیات کہلانے کے کچھ نہ رہا اور جب تک اس "مئے شبانہ کا نشہ" ان کو رہے گا ان کی نشاۃ الثانیہ کی کوئی امید نہیں بلکہ قدرت کا انتقام ان کے لئے اس سے بدتر خستگی و بے پناہی کا متمنی ہی، تاریخ ہمیں پکار پکار کر کہتی ہے لیکن ہمارے بدن پر جوئیں نہیں رینگتیں، ہیئت اجماعیہ کا انقلاب ہمیں درس عبرت دے رہا ہے لیکن ہم اپنی خودی اور روایاتی بزرگی پر مطمئن ہیں

"مساوات" کے اغراض و مقاصد اور ان کی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، فرقہ وارانہ ارشاد و بلاغ کے لئے اس کی افادیت مسلم، لیکن ذرا غور تو کیجئے کہ اس "کمزور و ناتواں" کا اطلاق مسلمانوں کے کن کن طبقات پر ہوتا ہے، اب وقت تو یہ ہے کہ مسلم جماعت کے ہر ہر طبقہ کی اصلاح کی جائے۔ نہ صرف "بنی فاطمہ" کی اصلاح دبہبودی سے اسلام کی ترقی ہے، نہ جمیعتہ الانصار د مومن کے فروغ سے مسلمانوں کا ہر طبقہ آج ذلت و افتادگی کی حالت میں ہے یہ اور بات ہے کہ بعض لوگ اپنے خلوتکدوں میں

Marfat.com

بیٹھ کر ماضی کے چند لغو و مہمل داستانوں کو دُہرا کر اپنی مٹی ہوئی عظمت و برتری پر ماتم کر لیا کرتے ہیں۔ اور یہی اُن کے لئے مایۂ نازش ہے۔ ممکن ہے آج بھی مسلمانوں کے بعض طبقات غریب مسلمانوں کو ذلیل سمجھتے ہوں اہل حرفہ کو اپنے سے نیچا خیال کرتے ہوں لیکن یہ وقت ان سے انتقام لینے اور شیرازہ اسلامی میں انتشار پیدا کرنے کا نہیں کوئی گدا سے خاکستر نشیں اگر اپنی حماقت کی بنا پر خود کو مالک تاج و تخت سمجھ بیٹھے تو کیا ہم اسے اُلجھیں گے یا اُس کے خبط (MANIA) کو حسن تدبیر سے دور کرنے کی سعی کریں گے مسلمان اگر ترقی چاہتے ہیں تو یہ اُن کو فرقہ وارانہ جذبات کی پرورش میں میسر ہونے والی چیز نہیں۔ بلکہ ایک عالمگیر "انسانی درد" ایک کلی اخوت سے حاصل ہو سکتی ہے یہ وقت فرقہ بندیوں کے بے مایہ و رکیک تخیل میں اُلجھنے کا نہیں بلکہ سب کو ایک روحانی دائرہ میں جمع کر دینے کا ہے البتہ دنیا کو ایک مخلص پیامبر کی ضرورت ہے۔ جو نبی برحق کے نقوش قدم پر چل کر عصبیت و جہل، تکبر نفس اور پندار وجود کو مٹا دے اور وہی خلوص وہی محبت پیدا کر دے جو مہاجرین کو انصار سے اور انصار کو مہاجرین کے ساتھ تھا آہ! آج ہم وہ پیام فراموش کر بیٹھے، لوٹ کا مال ہے مہاجرین و انصار دونوں برابر کے حقدار ہیں۔ دونوں نے لڑائی میں سینہ سپر کیا ہے، لیکن انصار کی حالت اچھی ہے۔ مہاجرین خانماں برباد ہیں۔ بے پناہ ہیں مغرور قریش کے وہی افراد جو کبھی انصار کو میدان رزم سے یہ کہہ کر واپس کر دیتے تھے کہ تم ہماری برابری کے نہیں، آج انصار کے زیر سایہ ہیں کیا اس وقت انصار نے انتقام لیا، کیا اسوقت انھوں نے بھولی بسری باتوں کو دہرا کر مہاجرین کو شرمایا؟ نہیں

Marfat.com

والذین تبوؤالدار والایمان من	وہ لوگ جو ان سے (مہاجرین سے) پہلے
قبلهم یحبون من هاجر الیهم ولا	گھر والے مومن ہیں جو کچھ ان (مہاجرین)
یجدون فی صدورهم حاجة مما	کو دیا جاتا ہے اس کی ضرورت
اوتوا ویوثرون علی انفسهم ولو	(اپنے لئے) نہیں محسوس کرتے اور اپنی
کان بهم خصاصه (حشر)	جانوں سے ایثار کرتے ہیں گو تنگدستی

خدا کیلئے آپ اعلیٰ خیال کئے جاتے ہوں یا ادنیٰ، آپ پہلے اپنے خیالات کو استوار کر لیجئے، اگر آپ کو کوئی بڑا خیال کرے تو اس پر مغرور نہ ہو جئے کیونکہ اسی استعلا اور استکبار نے فراعنہ مصر کو برباد کیا اگر آپکو کوئی چھوٹا اور ذلیل سمجھے تو سمجھنے والے کی فہم کا قصور ہے وہی نہیں کہ آپ کی توہین کرکے اپنی تنگ دلی اور سطح نظر کا ثبوت دے رہا ہے، بلکہ آپ کو ایک شاندار مستقبل کا پیام دیتا ہے۔ اس کو سمجھئے کہ وہ میرا ایک بھائی ہے جو ہم کو ذلیل کرکے اپنے ہی ماں باپ کو رسوا کر رہا ہے۔

"مساوات" غریب اور کمزور مسلمانوں کا ہمدرد ہوا یں لا اللہ بردوح منہا مگر سوال یہ کہ کمزور اور مسلمان کون ہیں؟ شاید "مساوات" کا مطلب قریشی اور غیر قریشی مسلمانوں میں امتیاز کرنا ہو اگر یہ ہو تو واقعات اس کے مخالف ہیں آج صرف صوبہ بہار کے قصبات اور دور دست دیہاتوں میں گھوم کر دیکھئے ہزاروں سادات و شیوخ کے بچے علم و اخلاق سے معرا اور اسی طرح فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں۔ ممکن ہو ان میں "روایتی بزرگی" کا فخر باقی ہو، لیکن ان کے کردار نے ان کو صد درجہ قابل رحم بنا دیا ہے کیا مساوات ان کی حمایت کے لئے بھی تیار ہے؟

Marfat.com

خاتونِ صحرا کے نام

ساون بھادوں کے مہینہ میں جبکہ سارا "ٹھل" ایک دشت زمردین بنا ہوتا ہے "دُھوا" ندی جوش پر ہوتی اور اس کی خوفناک موجیں اس کا حوصلہ آزماتی تھیں، اس کی بیتاب روانی بڑے بڑے تیراک دیہاتیوں کو بھی تنہا عبور کرنے نہیں دیتی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ حمزہ پورے بھرے جوہڑ تک سارا لق و دق بیابان ایک بحیرہ کی شکل اختیار کر لیتا۔ فصلیں برباد ہو جاتیں، میں شیروانی، پاجامہ اتر کی ٹوپی، جوتے ایک بقچہ میں باندھ لیتا چھتری بغل میں دباتا۔ قمیص جسم میں چپکی ہوتی، بھیگی ہوئی لنگی لپٹی ہوتی پیر ٹخنوں تک کیچڑ مٹی سے آلودہ ہوتے، لیکن "رجالِ کعبہ" کا فرطِ شوق، منزل کی دشوار گزاریوں کو بھی خیال میں نہ لاتا۔ میں چل کھڑا ہوتا، اور کبھی دن کو برسات کی بوچھاروں میں کبھی آدھی رات گئے جبکہ ساری کائنات ایک ظلمت کدہ معلوم ہوتی۔ کشتی سے اس ساحل دلنواز پر اتر جاتا۔ جو اجین کی سی کافرہ آفریں اور حسن خیز سرزمین کی طرح اپنے دامن میں ایک حدیثِ حال چھپائے ہوئے ہے۔

جیٹھ کا مہینہ ہے سارا دن قومِ عاد والے "صرصرِ عاتیہ" کی نذر ہے۔ ٹھیک اس وقت جبکہ آفتاب نصف النہار پر ہوتا اور بادِ سموم کا تموج انسانوں کو میدان سے ہٹا کر

Marfat.com

گھروں اور جھونپڑیوں میں زاویہ نشین بنا دیتا میں فتوحہ سے پا پیادہ خسرو پور آتا اور حمزہ پو
طے کرتا ہوا تین میل تک پھیلے ہوئے اُس پُر خطر وادی میں قدم رکھ دیتا جس میں اکثر مسافر
پانی کے لئے تڑپ تڑپ کر مر چکے ہیں اس سنسان دشت میں جس کو "دودھوا" کی روانیا
"دریہ مین" کی جوش آفرینیاں بڑی دور تک وادی نجد کی طرح ریگ زار بنا دیتی ہیں
ایک ہُو کا عالم ہوتا ہاں دور دور پر کاشتکار مصطفیٰ پور ہتون چک نورنگر دغیرہ
کھیتوں کے سامنے منہ چھپٹے "ددوا ہیں" کرتے ہوتے ہیں شہری زندگی کے اسی پیکر میں
اس آستان محبوب پر پہنچتا جس پر خدا جانے موسم کی صعوبتوں کے باوجود میں کتنی بار جبہ
سائیاں کر چکا ہوں۔
بستی سے ابھی نصف میل کی فصل ہوتی کہ گاؤں کے بچے، رشتہ کی بزرگ عورتیں، جا
سالہ کی بوڑی میری پھوپھی (جو میری خوشدامن بھی ہیں) میری چھوٹی بچی کو لیکر دروازہ پر
انتظار کرتی ہوتیں، میں تیزی سے ایک محبوبانہ پندار کے ساتھ قدم بڑھائے جاتا۔ گاؤں
کا ہر فرد مجھ سے ایک اُنس رکھتا تھا اور اس کا ہر ذرہ میرے لئے سامان سکون تھا گھنٹوں
مجھ سے خیریت پوچھی جاتی فرداً فرداً مرد عورتیں آکر ملتیں، میری بھاوجیں جمع ہو
اور مجھے اس قدر سیراب لطف کر جاتیں کہ میں کچھ گرانی سی محسوس کرنے لگتا اور پھر مجبو
راستہ کی صعوبت کا بہانہ کر کے۔ بستر پر لیٹا ہوا آنکھیں بند کر لیتا، جب میں واپس آتا تو
وہ سماں بھی حد درجہ لذت آگیں ہوتا۔ مجھے وداع کرنے کے لئے سارے لوگ جمع ہوتے
کبھی ایسا نہ ہوتا کہ لذت سے سرشار ہو کر میری آنکھیں پرنم نہ ہو جاتیں، زندگی کے سات

Marfat.com

سال دسمبر ۱۹۲۶ء سے جنوری ۱۹۳۵ء تک محجوبیت کی اسی منزل میں بسر ہو گئے۔ ماضی
کا جائزہ لیتا ہوں تو اب یہ خواب کی باتیں معلوم ہوتی ہیں نومبر ۱۹۳۴ء میں خدا نے مجھے
تیسرا فرزند دیا اسے میں نے مجد الدین ر؟ بغدادی) کے نام سے پکارا ولادت کے سلسلہ
میں کچھ طبیعت ناساز ہوئی گھر میں کوئی دیکھنے والا نہ تھا، پیہم اصرار ہوا، میں نے وجہ
معقول دیکھ کر سب کو مجبور بھیج دیا، میں واپس ہونے لگا تو میری (زاہدہ) نے ایک ایسی
نگاہ حسرت آگیں سے دیکھا جو پیکان کی طرح میرے دل میں پیوست ہو کر رہ گئی۔

گاؤں سے باہر ہوا تو میں نے مڑ کر اپنی سسرال کے مکان پر نظر ڈالی۔ خدا جانے
شعور نے مستقبل کے ان سوگوار ایام کا کیونکر ادراک کر لیا کہ دل بھر آیا سخت رقت طاری
ہوئی، ظہوری کہتا ہے ؎

ہوش آگاہی وگر دارد تا ظہوری شدہ است بیہوشت

مجھ پر ایک غیر معمولی کیف غم طاری تھا، میں اس سے قبل بھی زاہدہ کو چھوڑ کر آیا تھا
اور اس میں شک نہیں کہ یہ وقت میرے لئے ازبس صبر آزما ہوتا تھا لیکن اس مرتبہ درد
و حزن نے والہانہ انداز اختیار کر لیا تھا۔ انہیں حقائق کی بنا پر انسانی مسلمات کی حد
بندیاں ٹوٹ جاتی ہیں، ہمارا تعقل و تدبر ہماری نکتہ دانی واصول فہمی الغرض ہمارا سارا
کارگاہ حکمت و فراست ناکارہ ثابت ہوتا ہے اور ہمیں روایاتی سطح سے ہٹا کر ایک
ایسی دنیا میں پہونچا دیتا ہے جہاں ہم ماورائے عقل و شعور کی کارفرمائیوں کا مشاہدہ کرتے
ہیں والٹر ایٹکنسن کہتا ہے۔

Marfat.com

"دنیا میں شعراء اور فلاسفہ کی دو جماعتیں ہوتی ہیں ایک جماعت تو اپنے داخلی تاثرات کی بنا پر کوئی پیام دیتی ہے۔ دوسری جماعت انسانی عقل و تجارب اور مسلّمات متداولہ کی بنا پر کسی خیال کا اظہار کرتی ہے، یہ فرق و امتیاز آپ کو ہربرٹ اور پوپ جیسے شعراء، اسپینوزا، کینٹ، اور کالرج جیسے فلاسفہ اور لاک، پیلے، میکنٹوش اور اسٹوارٹ جیسے فلسفیوں میں ملے گا۔ یہ امتیازی شان آپ دنیا کے بڑے بڑے باکمال خطیبوں اور ادھر اُدھر کے مست صوفیوں میں پا سکتے ہیں ان میں ایک جماعت تو اپنے اندر سے بولتی ہے اور دوسری باہر سے کلام کرتی ہے[1]۔"

اگر فطرت بخل سے کام لیتی اور انسان کو تعقل و تدبر کی سطح سے بلند کر کے کبھی کبھی اس نوع کا کشف حجاب نہ کرتی تو واقعہ یہ ہے کہ مذہب کے مسائل روح و معاد وغیرہ کی تبلیغ بڑی حد تک ناکامیاب رہ جاتی مشرق تو ہمیشہ سے ماوراء طبیعت کا گہوارہ رہا ہے۔ مغربی علماء بھی جن کو نوامیس فطرت کی رازدانی کا بڑا ادعا ہے۔ اس منزل پر پہنچکر اپنی درماندگی کا اعتراف کر چکے ہیں۔ چنانچہ جرمنی کے مشہور قیافہ شناس جان کیسپر لاوٹیر کے ایک واقعہ زندگی سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

اگست ۱۷۷۳ء میں جان کیسپر لاوٹیر نے "رچرڈ سویل" (Richard Sual) کا سفر کیا تاکہ اپنے دوست ڈاکٹر "ہوز" سے ملاقات کرے جب وہ وہاں پہنچا تو اس نے اپنی اہلیہ کو ایک خط لکھا کہ میری صحت اچھی ہے اور کوئی حادثہ واقع نہ ہوا، لیکن

---

[1] Subconcious & Superconcious planes of mind

Marfat.com

دوسرے ہی دن اُس کی اہلیہ بے چینی سی محسوس کرنے لگی۔ اس کی روح مضطرب ہوتی گئی اور اس کے دماغ پر ایک عجیب تاثر کی کارفرمائیاں ہونے لگیں اس پر یہ خیال بری طرح طاری ہونے لگا کہ اس کا شوہر کسی خطرناک مصیبت میں گرفتار ہوا، یا کسی ہلاکت آفریں خطرہ میں گھرا ہے۔ وہ بالائی کمرہ سے نکل کر زینہ سے اتری اور اپنے خسر سے اپنی تشویش اور درد کا حال بیان کیا اس نے کہا کہ کل ہی تم کو ایک خط تمہارے شوہر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ملا ہے جس میں اس نے اپنی صحت وسلامتی کی خبر درج کی ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ تم ان توہمات کو راہ دو، اس جواب نے تھوڑی دیر کے لئے عورت پر ایک سکون آفریں اثر کیا لیکن جیسے ہی وہ اپنے کمرہ میں آئی۔ انھیں غمناک خیالات سے مغلوب ہو گئی۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر ٹیک گئی اور التہاب غم میں زار و قطار رو کر اپنے شوہر کی صحت وسلامتی کے لئے دعائیں کرنے لگی، یہ وہ ساعت تھی جبکہ لاڈیر ایک چھوٹی سی کشتی پر مذ درنج» کی جھیل سے گزر رہا تھا تاکہ ایم ڈینیلز، سے جو ایک معزز وزیر تھا ملاقات کرے اسی وقت ایسا طوفان اٹھا کہ مقتول وغیرہ نذر آب ہو گئے، اور ملاح خود ہی کشتی کو بچانے سے مایوس ہو گئے تھے لاڈیر کو بھی موت سے قریب ہونے کے خطرات تھے، جو بالکل قطعی معلوم ہوتے تھے، بہت ہی تشویشناک تاثر کے ساتھ وہ اپنی بیوی اور بچوں کو یاد کر رہا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا کہ اب وہ ان کو اس عالم آب وگل میں نہ دیکھ سکے گا۔ اسی حالت میں وہ اپنی رستگاری کی دعا کرنے لگا۔ یہاں تک کہ خدا نے مدد کی اور کشتی طوفان سے نکل آئی

Marfat.com

اور جو لوگ اس پر تھے، صحت و سلامتی کے ساتھ ساحل پر پہنچ گئے۔[۱]

"ایم لاوٹیر" نے اس طرح کا ایک واقعہ جو پروفیسر سولزر کے متعلق ہے اپنے ایک دوست کو ایک خط میں لکھا ہے، پروفیسر نے لاوٹیر سے کہا کہ جب اس کی عمر بائیس سال کی تھی تو یکایک اس پر ایک غیر معمولی غم و تشویش کا غلبہ ہوا لیکن ظاہر حالت کے ماتحت اس کا سبب اس کو معلوم نہ ہوتا تھا اس کے دماغ پر یہ خیال غالب ہوا کہ اس کی ہونے والی بیوی اس وقت ایک سخت خطرناک حادثہ میں مبتلا ہو گئی ہے، درآنحالیکہ اس وقت تک نہ تو اس نے شادی کا تہیہ کیا تھا نہ اس ہستی سے جو آئندہ چل کر اس کی بیوی ہوئی اس کو کوئی واقفیت تھی دس برس کے بعد جب اس کی شادی ہوئی اس وقت وہ یہ حادثہ بالکل فراموش کر چکا تھا اس کو اپنی بیوی سے معلوم ہوا کہ جب وہ دس سال کی تھی تو وہ اس بری طرح گر پڑی تھی کہ گویا مر چکی تھی اور اس کے جراحت انگیز اثر سے اس کو کامل افاقہ نہ ہوا۔

صوفی ادبیات میں اس نوع کی بے شمار روائتیں پائی جاتی ہیں مادیین ان روایات کشف و کرامت کو افسانوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے اس میں شک نہیں اس صنف کے بہت سے اجزا ارمریدوں کی خوش اعتقادی کی پیداوار ہیں لیکن ہم کو یہ بھی حق نہیں کہ سرے سے ان واقعات کا انکار کر دیں عام انسانوں کی زندگی میں

---

[۱] ترجمہ ٹامس ہلکرلفٹ Essays on Physiognomy By Lavater. (English Edition)

Marfat.com

جب ماورا رشعور کی ایسی عجوبہ آفرینیاں پائی جاتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ کسی برگزیدہ صوفی کے صدور کرامت کے ہم منکر ہوں والکر اٹیکنسن کہتا ہے: "جو قلب خود کو عقل کے حوالے کر دیتا ہے وہ خود کو اس کے تمام کاموں سے وابستہ پاتا ہے اور مخصوص معارف اور قدرتیں اس کے زیرنگیں ہو جاتی ہیں، ہر انسان کے اندر صلاحیت موجود ہے کہ وہ "عقل کل" سے سیراب ہو، بڑے بڑے صوفیا وانبیا سے وجد، حال اور الہام وغیرہ کے واقعات منسوب ہیں وہ انفرادی حالت کے فرق وامتیاز کے مظاہرے ہیں، سقراط کا حال، فلاطینوس کا وصل، فرانیری کا شہود، پولوس کا تزکیہ بہن کا" اور وروہا سویڈنبرگ کی تجلی انفرادی صلاحیت کے نتائج ہیں لیکن ان تمام مظاہروں کے عناصر ہم عام زندگی میں بھی پاتے ہیں گو وہ اس اعلیٰ پیمانہ پر نمایاں نہیں رہتے"

الغرض میں چل رہا تھا، دل بیٹھا جارہا تھا، آنکھیں اشکبار تھیں، بستی پر جو نگاہ پڑتی تھی وہ نگاہ واپسیں بن کر ٹھیر جاتی تھی یہاں تک کہ اسی استغراق میں بستی سے دور نکل گیا اب اس کے در و دیوار آنکھوں سے اوجھل ہونے لگے۔ لیکن میرے غمناک تصور کا سلسلہ اس وقت تک ختم نہ ہوا جب تک میں مکان پہنچکر "غم روزگار" میں مبتلا نہ ہو گیا۔

ابھی پندرہ دن بھی نہیں گزرے تھے کہ ۲۴ جنوری ۳۵ء کو جمیل بھائی کا ایک تار ملا "تمہاری اہلیہ خطرناک طور پر بیمار ہیں"، بس اب نہ پوچھئے۔ میر ضیاء کا ایک شعر ہے

کیا کہا قاصد ضیاؔ سنتے ہی جسکے مرگیا — بات تھی کچھ یاس کی یا ہجر کا پیغام تھا

باحالِ زار شب ہی کو روانہ ہوا۔ اور دن کے ۹ بجے بھوجپور پہنچا، میری بیوی

Marfat.com

کی حالت میرے خیال میں خطرناک نہ تھی، میں نے تار کو جمیل بھائی کے اضطراب کا نتیجہ تصور کیا لیکن آہ! ابھی تیسرا ہی دن تھا کہ اتوار کے روز تقریباً ایک بجے دن کو میری آغوش میں ایرہ نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔

ایرہ کے خاندان میں بہت سے لوگ ہیں پانچ پانچ بھاوجیں، خالہ کے بیٹے، چچا کے بیٹے، حقیقی بھائی ان کے بچے ماں، باپ، پھوپی، خالہ، گاؤں کی عورتیں، الغرض کوئی ایسا نہ تھا جس نے نوجوان خاتون کی موت پر آنسو نہ بہائے ہوں، سارے گھر میں ایک کہرام مچا تھا، ایک ٹیس پڑی تھی؎

یہ ماتم کس دوانے کا ہے یارب آج صحرا میں
کہ سیلیں روتی پھرتی ہیں بگولے خاک اڑاتے ہیں

مجھے تو یاد نہیں آتا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے کسی کی موت پر ایسی خونفشانیاں دیکھی ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری کائنات میں تاریکی چھا گئی، زندگی کے لئے نہ اب کوئی لطف باقی رہا نہ کوئی کیف، سیلاب اشک تھمتا نہ تھا۔ ہفتے گزرے، مہینے گزرے یہاں تک کہ سال گزرا لیکن میرا دورِ حزن ختم نہ ہوا۔ میری خیالی دنیا اب بھی ”ایرہ“ سے آباد تھی خواب میں وہ آتیں، مسکرائیں، مہر و پیار کی باتیں کرتیں اور ماضی کے ایام نشاط کی یاد دلا جاتیں، مجھے ہیولاک ایلس کے اس نظریہ سے بالکل اتفاق ہے کہ محض شباب کی سرمستیاں ہی عورت و مرد کی محبت میں کارفرما نہیں ہوا کرتیں۔ گوئٹے کو ”فرددان اسٹین“ ڈیگنر ”کو میتھلڈ ویسنڈراک“ اور ”رابرٹ“ کو ایلزبتھ براؤننگ

Marfat.com

کے ساتھ جو عشقیہ لگاؤ تھا، وہ شہوانی دلربائیوں کا مظاہرہ نہ تھا۔ "انیرہ" میری پھوپھی زاد بہن بھی تھیں، ان کی معصومانہ اور سادہ زندگی، ان کی خدمت گزاری اور اطاعت شعاری ان کی شیریں کلامی اور عفت مآبی، الغرض ان کی شخصیت و کردار کے مختلف پہلوؤں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جاپانیوں کے عقیدہ کے مطابق وہ کوہ فیوجی کی "ہنجن" دیوی ہیں یا چین کی "کوین ین" تقریباً ایک سال میرے بچے میاں محب اللہ اور عمیر اپنی ننھیال ہی میں رہے۔ میں برابر بھوجپور جاتا لیکن اس حال میں کہ "گریاں دنماک اڑتا جوں ابر جوں بگولا"، کبھی "رٹال" کے سنسان بیابان کو مخاطب کرتا اور اپنی حدیث درد کہتا کبھی دھواں ندی پر ایک نظر ڈالتا اور وہ وقت یاد کرتا جبکہ ندی میں کشتی ہوتی تھی اور اس پہ انیرہ کا محافہ رکھا جاتا تھا بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ غیا کیا خوب کہا گیا ہے۔

کبھی جا گل کو دیکھے ہیں، کبھی دیکھے ہیں نرگس کو
خدا جانے یہ چشم اپنی پھرے ہے ڈھونڈھتی کس کو

قائم بھی "پریشان نظری" کو "بینائی" کا جرم بتاتا ہے اور ایک حد تک اس کا خیال صحیح ہے۔

سات ماہ تک میرا چھوٹا بچہ (مجد الدین)، جو میری انیرہ کی آخری نشانی تھا کسی نہ کسی طرح زندہ رہا۔ پھوپھی نے سارے جتن کر ڈالے مہینوں، راتیں آنکھوں میں کاٹ ڈالیں خدمت و پرورش کے لئے جتنی کوششیں ہوسکتی ہیں صرف کی گئیں، لیکن "لکل اجل کتاب" وہ بھی ہمیشہ کے لئے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوگیا میں اس

Marfat.com

ننھی سی جان کو آغوشِ مادر سے محروم دیکھتا تو میرا دل قابو میں نہیں رہتا تھا، حضرت زینبؓ کا چھوٹا بچہ دم توڑ رہا تھا بی بی نے سرورِ کائنات کو بلا بھیجا دو مرتبہ پیام آیا، آپ تشریف لے گئے۔ آپ نے بچہ کو دیکھا بخاری کی روایت کے مطابق "عیناہ تذرفان" (آپ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے) حضرت سعد بن عبادہؓ نے کہا یا رسول اللہ یہ کیا آپؐ نے ان کو رافت و رقت کی حقیقت بتائی، اور فرمایا "انما یرحم اللہ من عبادہ الرحماء" مجد الدین کو دیکھ کر میری حالت ناگفتنی ہو جاتی تھی، سیلاب اشک تھمتا نہ تھا یہاں تک کہ سات ماہ کی مسلسل گریہ حسرت کے بعد بقول قائم وہ منزل بھی آگئی کہ ؎

نہ دل بھرا ہے نہ اب نم رہا ہے آنکھوں میں
کبھی جو روئے تھے خوں جم رہا ہے آنکھوں میں

اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ظہوری کے "آرزوہا ہمہ زدیدہ چکید" کے صحیح معنی کیا ہیں۔

آخر وہ کون سی قوت تھی جس نے اس آنے والے حادثہ فاجعہ کا قبل از وقت ادراک کر لیا، میں کچھ سمجھ نہیں رہا تھا لیکن غیر ارادی طور پر اشک ریزیاں کر رہا تھا دل کیوں بیٹھا جاتا تھا، مڑ مڑ کر بستی کے در و دیوار پر ایک حسرت آگیں نگاہ کیوں ڈالتا تھا۔ نیلم والکر اٹکنسن نے اپنی کتاب "تحت شعوری وماورا شعوری سطح دماغ" میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔

Marfat.com

بیرٹ (Barret) کہتا ہے "بہت سی ارفع اور مقتدر تر قوتیں ہماری قوت شاعرہ، ارادہ، اور عقل کے ماورا ہیں بہت سی ماورا طبعی اور لطیف قوتیں ہیں۔ جن کی بہ حالت موجودہ ہم صرف کبھی کبھی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ ہماری قوت شاعرہ اس انتہائے حقیقت کا محض ایک عکس یا دھندلا ادراک ہے"۔

ڈاکٹر مرے (Murray) کا قول ہے "ہماری روح اپنی قوت شاعرہ کے ساتھ جس گہرائی تک پہنچ سکتی ہے اس سے زیادہ عمق میں روح دادہ میں ہوتے انسان کو اتصال باری نصیب ہوتا ہے اور ہماری عقل اور احساسات یا ادراک سے زیادہ گہرائی میں چھپی ہوئی زندگی کی غیر مری گہرائی میں خدا کی روح جلوہ ریز ہے"۔

شوفیلڈ (Schofield) کہتا ہے "ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا دماغ محض مری یا شوری حصہ تک۔ یا جس کو ہم تحت شوری کہتے ہیں۔ اسی تک محدود نہیں بلکہ ہمارے دماغ کا تعلق ماورار شعور سے بھی ہے جو آخری حد پر قائم ہے یہ مخزن ہے ساری نفسی و روحی زندگی کا جس سے ہم لوگ بعض اوقات سرسری طور پر واقف ہو جاتے ہیں لیکن جو ہمیشہ موجود ہے ابدی بوقلمونیوں سے ہمارا رشتہ ملا دیتا ہے۔ شہود، مراقبہ، ریاضت بلکہ خواب بھی بلاشک وشبہ روحانی الہامات کے مواقع ہیں اور ثبوت میں بہت سی ایسی نظیریں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جن سے معلوم ہوگا کہ روح کے کارنامے عقل یا دماغ کے اعمال سے جدا گانہ ہوا کرتے ہیں"۔

دان ہارٹمین کہتا ہے "اکثر انسان جبکہ اپنے "شوری" خیال کے ذریعہ اپنی

Marfat.com

مدد نہیں کر سکتا ایک غیر شوری "خیال کنایہ یا احساسات کے ذریعہ اس کے اعمال میں رہنمائی کرتا ہے"

اگر ہم حیات شاعرہ اور غیر شاعرہ کے درمیان موازنہ کریں تو یہ بات ظاہر ہوجائیگی کہ یہ حیات غیر شاعرہ کیلئے ایک سطح مخصوص ہے کیونکہ کبھی یہاں تک حیات شاعرہ کی بدولت ہماری رسائی نہیں ہو سکتی، صوفیہ غالباً اسی کو اپنی اصلاح میں "مقام" سے تعبیر کرتے ہیں

میں نے شعر بہت کم کہے ہیں جو کچھ بچپن میں اشعار قلم سے نکلے تھے، وہ نومشقانہ آورد کا نتیجہ تھے، ان پر صحیح معنی میں شعر کا اطلاق نہیں ہو سکتا! باایں ہمہ شعریت کا یہ عالم تھا کہ خواب میں کسی کا شعر پڑھتا اور اپنے اوپر ایک عالم سکر وخمول طاری ہو جاتا نفس میں ایک عجیب طرح کی سنسناہٹ اور دل وجگر میں ایک ہیجان محسوس کرتا، میرے چند دوست جو مجھ سے واقف تھے میرے اس شغف شعر وادب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کئے بیٹھے تھے کہ میں ازدواج کا مسئلہ حل کرنے میں ضرور اس ذوق کا بھی لحاظ رکھوں گا لیکن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی، جب میں نے تمدن سے دور گاؤں کی ایک اُمّی خاتون کا انتخاب کیا۔

عورت کا حسن وجمال، اس کی تعلیم وتربیت اس کی دولت وجائداد، اس کا معاشری رتبہ۔ یہ چیزیں ہیں جو عموماً ہمارے نوجوان حریصانہ نگاہ سے دیکھتے ہیں ہر انسان کے اندر کچھ نہ کچھ اخلاقی کمزوری ہوتی ہے۔ یہ محض خلاف حقیقت ہوگا اگر

Marfat.com

کوئی کہے کہ اس میل مرکزی کا مجھ پر اثر نہیں ہوتا مگر یہ واقعہ ہے، کہ مجھے اس معاملہ میں زیادہ نفس کشی نہیں کرنی پڑی، اور میں نے آسانی کے ساتھ اپنے رجحان و نصب العین کےمطابق یہ مسئلہ طے کر لیا۔

میرے ایک دوست جو حکیم بھی ہیں عورت کی شعریت پر بہت زور دیتے ہیں یا یوں سمجھ لیجئے کہ آپ ایک عاشق مزاج سخن فہم اور مہذب بیوی چاہتے تھے۔ بدقسمتی سے آپ کو اس میں سخت ناکامی ہوئی، آپ اکثر حسرت کے ساتھ اپنی اہلیہ کی بے حسی اور اپنے ذوق کی پامالی کا گلہ کرتے ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ مرد اپنی عورت میں شعر و ادب کا ذوق کیوں تلاش کرتا ہے کیا عورت کا نیک کردار، اور اس کی وفا شعاری اس کا مقدس چہرہ، اور اس کی نرم و حزیں آواز پرستش دنیا لیش کے لئے کافی نہیں۔ محترم حضرت نیاز صاحب کا افسانہ "ازدواج مکرر" ہمارے حکیم صاحب جیسے ذوق پرست اصحاب کے لئے بڑا درس عبرت ہے۔

عورت بذات خود تعبیر ہے ایک ہیجان آفریں صنعت سے، اس کے حسن ذات کے نکھار کے لئے اگر کسی شے کی ضرورت ہے تو وہ اس کا عفت مآب ہونا ہے اور بس! عورت کی سیرت کے متعلق علماء کے نظریات مختلف ہیں جرمنی کے مشہور قیافہ شناس "جان کیسپر لاویٹر" نے اس پر ایک دلچسپ بحث کی ہے۔

"لاویٹر، ۱۷۷۷ء میں بمقام "ویلما نسٹ" پہنچا یہاں شہنشاہ جوزف موجود تھا اس نے سنا کہ لاویٹر اس شہر میں آیا ہے تو اس کو بلا بھیجا اور اس سے علم قیافہ پر گفتگو

Marfat.com

کی اس بحث و نظر کو خود لاڈیٹر نے اپنی زبان میں ادا کیا ہے، وہ مختلف امور پر بحث و تحیص کرتے ہوئے لکھتا ہے، کہ شہنشاہ نے سوال کیا کہ عورتوں کی سیرت کا پتہ لگانا کیا زیادہ دشوار نہیں اور یہ کہ حقیقتاً مردوں کی طرح عورتوں کا کوئی کردار نہیں ہوتا، لاڈیٹر نے کہا بعض حیثیت سے میں اس کا جواب اثبات میں اور بعض حیثیت سے نفی میں دوں گا۔ شہنشاہ نے طنزاً مسکرا دیا اور ایک تجربہ کار انسان کی طرح پُرمعنی انداز میں کہا کہ عورتیں مردوں کی محکوم ہیں اور وہ نقل و محاکات کی عادی ہیں ان کا کوئی ذاتی چلن نہیں ہوتا وہ جس کو پسند کرتی ہیں اُسی کو اختیار کر لیتی ہیں ان کا چلن مرد کا چلن ہوتا ہے جس کو وہ بروقت خوش کرنا چاہتی ہیں ان کو غالباً ایک ایسے شخص سے واسطہ ہوتا ہے جو خشک، متین اور تمیز دار ہوتا ہے اور جوان کو بعض خاص یا دوسری حیثیت سے اچھا معلوم ہوتا ہے تو وہ فوراً متین اور خشک بن جاتی ہیں، فوراً ایک دوسرا شخص آتا ہے جو خوش باش اور پُرجوش ہوتا ہے وہ اس وقت یہی انداز اختیار کر لیتی ہیں محض اس لئے کہ اپنے رفیق جدید کو خوش کر سکیں، پھر ان کا کونسا چلن ہوا؟ کون ہے جو ان کی صورت سے ان کی سیرت کا پتہ چلائے۔ ایک قیافہ شناس بہت دنوں تک مطالعہ کرتا رہتا ہے جب وہ کسی عورت کے متعلق رائے قائم کر لیتا ہے تو وہ یکایک بدل جاتی ہے۔ لاڈیٹر نے جواب دیا کہ حضور نے جو کچھ فرمایا وہ بالعموم صحت رائے پر مبنی ہے اور ایک حد تک آپ کا یہ خیال بلاشک و شبہ صحیح ہے کہ عورتیں جو کچھ ہیں وہ مردوں کا عکس ہیں یا وہ مردوں کے سامنے وہی انداز اختیار کر لیتی ہیں جس کو وہ مناسب خیال کرتی ہیں پھر بھی بعض ایسے

Marfat.com

استوار نا تغیر پذیر صورتیں ہیں جن پر نقاب نہیں پڑ سکتی، اور ان کے چلن کی باطنی بنیاد کی علامتیں قیافہ شناس کو حقیقت تک پہنچا کر رہتی ہیں اور وہ دھوکہ نہیں کھاتا ہر چند یہ بالکل صحیح ہے کہ مردوں کے استوار قیافہ کی طرح عورتوں کے قیافہ کو آسانی کے ساتھ واضح نہیں کیا جا سکتا ہم لوگ ہمیشہ سب سے پہلے مقدار پذیرائی اور قوت، ان کے چلن کی بنیاد اور شکل وشباہت کے بزرگ ترین خاکہ پر اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں اور اس صورت میں ہم لوگ زیادہ غلطی نہیں کرتے۔

ہر انسانی صورت میں کچھ نہ کچھ ایسی بات ہوتی ہے جو فنون تصنع (Arts of Dissimulation) کی منت کش نہیں اور اس لئے ہم کو اس تصنع سے کوئی خوف نہیں ہوتا صرف متحرک صورتیں ہی تصنع کے زیر اثر ہوتی ہیں حقیقی طلعت یا ان صورتوں کی بنیاد اس تصنع کی قوت سے باہر ہے۔

عورت ہنگامی طور پر جو روپ بھی اختیار کر لے

"ہولاک ایلس" کا یہ نظریہ بالکل حقیقت ہے کہ محبت نسوانی میں مادرانہ عنصر پایا جاتا ہے۔ ایمپر لاڈیر کہتا ہے کہ مرد بہت زیادہ راسخ ہے۔ اور عورت بہت زیادہ تغیر پذیر ہوتی ہے۔ لیکن یہ نتیجہ ہے اس امر کا کہ مرد زیادہ عمق نظر کے ساتھ مشاہدہ کرتا ہے مگر عورت ایک نظر ڈالتی ہے اور محسوس کرتی ہے۔ کیسپر کا قول ہے کہ ننانوے فیصدی عورتوں کو جو کسی مرد کے ساتھ محبت رکھتی ہیں یہ یقین ہوتا ہے کہ گو ہزاروں مردوں نے اپنے محبوبوں کو بھلا دیا ان سے آزادانہ سلوک کیا لیکن میرا محبوب اس قسم کے مردوں سے

Marfat.com

مستثنیٰ ہے، اس سلسلہ میں بیجا نہ ہوگا اگر میں عورت کے متعلق اپنا نقطۂ خیال کسی قدر واضح طریقہ سے بیان کردوں۔

عورت نے اپنی زندگی میں کردار کے مختلف نقوش پیش کئے ہیں جن کو تاریخ نے محفوظ رکھا ہے اُنھوں نے میدان حرب کے لالہ زاروں میں بھی اپنی ہمت و بسالت کی داستان چھوڑی ہے اور نہاں خانۂ حرم میں بیٹھ کر بھی اپنے بدیعۂ افکار سے اہل زمانہ کو متاثر کیا ہے۔ کبھی وہ جان ڈی آرک کی شکل میں آئی اور کبھی قلو بطرہ اور رسائکی کے روپ میں کبھی وہ بلقیس، الزبتھ، صفیہ اور نورجہاں کی طرح جہاں بانش حکومت پر نظر آتی ہے اور کبھی خنساء، عبیدہ طنبوریہ، فضل اور زیب النسا کی طرح بزم شعر و ادب میں بھی۔ کبھی وہ سکینہ بنت حسین، زینب ام المویہ، تقیہ بنت ابوالفرج کی طرح مسند فقہ و حدیث پہ درس دا بھی کرتی ہے۔ اور کبھی۔ رابعہ عدویہ، شعوانہ اور فاطمہ نیشاپوریہ کی طرح سجادۂ تصوف پر رشد و ہدایت سے بھی کام لیتی ہے۔ الغرض زندگی کا کوئی شعبہ ہو، سیاسیات یا تمدن، شعر و ادب، موسیقی یا غنا، ہر جگہ اس کی جگر کاویاں موجود ہیں اس میں نہ مشرق و مغرب کی تخصیص ہے، اور نہ قدیم و جدید کا فرق و امتیاز!

اب آیئے اسلامی تاریخ کی روشنی میں کسی قدر تفصیل سے اس مسئلہ پر بحث کی جائے حضرت عائشہ کی مرویات، آپ کا فقیہانہ طرز استدلال، ''خولہ'' کی جنگی معرکہ آرائی قرون اولیٰ کے برکات میں سے ہیں امویہ و عباسیہ کے آدان حکومت میں عورت کی زندگی میں انقلاب ہوا۔ امیر علی کے الفاظ یہ ہیں۔

Marfat.com

عباسیہ کے اولین دور میں عورتوں کا درجہ امویہ کے زمانہ سے مختلف نہ تھا ذکور وذانات کی زندگی کا فرق وامتیاز ان کا ایک دوسرے سے علیحدہ ہونا خلیفہ قادر باللہ کے زمانہ میں رواج پذیر ہوا۔ اس خلیفہ سے بڑھ کر کسی دوسرے فرمانروا نے اسلامی دنیا کی ترقی میں رکاوٹ نہیں پیدا کی خلیفہ منصور کے زمانہ میں دو شہزادیاں مردانہ لباس پہنکر بازنطینی لڑائیوں میں شریک ہوئیں، خلیفہ ہارون الرشید کے وقت میں عرب لڑکیاں گھوڑے پر سوار ہو کر فوج کی سرداری کیا کرتی تھیں، خلیفہ مقتدر کی ماں دیوان اعلیٰ کی کرسی صدارت پر مقدمات کی اپیل سُنا کرتی تھیں متوکل کے زمانہ تک بلند پایہ کی تعلیم یافتہ عورتوں کے مکان پر مردوں کا اجتماع ہوتا وہاں وہ باہم تبادلہ خیالات کرتے۔

رشید اور مامون کے عہد میں عورتیں مشاعروں میں شرکت کرتیں زبیدہ خود بڑی شاعرہ تھی، عبیدہ طنبوریہ شعر کہا کرتی اور موسیقی نواز بھی تھی مامون اور معتصم کے زمانہ میں اس کے کمال کا اوج تھا۔ وہ شکل وشباہت کے اعتبار سے "سہی قدان سیہ چشم ماہ سیما" میں سے تھی، ذہانت بھی خدا داد تھی، طنبورہ بجانے میں اس کو کمال تھا۔ اسی وجہ سے "طنبوریہ" کے لقب سے مشہور ہوئی۔ فضل خلیفہ منصور کے محل کی رونق اور مشہور شاعرہ تھی اس عہد کے اکابر شعرا کی صف میں اس کو جگہ دی جاتی تھی "شیخہ شہدہ": چھٹی صدی ہجری میں تھیں اور بغداد میں تاریخ وادبیات پر لکچر دیا کرتی تھیں۔ فقیہہ عورتوں میں ایک مشہور ترین خاتون زینب ام المویدگزری ہیں جو چھٹی صدی کے وسط میں تھیں صلاح الدین ایوبی کے زمانہ میں: بوالفرج کی لڑکی "تقیہ"، گزری ہیں جو بہت بڑی

Marfat.com

محدثہ تھیں اسی کے ساتھ ان کو شاعری میں بھی کمال حاصل تھا[۱]۔

"عزۃ میلاء" انصار کی ایک لونڈی تھی، مدینہ میں قیام تھا بدیہ جمال کے ساتھ ادا میں بھی ایک خاص نوع تھی صاحب الاغانی کی روایت ہے وسمیت بالمیلاء لتمایلها فی مشیتها " اس کی چال میں ایک لچک تھی اس لئے اس کا نام "میلا" پڑ گیا۔

"جمیلہ" بنی سلیم کی ایک شاخ بنو بہز کی ایک لونڈی تھی، اس کا شوہر بنی حرث بن خزرج کا غلام تھا وہ اسی کے ساتھ رہتی تھی اسی لئے لوگ اس کے شوہر کی نسبت سے اس کو انصار کی لونڈی کہنے لگے۔ ابوالفرج اور فرانسیسی عالم پروفیسر "جول روانیت" دونوں لکھتے ہیں "ھی اصل من اصول الغناء" آغانی کی روایت کے مطابق اسلامی دنیا کی مشہور مغنیوں معبد ابن عائشہ، حبابہ وسلامہ، عقیلہ العقیقیہ اور خلیدہ وربیحہ نے اس سے اکتساب فن کیا صاحب تاریخ الموسیقی العربیہ نے اس پر ابن سریج کا اضافہ کیا ہے[۲]۔

"سلامۃ القس" یہ بھی ایک لونڈی تھی اور مدینہ میں رہا کرتی تھی، اس کے نام کے ساتھ "القس" کا لفظ ایک تاریخی واقعہ سے منسوب ہے۔ القس مدینہ کے ایک مشہور عابد زاہد آدمی تھے، اتفاقاً مدینہ کی ایک گلی میں "سلامہ" کا گانا سن لیا بہت متاثر ہوئے اس کے مالک نے القس سے کہا اگر فرمائیے تو اس کو آپ کے سامنے لاؤں یا آپ کو

A short History of The Saracens; Amir Ali, p. 455/57 [۱]

[۲] دائرۃ المعارف الموسیقیہ (الجزء الاول)، للعامہ الاستاذ جول روانیت دمربہ الاستاذ سکندر شلفون، ص ۷۳، ۹۳، ۱۵۹، ۵۰۰۔

وہاں لے چلوں الفس نے انکار کیا پھر کہا اگر یہ نہیں تو ایسا کیجئے کہ میں ایک ایسے مقام پر اس کو لے کر رہتا ہوں جہاں سے آپ اس کا گانا سُن سکیں دیکھ نہ سکیں۔ الفس نے اس سے بھی انکار کیا۔ وہ شخص الفس کو ایک مکان میں لے گیا اور پردہ کے پیچھے سلامہ گانے لگی، سلامہ کے آقا نے کہا فرمایئے تو باہر چلی آئے الفس نے روا نہ رکھا۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ آگر مدینہ کے اس مشہور عابد کے پہلو میں بیٹھ ہی گئی اور گانے لگی۔ بس دن رات کے انقلاب کے ساتھ ایک کو دوسرے کے ساتھ شغف بڑھتا گیا اہل مدینہ سے بھی اب یہ حقیقت چھپی نہ رہی ایک دن سلامہ نے الفس سے کہا خدا کی قسم میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ الفس نے کہا واللہ مجھے بھی تم سے محبت ہے۔ پھر سلامہ نے کہا میرا جی چاہتا ہے کہ اپنا منہ تمہارے منہ پر رکھوں الفس نے کہا میری بھی یہی آرزو ہے بابا فغانی کہتے ہیں، "نہادم روئے بر روئے گل واز خود گشتن رفتم"، سلامہ نے کہا تو پھر کونسی چیز مانع ہے۔ تنہائی بھی ہے اور رقیب روسیاہ بھی نہیں الفس نے کہا میں نے سُنا ہے اللہ کہتا ہے۔

الاخلاء یومئذ بعضھم لبعض	ترجمہ:۔ آج کے دن بعض دوست اپنے دوستوں
عدو انا اکرہ ان تکون خلۃ	کے دشمن ہو جائینگے اور میں ناپسند کرتا ہوں کہ
ما بینی وبینک تؤول الی عداوۃ	ہماری تمہاری دوستی کا انجام عداوت ہو

یہ کہتا ہوا اٹھا اور چلدیا۔ اس کے بعد اس کی وہی شب زندہ داریاں تھیں اور وہی عزلت پسندیاں اسی طرح شہزادی "علیہ" (جو خلیفہ مہدی کی بیٹی تھی)، اور علیہ کی ماں بصبص کو موسیقی میں کمال تھا۔ یحیٰی بن خالد برمکی کی لونڈی "دنانیر" خلیفہ امین کی معشوقہ "غریب"

Marfat.com

فن موسیقی کی زبردست کاملہ گذری ہیں "غریب" کو بقول پروفیسر جول روانیت ایکس ہزار پانسو راگنیاں معلوم تھیں۔ شاہزادہ ابراہیم بن مہدی نے جو خود بڑا ماہر موسیقی تھا بصرہ کی ایک مولدہ "شاربہ" کی تربیت کی شاربہ کی رفعت اعزاز اور شہرت کے لئے یہی کیا کم ہے کہ شاہزادہ "ابن المعتز" نے جو خلیفہ کا بیٹا اور عربی زبان کا مشہور شاعر گزرا ہے بہ نفس نفیس اس کی تاریخ لکھی ہے۔

مصر جدید کے علماء نے نسائیات پر کافی معلومات جمع کر دی ہیں۔ سیاسیات و تمدن تاریخ و شرائع وغیرہ میدانوں میں عورت نے جو کارنامے چھوڑے ہیں ان کی پوری تفصیلات ہمارے سامنے ہیں۔ عورت وفلاسفر کی رائیں عہد قدیم اور عہد جدید کی عورت جیسے اہم موضوع پر جو تصنیفات پائی جاتی ہیں، شعر و ادب کے متعلق تو کچھ کہنا ہی نہیں الغرض مصری علمانے انگلستان وفرانس، اور جرمنی واطالیہ، روس و ترکی کے دور نہضت کا مطالعہ کرنے کے بعد عورت کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ ہندوستان میں بھی عورتیں فضامیں اڑا کرتی ہیں۔ قاف کی پریوں کا افسانہ اب حقیقت بن گیا۔ پانی پر تیرتی ہیں اور اب گویا ہندو خرافیات کی دریائی دیوی ہندستان کی بہت سی نوجوان خواتین کے روپ میں نظر آتی ہے، کاؤنسل کے چیمبر اور عدالت کی کرسیاں بھی ان کی رونق سے خالی نہیں مگر سوال یہ ہے کہ عورت کے ذمہ فطرت کے جو خدمتیں تفویض کی ہیں انکی تکمیل میں عہد حاضر کی عورت کہاں تک کامیاب ہے اور اس کے بعد انکی زندگی کا امن سکون اس کے اخلاق کی گیرائیوں سے برقرار بھی ہے یا نہیں اس کا جواب آپ کو مغر

Marfat.com

عورت کے صحیفۂ زندگی کے ہر ہر ورق سے ملے گا جو ترقی کی رفتار میں سب سے آگے ہے مغرب کے مرد اور ان کے مشرقی مقلدین آج عورتوں کی غیر آل اندیشانہ آزادی پر جعبنی خونفشانیاں کر رہے ہیں ان سے اخبارات کے کالم اور جرائد کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔

انسان جب تمدن کے معصومانہ گہوارہ میں تھا اس وقت بھی عورت زندگی کی مسابقت میں مرد سے پیچھے نہ تھی، اقوام و ملل کی خرافیات و اساطیر سے ایک محقق اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ عورت ہر قوم میں پرستش و نیایش کی چیز سمجھی جاتی تھی اور آج بھی اس کی بلندی اخلاق و تقدیس کی روایتیں مختلف ممالک میں متداول ہیں آیئے سرسری طور پر خرافیات عالم کا جائزہ لیں۔

اشتار دیوی

بابل و اسیریا کی خرافیات میں عموماً خشک قسم کی مذہبی و قومی روایتیں پائی جاتی ہیں۔ یہاں جاپان کی طرح عشقیہ و رومانی افسانوں کا وجود نہیں پایا جاتا پھر بھی گلگمیش (جو بابلی خرافیات میں ہندو خرافیات کے "ہنومان جی" کے مقابل ہے اور جس کو "میکنزی" ہرقل اور سکندر کے مثل بتاتا ہے) اور تموز (جو مصر کے "ادریس" کی طرح زراعت کا دیوتا سمجھا جاتا ہے)، سے "اشتار" دیوی (عشق باز ملکۂ خلد) کا عشق ای بنی (Ea-Bani) کا اپنے شکاری محبوب کے دام محبت میں گرفتار ہونا ایسی

Marfat.com

روایتیں ہیں جو ہماری توجہ اس کلیہ کی طرف مبذول کراتی ہیں کہ امم سابقہ کی خرافیات میں ہمیشہ عورت، محبت و تقدیس کا مجسمہ سمجھی جاتی تھی۔[1]

کوین ین

خرافیات چین میں کوین ین کو "رحم کی دیوی" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ "کوین ین" کے معنی یہ ہیں کہ وہ "جو آواز سنے اور غم کو دور کرے"۔ اہل چین کے یہاں یہ دیوی ایک پیکر تقدس اور مجسمۂ مہر و کرم سمجھی جاتی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر آگ کے درمیان کوین ین کا نام لیا جائے تو آگ اثر نہیں کرے گی۔ جہاز جب طوفان میں گھر جائے اور اس کا نام لیا جائے تو جہاز سلامتی کے ساتھ ساحل سے ہم آغوش ہوگا۔ یہاں تک کہ تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کے لئے بھی اس دیوی کے نام کا ورد نہایت مفید ہے۔

کوین ین چین کے شاہی گھرانہ میں پیدا ہوئی وہ بادشاہ کی تیسری بیٹی تھی۔ لیکن اس کو بادشاہ بیٹے کی طرح عزیز رکھتا تھا اور چونکہ بادشاہ کے کوئی اولاد ذکور نہ تھی اس لئے وہ تاج و تخت کا وارث بھی اس لڑکی کو بنانا چاہتا تھا۔ اس کا پہلا نام "میاؤ شن" (Mio Shan) تھا۔ جب یہ لڑکی سیانی ہوئی تو باپ نے تاج و تخت حوالہ کرنے کی غرض سے اس کی شادی کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن لڑکی شروع ہی سے حکومت و دولت سے متنفر تھی، وہ ایک عزلت گزیں جوگن کی طرح کسی پہاڑ کے گوشہ میں زندگی بسر کرنا چاہتی تھی

---

[1] Myths of Babylonia & Assyria: Donald A. Mackenzie ص ۱۰۹ تا ۱۱۲

اس کی آرزو تھی کہ انسان کے فرق و مراتب کا سوال اٹھ جائے اور لوگ دنیا میں سادہ زندگی گزاریں وہ بڑے لوگوں کو نیک چلن بنانا چاہتی تھی وہ دکھ درد میں مبتلا ہونے والے انسانوں کو نجات دلانا چاہتی تھی۔ بادشاہ سے اس نے عرض کیا کہ وہ شادی کرنا نہیں چاہتی اور ایک راہبہ کی طرح زندگی کے دن گزار دینا چاہتی ہے وہ جب اپنی بڑی بہنوں کے ساتھ شاہی محل کے سدا بہار باغ میں کھیلا کرتی تو کہتی کہ دولت اور شوکت کی حقیقت موسم بہار کی جھڑی یا صبح کے وقت گریۂ شبنم سے زیادہ نہیں بس ایک ساعت اور پھر غائب - بادشاہ اور شہنشاہ خیال کرتے ہیں کہ آخر آخر تک وہ اپنی قسمت کی بہار آفرینیاں دیکھتے رہیں گے جوان کو دوسرے انسانوں سے ممتاز بناتی ہیں لیکن بیاری ان کو جھکا دیتی ہے اور ساری فریب خیالیاں ختم ہو جاتی ہیں اب وہ زور آور شاہی خاندان کہاں ہیں جنھوں نے دنیا کے سامنے اپنے آئین پیش کئے جہانتک میری ذات کا تعلق ہے میں اس کے سوا کوئی آرزو نہیں رکھتی کہ کسی سنسان پہاڑ پر امن وسکون کے ساتھ گوشہ گیر ہو جاؤں اگر میں اپنی عبادت و ریاضت کی بدولت "کمال" حاصل کرونگی تو میں ایک لمحہ میں مشرق سے مغرب تک کائنات کے اندر سفر کر دوں گی میں اپنی ماں اپنے باپ کو نجات دلاؤں گی۔ اور ان کو خلد میں پہونچاؤں گی میں دنیا کے مصیبت زدہ اور اور دردمند انسانوں کو بچاؤں گی میں ایسے انفاس کو جو مکروہات میں مبتلا ہیں برگزیدہ اخلاق کا پیکر بناؤں گی یہی میرا حوصلہ ہے اور بس!

یہ تھے زاہدانہ تخیلات جو بچپن سے میاؤشن کے دماغ پر مسلط تھے اور حقیقت

Marfat.com

یہ ہے کہ اسی "رجحان" نے اس سے تخت شاہی چھڑا کر اس کو "کوین ین" کے رتبہ تک پہنچایا باپ بیٹی کا مکالمہ اس افسانہ کا ایک نہایت دلچسپ اور سبق آموز پہلو ہے۔[۱]

سنجن دیوی

خرافیات جاپان اپنی عشقیہ روایات کے لحاظ سے دنیا کی دوسری قوموں سے ممتاز ہے۔ عشق و رومان اس ملک کی خصوصیات میں سے ہیں اور یہ نتیجہ ہے یہاں کے قدرتی مناظر اور سرزمین کی شادابی کا۔ جاپان کے خرافی افسانوں میں دیویوں کے عشق و محبت کے نہایت دلکش نقوش پائے جاتے ہیں "یوکی انّا" (برف کی خاتون) "کرماہارا" اور دخت ماہ" جس میں "گگویا" دیوی کا کردار پیش کیا گیا ہے اور "کوہ فیوجی کی دیویاں" کے نام سے جو افسانے پائے جاتے ہیں ان کے پڑھنے کے بعد انسان بے اختیارانہ شعر و رومان کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔

"یاساجی" کی ماں ایک معمولی دیہات کی عورت تھی اس کو چیچک کا عارضہ ہو گیا یاساجی نے "کامویاماکیکو" جادوگر سے مشورہ کیا چونکہ اس کی ماں ایسی علیل ہو گئی تھی کہ ہر لحظہ موت سے ہمکنار ہونے کا خدشہ تھا۔ جادوگر نے اس کو صلاح دی کہ وہ اس چھوٹے سے چشمہ پر جائے جو "کوہ فیوجی" کے جنوبی مغربی پہلو میں بہتا ہے۔ جادوگر نے کہا کہ اس چشمہ کے دہانے پر "لمبی سانس" کے دیوتا کا مندر ہے اس لیے پانی لے آؤ اور اپنی ماں کو

---

[۱] Myths and Legends of China: E.T.C. Werner ص ۵-۲۵۱

پلاؤ، چونکہ صرف یہی ایک دوا ہے جس سے تمہاری ماں کو شفا ہو سکتی ہے۔

یاساجی اُمید سے بھرا ہوا سفر میں روانہ ہوا، اور جب وہ اس مقام پر پہنچا جہاں تین رستے ایک دوسرے کو قطع کرتے تھے تو وہ گھبرایا کہ صحیح رستہ کون ہے وہ اس معاملہ پر غور و خوض ہی کر رہا تھا کہ ایک بھولی بھالی لڑکی سفید کپڑا پہنے ہوئے جنگل سے نکلی اور اس سے کہا کہ میرے ساتھ چلے آؤ۔ میں تم کو وہاں لے چلتی ہوں جہاں "لبنی سائنس کے دیوتا" کے مندر کے نزدیک وہ قیمتی چشمہ بہتا ہے۔ جب وہ اس چشمہ کے نزدیک پہنچے تو لڑکی نے یاساجی سے کہا کہ تم اس کا پانی پیو اور اپنی ماں کے لئے لے جاؤ جب وہ یہ سب کر چکا تو وہ حسین لڑکی اس کو اس مقام پر لے آئی جہاں پہلی مرتبہ اس کو دیکھا تھا اور کہنے لگی تین دن کے بعد مجھ سے پھر اسی مقام پر ملو چونکہ تم کو پھر اس پانی کی احتیاج ہوگی۔

پانچ مرتبہ مندر سے پانی لانے کے بعد یاساجی نے مسرت کے ساتھ یہ محسوس کیا کہ اب اس کی ماں بلکہ دیہات کے اور دوسرے لوگ بھی جنھوں نے یہ پانی پیا شفایاب ہوگئے۔ یاساجی کی بہادری کا غلغلہ بلند ہوگیا۔ جادوگر کے پاس تحائف بھیجے گئے چونکہ اس نے وقت پر مشورہ دیا لیکن یاساجی ایک دیانتدار لڑکا تھا وہ دل میں سمجھ رہا تھا کہ حقیقتاً اس ساری تعریف کی مستحق وہ حسینہ ہے جس نے اس کی رہنمائی کی۔ اس نے خواہش کی کہ وہ پوری طرح سے اس لڑکی کا شکریہ ادا کرے اور اسی ارادہ سے ایک بار پھر وہ چشمہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب یاساجی "لبنی سائنس کے دیوتا کے مندر" کے نزدیک

Marfat.com

پہنچا تو اس نے اس چشمہ کو خشک پایا اور بہت حسرت اور فرطِ غم کے ساتھ گھٹنوں کے بل ٹک گیا اور دُعائیں کرنے لگا کہ ایک بار پھر وہ حسینہ ظاہر ہو جائے جو اس کی ماں پر اس قدر مہربان ہوئی تاکہ وہ اس کا شکریہ ادا کرے اس طور سے جس طرح وہ اس کی عقیدت مند ہے جب یاساجی اُٹھا تو اس نے اس حسین لڑکی کو دیکھا کہ سامنے کھڑی ہے یاساجی نے بہت پرجوش اور فصیح الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور درخواست کی کہ وہ حسینہ اپنا نام بتائے جس نے اس کی ماں کو صحت و قوت دی لیکن لڑکی اس پر مسکراتی رہی اور اور اپنا نام نہیں بتایا۔ مسکراتے ہوئے اس نے ہوا میں "کیمیلیا" کی ایک شاخ پھینکی اس کے جواب میں کوہ فیوجی سے ایک چادرِ سحاب نمایاں ہوئی اس نے اس پیاری لڑکی کو لپیٹ لیا اور اس مقدس پہاڑ کی طرف لے چلا جہاں سے وہ آئی تھی۔ اب یاساجی نے جانا کہ اس کی رہنما "کوہ فیوجی کی دیوی" کے سوا اور کوئی دوسری ہستی نہ تھی وہ جوش ارادت میں زمین پر چہرہ ملنے لگا۔ دیوی اس سے جدا ہو رہی تھی اور وہ دیکھ رہا تھا کہ یاساجی یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے تشکر میں محبت کا عنصر بھی شامل ہے۔ وہ جھکا ہی تھا کہ فیوجی کی دیوی نے "کیمیلیا" کی وہ شاخ اس کی طرف پھینکی یہ دیوی کی طرف سے محبت کی ایک یادگار تھی[۱]۔

پیپن زن

میکسیکو میں یہ روایت بہت اہمیت کے ساتھ مشہور ہے کہ کس طرح پیپن زن

---

[۱] ص ۱۳۵ Myths and Legends of Japan : F. Hadland Davis.

Marfat.com

(Papantzin) مرنے کے بعد اپنے مقبرہ سے برآمد ہوئی اور اپنے بھائی مانٹیزوما کے سامنے اس کے انجام اور اہلِ اسپین کے ہاتھوں زوالِ حکومت کی پیشنگوئی کی۔ شہزادی کا انتقال ہو گیا تو مقبرہ کے دہانہ پر متوسط درجہ کا ایک پتھر رکھ دیا گیا۔ شاہی خاندان کے رسوم کے مطابق سب تقریبات انجام پا گئیں تو سب لوگ چلے گئے دوسرے دن سویرے شاہی خاندان کی چھ سال کی ایک بچی اپنی انّا کو تلاش کرنے باغ میں گئی اور دیکھا کہ شہزادی ہیپنزن غسل خانہ کے نزدیک جہاں اس کو دفن کیا گیا تھا کھڑی ہے شہزادی نے جو اس بچی کی پھوپھی یا خالہ ہوتی تھی اس سے کہا کہ اپنی انّا کو میرے پاس لے آؤ۔ بچی اپنی انّا کے پاس گئی اور سارا قصہ کہا۔ پہلے تو اُس نے کہا کہ بچی کو التباس ہو گیا اس لئے اس نے اس کی بات پر زیادہ توجہ نہ دی لیکن جب بچی نے اپنے بیان پر اصرار کیا تو انّا اس کے ساتھ چلی اور باغ میں دیکھا کہ سچ مچ "پاپن" غسل خانہ کے نزدیک سیڑھی پر بیٹھی ہے۔ انّا یہ سماں دیکھ کر بیہوش ہو گئی اس کے بعد ملکہ خود دو سہیلیوں کے ساتھ آئی اور "پاپن" کو اپنے کمرہ میں لے گئی۔ بادشاہ وہاں آیا اور دونوں بھائی بہن ملے۔ بہن نے کہنا شروع کیا کہ تم نے دیکھا ہے کہ میں مر گئی تھی لیکن میں اپنے آباد اجداد کے حکم کے مطابق تم کو ایک نہایت اہم معاملہ کے متعلق باخبر کرنے آئی ہوں۔

مرنے کے تھوڑے وقفہ کے بعد میں نے خود کو ایک وسیع وادی میں پایا جس کی

ملاحظہ: ۲۲-۱۴۱

The Myths of Mexico & Peru: Lewis Spence

Marfat.com

نہ تو ابتدا معلوم ہوتی تھی نہ انتہا۔ اس کے چاروں طرف اونچے اونچے بلند پہاڑ تھے۔ وسط میں ایک سڑک پر میں پہنچی۔ جس کے مختلف سمت چھوٹی چھوٹی راہیں تھیں۔ وادی کے پہلو میں ایک بڑا دریا بہہ رہا تھا جس کی روانی سے شور مچ رہا تھا۔ اس کے کنارے پر میں نے ایک نوجوان آدمی کو دیکھا جو ایک لمبی عبا پہنے ہوئے تھا اور ہیرے کا ایک تکمہ اس پر ٹکا ہوا تھا۔ اس کی پیشانی پر تثلیث کی ایک علامت بنی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں بازوں پر تھو جو عجیب وغریب قسم کے چمکیلے عکس اور رنگ پیدا کر رہے تھے۔ شکل وشمائل کے اعتبار سے وہ بہت حسین تھا اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ تم اس دریا سے پار گزرو، تم خدا کی محبت رکھتی ہو جو ہر اس چیز سے جس کو تم جانتی ہو یا سمجھ سکتی ہو بڑا ہے۔ تب وہ مجھے وادی کے درمیان لے چلا اور میں نے دیکھا کہ مردہ آدمیوں کی بہت سی ہڈیاں اور کھوپڑیاں پڑی ہیں۔ تب میں نے کچھ سیاہ مخلوقوں کو دیکھا جن کے سر پر سینگ تھی اور پیر ہرن کے سے تھے وہ ایک مکان کی تعمیر میں مشغول تھے جو تقریباً مکمل ہو رہا تھا۔ تھوڑی دور پر مشرق کے سمت بہت سے جہاز دیکھے جن پر بہت سے لوگ سوار تھے، ان کا لباس ہمارے لباس سے مختلف تھا ان کی آنکھیں صاف بھوری تھیں ان کا رنگ ٹیالا تھا اور وہ اپنے ہاتھوں میں جھنڈیاں لئے جا رہے تھے وہ سر پر خود پہنے ہوئے تھے وہ لوگ اپنے کو ''آفتاب کے بیٹے'' کہتے تھے۔ وہ آدمی جو مجھے لئے جا رہا تھا کہنے لگا کہ خدا کی مرضی نہیں ہے کہ تم ابھی اس دریا سے عبور کرو، بلکہ تم کو ابھی زندہ رہنا ہوگا تاکہ تم اس دین کے منافع حاصل کرو جو یہ اجنبی آدمی لائے ہیں۔ اس نے بتایا کہ ہڈیاں جو

Marfat.com

میدان میں پڑی تھیں وہ ہمارے ملک کے ان آدمیوں کی تھیں، جو اس دنیا کا علم حاصل کئے بغیر مرگئے اور وہ مکان جو تعمیر ہو رہا تھا ان لوگوں کی ارواح کے قیام کے لئے تھا جو میدان جنگ میں گر ینگے اس کے بعد اس نوجوان آدمی نے کہا کہ تم اپنے لوگوں کی طرف جاؤ اور جو کچھ تم نے دیکھا ہے اس کی خبر دو، تاکہ وہ لوگ بھی فائدہ حاصل کریں۔

موت کے بعد "پپنیپرن" کا دوبارہ زندہ ہونا میکسیکو کی تاریخ کا بہت ہی مستند واقعہ تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جب اہل اسپین نے میکسیکو میں مسیحیت کی تبلیغ کا علم بلند کیا تو سب سے پہلے شہزادی "پپنیپرن" نے بپتسمہ لیا۔

فریجہ دیوی

نیوٹانک خرافیات میں سوئپڈیگ (Svipdag) ہیرو کی شخصیت میں نظر آتا ہے اس کی ماں مرتے وقت اس کو وصیت کرتی ہے کہ وہ "ہیلفڈن" سے انتقام لے، جس کے باعث اس کی سخت رسوائی ہوئی اور اسی غم میں وہ مر رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ جب کبھی مصیبت کا سامنا ہو تم میری قبر پر آکر مجھے پکارنا میں تمہاری مشکل آسان کروں گی، چنانچہ "سوئپڈیگ" اور ہیلفڈن سے لڑائی ہوتی ہے۔ سوئپڈیگ گرفتار ہوتا ہے، وہ قید تنہائی میں اپنی ماں کے بتلائے ہوئے منتر پڑھتا ہے اس کو رہائی ہوتی ہے اور وہ فریجہ دیوی اور فرے دیوتا کو دیو کی قید سے نجات دلانے کے لئے کوہ "جوٹون ہیم" کا رخ کرتا ہے یہی افسانہ جس میں فریجہ دیوی کی رہائی۔ سوئپڈیگ دیو سے مقابلہ اور

Marfat.com

خوفناک وادیوں اور پرشور سمندروں سے اس کا گزرنا مذکور ہے، ٹیوٹانک خرافیات میں "فتح عشق" کے نام سے مشہور ہے۔[1]

سوبڈیگ اپنی سوتیلی ماں "ستھ" کی تحریک سے فریجہ دیوی کی رہائی کے لئے اپنے سوتیلے بھائی "ال" کو ساتھ لے کر روانہ ہوا جو اسی کی طرح ایک نوجوان ہیرو تھا۔ سفر بہت خطرناک تھا درمیان میں پرشور سمندر حائل تھا، طوفان کا دیو معرکہ آرا ہوا، لیکن سوبڈیگ "ستھ" کی تیار کی ہوئی غذا جو تین سانپ کی چربی سے بنائی گئی تھی اور اپنی ماں "گروا" کے منتر سے وہ سلامتی کے ساتھ اس ساحل پر پہنچ گیا جس کے متصل وہ محل واقع تھا جہاں دیو نے فریجہ دیوی اور فرے دیوتا کو مقید کر دیا تھا دیو کے تین لڑکوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں ایک فریجہ کو اپنی دلہن بنانا چاہتا تھا وہ سوبڈیگ اور ال پر بہت برہم ہوا۔ اور ان کو کہا جہاں سے آئے ہو اسی طرف چلے جاؤ۔ لیکن انھوں نے دیو زاد کی بات کو حقارت سے ٹھکرا دیا اور محل کا رخ کیا، محل میں پہنچے تو فریجہ دیوی اور فرے کو ڈھونڈھنے لگے۔ دیوزادوں نے چاروں طرف سے طوفان برپا کیا بھیانک آوازیں، بلند کیں، وحشی درندوں کی طرح چنگھاڑنے لگے۔ اس سماں کا مقابلہ آسان نہ تھا مگر سوبڈیگ اور ال پہلو میں نڈر دل رکھتے تھے۔ وہ اپنے کام میں مشغول رہے، صحن میں فریجہ دیوی اور فرے دیوتا سے جن کو دیوزاد گھیرے ہوئے تھے ان کی ملاقات ہوئی سوبڈیگ نے فریجہ کو گلے لگا لیا اور اس کا منہ چوم لیا فریجہ کو معلوم تھا کہ وہ سوبڈیگ کی دلہن ہوگی۔

---

[1] Teutonic Myths & Legends: Donald A. Mackenzie. ص ۶۴-۵۳

دیو نے فریجہ اور فرے پر منتر پڑھ کر پھونک دیا تھا جس کے باعث وہ لوگ فراموش کاری میں مبتلا تھے، ان کو ماضی کی یاد محض دھندلی سی رہ گئی تھی، وہ بدیعہ جمال کی دیوی تھی، لیکن جادو کے اثر سے اس کا حسن ماند پڑ گیا تھا۔ اس کی نرگس شہلا جیسی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان میں اب ایک نشاط انگیز سوگواری کے بدلے باطنی درد و حزن کی کارفرمائیاں تھیں، سوٹڈیگ اور ال کی آمد پر اُس کو خوش ہو جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہ ہوا، اس کا دل سرد پڑ گیا تھا اس میں ولولہ و جوش باقی نہ تھا۔

محل کے ایک بڑے وسیع کمرے میں دیوؤں کا اجتماع تھا وہ ان لوگوں کو دیکھ کر بہت غضب ناک ہوئے اور ان کو مار ڈالنا چاہا۔ دیوزاد جو فریجہ پر عاشق تھا میدان میں کودا۔ اور سوٹڈیگ سے مقابل ہوا ال نے اپنی شمشیر سے اُس کا خاتمہ کیا اس کے بعد لڑائی ہوئی اور ان دونوں بھائیوں کو کامیابی ہوئی۔ ان لوگوں نے فرے کو ساتھ چلنے کی ترغیب دی۔ لیکن اُس نے فرط ندامت سے انکار کیا اور کہا میں دیوتاؤں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ فریجہ کو لے کر روانہ ہوئے اور جادو کے سمندر سے پار ہو کر اس پہاڑ پر پہنچے جہاں ..ستھ.. ان لوگوں کا انتظار کر رہی تھی سوٹڈیگ سے فریجہ سرد مہری برت رہی تھی وہ نہ تو اپنے پسر و عاشق پر نظر التفات ڈالتی نہ کلام کرنے کے لئے لب ہلاتی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دیو کی قید سے نجات پانے کی نہ تو اسے خوشی ہے اور نہ وہ سوٹڈیگ کی ممنون نظر آتی ہے سوٹڈیگ کو فریجہ کی یہ ادائیں کچھ اچھی معلوم نہ ہوئیں اس نے غصہ میں آکر اس کو تنہا چھوڑ دیا فریجہ ماری ماری پھری یہاں تک کہ دیونیوں کی قیام گاہ

Marfat.com

تک پہنچی اُنھوں نے اس کو اپنی بکریاں چرانے کے لئے پکڑ لیا۔ سوپڈیگ کے دل میں فریجہ کی سچی محبت تھی، اُس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا فریجہ کے لئے اُس کا دل بھر آیا وہ اسکی تلاش میں روانہ ہوا، اس نے دیونی کی قید سے اُسے چھڑایا۔ پھر بھی فریجہ کی کم نگاہیاں بدستور قائم تھیں سوپڈیگ کی طرف نہ تو دیکھتی تھی نہ اسکی بات کا جواب دیتی۔ بیر دنے پھر اس کو تنہا چھوڑ دیا اور پہاڑ پر ماری پھری، اس کے بعد وہ ایک چڑیا کی شکل میں سوپڈیگ کے مکان میں پہنچی، ستہ نے اس کو نہیں پہچانا۔ فریجہ نے کہا میں ایک غریب خانہ خراب عورت ہوں۔ ستہ نے اس کی پذیرائی کی سوپڈیگ نے اس کو دیکھا اور پہچانا کہ یہ میری بیوی ہے۔ چنانچہ شادی کی رسوم رچائی گئیں۔ مگر فریجہ ابھی تک سرد مہر تھی۔ اس کے اندر کوئی ولولہ نہ تھا۔ دونوں عاشق و معشوق حجلۂ عروسی میں داخل ہوئے۔ فریجہ کے ہاتھ میں شمع تھی۔ شمع کی لو سے اس کا ہاتھ مس ہوگیا اور جلنے لگا۔ سوپڈیگ نے اُسے ہٹایا کیا لیکن اس کو کوئی تکلیف نہ تھی کیونکہ اس کے قلب میں زیادہ درد موجود تھا آگ سے دیو کے جادو کا اثر زائل ہوگیا فریجہ نے اپنا رُخ زیبا اٹھایا محبت بھری آنکھوں سے اپنے نجات دہندہ کو دیکھا۔ یہی وہ بہت بڑا انعام تھا جو سوپڈیگ کو ملا، اس کے بعد فریجہ غائب ہوگئی اور ایک باز کی شکل میں بمقام ،، ایسگارڈ ،، پہنچی۔

اس کے بعد اس افسانہ میں ایک دوسری جنگ کا منظر دکھایا گیا ہے اس منظر میں ،، ایڈن ،، دیوی اور اس کے تین عجیب و غریب سیب کا حال مذکور ہے اور دکھایا گیا ہے کہ کس طرح سوپڈیگ ،، ایرج ،، کے ،، تیغ خارا شگاف ،، کی طرح اُ

Marfat.com

طلسمی "شمشیر فتح" لے کر سفر کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جس میں مقام "اسگارڈ" کی فتح کا سماں پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ کا یہ حصہ بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ "شہزادہ اسد" "ملکہ مہ جبین کے عشق میں "طلسم ہوشربا" کی فتح کے لئے سرگرم ہیں سوہڈیگ کے ہاتھوں ایگارڈ فتح ہوتا ہے فریجہ ہمیشہ کے لئے اس کی ہو جاتی ہے۔

پھر دیوی کی وہی دلربائیاں ہیں اور وہی خوش ادائیاں جن کے لئے سوہڈیگ بیتاب تھا۔

گلیشیا کا بُت

جزیرہ قبرص کا بادشاہ پگمیلین جنگو سے زیادہ ایک بُت تراش کی حیثیت سے مشہور تھا اپنے فن کا وہ اس قدر دلدادہ تھا کہ اس نے شادی تک نہ کی۔ وہ کہا کرتا کہ کوئی عورت ایسی حسین نظر نہیں آتی جیسا اس کے ہاتھ کا بنایا ہوا انسانی پیکر۔ اس نے ہاتھی دانت کا ایک مجسمہ بنایا تھا اور بہت دقت صرف کرکے اپنی فنی مہارت سے اس کی تکمیل کی تھی وہ اس کو اس قدر عزیز رکھتا گویا وہ اس کے دل کی ملکہ بن گئی تھی، اس کی شیفتگی نے یہ صورت اختیار کرلی کہ وہ اب اپنی ساری متاع دنیوی لٹا کر چاہتا تھا کہ کسی طرح مجسمہ کے اندر ایک خوش خوبی کے ساتھ روح پیدا کردے سارے دن وہ محنت کرتا اور اس غیر ذی روح مجسمہ کی تکمیل جمال میں کھویا رہتا۔ ساری راتیں وہ اپنی بے بسی پر آہیں بھرتے گزار دیتا۔ کاش! اسے قدرت ہوتی اور وہ مجسمہ کے اندر خون وگوشت کی کمی پوری کرسکتا۔

اس مجسمہ کو وہ "گلیشیا" کے نام سے پکارتا تھا۔ صناع نے اس کو طرح طرح کے اسباب

Marfat.com

زینت سے آراستہ کیا تھا۔ گردن و بازو میں چمکتے ہوئے جواہرات آویزاں تھے۔ گوناگوں پھولوں کا ہار بنا کر سر پر پہنایا تھا لیکن مجسمہ پھر بھی مجسمہ ہی تھا۔ اس کی ساری دلربائیاں اس تصور سے رو رہی محض ایک تصویر ہے۔

پگمیلین کے فنی کمال نے تصور کی یہی گرہیں پیدا کر رکھی تھی۔ اس پیکر خموش کی تزئین و تجمیل اس کا وظیفہ صبح اور ورد شام تھا مگر اس کی گلیشیا زندگی کے آثار سے محروم ہی تھی اسی عرصہ میں جزیرۂ قبرص کی ایک بڑی دیوی "افروڈایٹ" کے میلہ کا زمانہ آیا۔ پگمیلین اس کے مندر میں حاضر ہوا۔ وہ نذر و نیاز کے لئے بہت سا قیمتی سامان ساتھ لایا۔ پرستش گاہ سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس نے بڑے خشوع و خضوع سے دعائیں کیں۔ اے ملکۂ عشق اس شخص پر رحم کر جو کہ اتنے زمانہ تک تیری قدرت کے سامنے سر نیاز خم کئے رہا ہمارے ہی ہاتھوں کے بنائے ہوئے مجسمہ کو میری دلہن بنا دے اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو پھر زمین کی کوئی ایسی عورت عطا کر جو ایسی ہی موہنی ہو جیسی میری گلیشیا ہے۔ پرستش گاہ سے آگ کا شعلہ بلند ہوا، اور تین مرتبہ اس نے ہوا میں لپکاریاں لیں۔ یہ اجابت دعا کا ایک اشارہ تھا۔ پگمیلین کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ وہ جلد جلد گھر کی طرف روانہ ہوا تھا کہ اس مجسمہ کے نزدیک کھڑا ہو جس نے سینکڑوں مرتبہ اس کی آنکھوں کو زندگی کا فریب دیا تھا۔ اس نے اپنا بازو پھیلاتے ہوئے "میری گلیشیا" کہہ کے پکارا۔ اس کی خوفزدہ حیرت نے آخر وہ سماں مشاہدہ کر ہی لیا جس کے لئے اس کی تمنائے دید ہمیشہ آشفتہ رہا کرتی تھی۔ اس نے بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہاتھی دانت کے مجسمہ میں ایک تغیر ہو رہا ہے اس کے سینے سے

Marfat.com

سانس کی آمد و شد نمایاں تھی۔ اس کی رگوں میں خون رواں دواں تھا۔ اس کی آنکھیں اب پتھریلی نہ تھیں جو ٹکٹکی باندھ کر اس کو دیکھا کرتی تھیں بلکہ ان سے تغافل و تمکین بھی ٹپک رہی تھی۔ یہ فریب نظر نہ تھا۔ اس نے مجسمہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور اس میں زندگی کی گرمی و نرمی محسوس کی۔ وہ نبض کی حرکت کا بھی احساس کر رہا تھا۔ وہ چہرہ کو دیکھ کر مسکرایا۔ مجسمہ نے بھی تبسم کیا۔ پگمیلین نے سلسلۂ سخن چھیڑا۔ گلیشیا کے ہونٹوں میں بھی جنبش ہوئی۔ اور وہ بھی تکلم نواز ہوئی۔ افروڈایٹ نے اپنا معجزہ دکھایا۔

زنانِ مصر

بابل اور اسیریا کی طرح مصری قوم کی خرافیات میں بھی زیادہ تر مذہبی عنصر کا غلبہ پایا جاتا ہے۔ وہی عالم آخرت کے متعلق دور از کار معتقدات اعبادت وریاضت موت وحیات کے مسائل پر خشک زاہدانہ رجحان اس مذہبی زندگی میں عورت کو بھی بہت بڑا درجہ حاصل تھا چنانچہ اکثر دیویوں کے نام خرافیات مصر میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً اُتِت (مرسکمنٹ) ہیتھر آئی سس نیتھ وغیرہ ان کے علاوہ برلن اور لندن کے عجائب خانوں میں بعض ایسے سنگین مجسمے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مصری قوم میں اور بھی جلیل القدر دیویاں گذری ہیں چنانچہ برلن میوزیم میں سیکمٹ دیوی کا مجسمہ ہے اور اس کا سر شیر کا ہے اسی طرح برٹش میوزیم میں باسٹ اور آئی سس کے مجسمے ہیں اول الذکر مجسمہ کا سر بلی کے ایسا ہے مصریوں کے عقیدہ میں ”نارس فریجہ“ بھی بلی کی شباہت رکھنے والی ہستی ہے

Marfat.com

اس کو "عشق کی دیوی" بتایا جاتا ہے۔ آئی سس کا مجسمہ بھی بہت اہم ہے۔ اسکی آغوش میں اسکا بچہ بھی دکھایا گیا ہے جو "ہورس" دیوتا کا بیٹا تھا مصر کے مختلف حصّوں میں دیویوں کے نام پر معابد پائے جاتے ہیں کنواری "بوٹو" بھی ایک دیوی تھی۔ مقام ہیرکلیو پولس میں نہیب کو (NAHEB-KAU) کا ایک مندر ہے اس کو ایک "ناگنی" بتایا جاتا ہے۔ جو اژدہا بھی کرتی تھی۔ مشہور مورخ ہیرودوتس مصر میں اکثر اس ناگنی دیوی کا چرچا سنا کرتا تھا لیکن باوجود تلاش بھی وہ اس دیوی کے دیدار سے مشرف نہ ہوسکا، کھیت میں ہل چلنے کے موقعہ پر غلہ افشانی کے قبل اس دیوی کی پوجا ہوتی تھی۔[1]

دمینتی

خرافیات ملل کا مطالعہ کرنے کے بعد انسان اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ یونان وفارس ذہنی اور شجاعانہ سربلندیوں، بابل واسیریا اپنے مذہبی افکار جاپان اپنے عشقیہ تصورات کے لئے مخصوص رجحان رکھتا ہے سرزمین ہند میں یہ ساری خوبیاں اپ یک جا پائیں گے۔ کالیداس کی "شکنتلا" ہرش کوی کی "نل دمینتی" عشقیہ افسانوں میں ایک خاص اثر کی حامل ہیں۔ دنیا کے اور قدیم افسانوں کی طرح یہ بھی نظم میں ہیں لیکن ایک خاص حسن ادا جو ان ہندوستانی افسانوں میں ہے وہ ان میں ہیروین کا کردار ہے ہندوستان بھی عورتوں کی پرستش میں دوسرے اقوام وملل سے کم نہیں "سرسوتی کو علم کی دیوی بتایا

---

[1] Egyptian Myth & Legend: Donald A. Mackenzie ص ۹۱-۱۹۰

Marfat.com

جاتا ہے۔ مہا بھارت میں ،، دروپدی ،، کا کردار اس کی عفت مآبی بہت اثر انگیز ہے
دریودھن کی چال بازیوں سے یدھشٹر ،، چوسر بازی ،، میں شکست کھاتا ہے۔ مخالف
جماعت کے افراد دروپدی پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اس موقع پر اس خاتون کا کردار نہایت
خوبی سے نمایاں کیا گیا ہے کالیداس کی شکنتلا میں عورت ہی اپنے شوہر کے پیچھے سرگرداں
ہوتی ہے۔ یہی حال افسانہ ،، نل ودمینتی ،، کا ہے۔ اس میں بھی دمینتی کا کردار بے حد اثر
آفریں اور عبرت انگیز ہے۔ راجہ نل اپنے بھائی پشکار سے تاج و تخت ہار جاتا ہے اور
تنہا جنگل کی راہ لیتا ہے۔ دمینتی اس کے پیچھے پیچھے جاتی ہے دونوں ایک سنسان
جنگل میں پہنچ جاتے ہیں۔ دمن تھک کر سو جاتی ہے۔ نل یہ خیال کر کے کہ اس کی محبوبہ
محض اس کے لئے حیران و سرگرداں ہو رہی ہے، اس کو تنہا چھوڑنا چاہتا ہے تاکہ وہ
اپنے باپ راجہ بھیم کے ہاں ،، ودھرب ۹۹۹۹ ،، چلی جائے۔ چنانچہ وہ رانی کو تنہا
چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ دمن نیند سے اٹھتی ہے اور نل کو نہیں پاتی ہے اس موقع پر دمینتی کا
جو والہانہ انداز پیش کیا گیا ہے اس کی نظیر مشکل ہے کسی غیر ہندوستانی عورت میں مل سکتی
ہے دمن روتی ہے چلاتی ہے۔ نل کو پکارتی ہے کبھی جھاڑیوں میں سماتی ہے۔ کبھی
درختوں کی بلندیوں پر نظر ڈالتی ہے اس کا جوش محبت طوفان خیز ہے۔ دیوانہ وار
کبھی سر بفلک پہاڑوں کو مخاطب کرتی ہے۔ کبھی موج مارنے والے دریاؤں سے نل
کا حال پوچھتی ہے۔ نل کی محبت اور اس کے شوق تلاش میں اس نے جتنی سخت مصیبتیں

Indian Myths & Legend . Don . d A. Mack .

Marfat.com

جمیلیں اور محبت میں ثابت قدم رہی اس نے عورت کا مرتبہ بہت بلند کر دیا افسانہ کے پلاٹ میں دمیتی کی سرفروشانہ زندگی، اس کی سوگوارانہ بادیہ پیمائی اس کا اٹل تصور محبت اس کا والہانہ انداز شیفتگی ایسی چیزیں معلوم ہوتی ہیں جو عورت کو مجسمہ ایثار و قربانی اور پیکر نور و تقدس بنا دیتی ہیں[1]

آرفیس و یوریڈایس

قدیم یونانیوں کی خرافیات میں یوں تو ہندوستان کی طرح دیوتاؤں اور دیویوں کے بہت سے عشقیہ افسانے ہیں لیکن "آرفیس اور یوریڈایس" کے افسانہ میں جس دردانگیز تاثر کی کارفرمائیاں ہیں اور افسانوں میں کم نظر آتی ہیں۔ افسانہ کا آغاز نہایت دلچسپ پیرایہ میں ہوتا ہے ابتداً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خاتمہ نشاط پر ہوگا لیکن آخر میں واقعات کچھ ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ افسانہ ایک المناک فاجعہ بن کر رہ جاتا ہے

آرفیس مقام تھریس کا رہنے والا تھا۔ قدیم زمانہ میں وہ بہت بڑا ماہر موسیقی مشہور تھا۔ اپالو دیوتا نے اس کو سونے کا ایک ستار دیا تھا۔ ستار لے کر کبھی وہ "کوہ المپس" کی وادیوں میں جہاں دیوتاؤں کا مسکن ہے، مارا پھرتا، اور کبھی "پارناسس" کے

---

[1] نل دمیتی کے افسانہ پر ایک بسیط مقالہ مرتب ہو چکا ہے جس کے ضمن میں فارسی مثنویوں پر ایک سرسری تبصرہ کیا گیا ہے اور فیضی کی سوانح زندگی اور اُس کی مثنوی "نلدمن" پر شرح و بسط کے ساتھ تنقید کی گئی ہے۔ یہ مقالہ "طاق لبستان" آرہ سے ملے گا۔

Marfat.com

صحراؤں میں بادیہ پیمائی کرتا جب وہ اپنا ستار چھیڑتا اور کمال فن کے ساتھ کوئی نغمہ گاتا تو صحرائی درندے سرڈالے مسحور ہو کر اس کے سامنے آجاتے آبشاروں کی روانیاں کم ہو جائیں اور پہاڑ کے چٹان اور جنگل کے درخت اس کی ترانہ بھی سننے کے لئے اس طرف کھنچ جاتے، آرفیس کی موسیقی سے وحشی انسانوں کا دل بھی ملایم ہو جاتا۔ یہ مغنی جو پتھر کے اندر بھی زندگی کی روح پھونک دیتا تھا ایک حسینہ "یوریڈایس" پر عاشق ہوا، اور اُسکو موہ لیا وہ بہادر بھی تھا۔ لیکن ان عاشق و معشوق کے عیش کی گھڑی بہت جلد ختم ہو گئی۔ یوریڈایس اپنی شادی کی تقریب میں رقص کر رہی تھی۔ ایک زہریلے سانپ نے جو گھانس کے نیچے چھپا ہوا تھا اس کو ڈس لیا اس لئے وہ اسی رات کو مر گئی جس رات کو اس کی شادی ہوئی تھی۔ غمناک شوہر نے اس کو دفن کر دیا۔ میت کے ساتھ جو لوگ تھے ان کا دل ہل گیا جب آرفیس اپنے درد و کرب کا مظاہرہ کرتا۔ آرفیس کو بھی زندگی تاریک معلوم ہونے لگی کیونکہ یوریڈایس ہمیشہ کے لئے اس سے چھوٹ گئی تھی۔ اس نے محبوبہ کی تلاش میں "ہیڈس" (Hades) کے دروازہ کا رُخ کیا۔ جس سے کوئی شخص اپنی موت سے قبل گذر نہیں سکتا، رستے میں کتنے خوفناک مناظر، کتنے روح فرسا اور جرأت آزما نظاروں سے اس کو واسطہ پڑا۔ اس تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ افسانہ نگار نے بڑی خوبی کے ساتھ آرفیس کو اس ہفت خوان کی آخری منزل تک پہنچا دیا جہاں "ہیڈس" کا بادشاہ اپنی ملکہ "پرسیفون" کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ یہاں اس سحر کار مغنی نے ایک خاص ماہرانہ انداز میں ایک نغمہ گایا۔ اور اس میں بادشاہ سے درخواست کی کہ آپ موت کی گرہ

Marfat.com

ڈھیلی کر دیجئے کیونکہ عشق نے مجھے اس نا قابل گذر منزل تک پہنچایا۔ جہاں میں اپنی زندگی میں نہیں پہنچ سکتا تھا سخت "پلوٹو" نے میری محبوبہ کو مجھ سے جدا کر دیا، میری محبوبہ مجھے واپس کر دی جائے جو اس قدر جلد مجھ سے چھوٹ گئی۔ یا پھر یہ ممکن نہیں تو ایک کے بدلے دو قربانیاں قبول کی جائیں۔ لیکن مجھے تنہا عالم آب و گل میں جانے نہیں دیا جائے۔"

سیاہ ابرو والے "پلوٹو" نے اس کی دعا پر اشارہ کیا۔ "پرسیفون" نے اپنے شوہر کے کان میں رحم کا کوئی کلمہ کہا ایک نرم و آہستہ آواز آئی، آرفیس کے ستار کی سحر کاریاں بند ہو چکی تھیں سارے عالم "ہیڈس" میں سناٹا تھا حکم ہوا کہ دنیا میں واپس جاؤ، اور "یوریڈایس" سایہ کی طرح تمہارے ساتھ ہو گی لیکن نہ کہیں ٹھہرو، نہ بات کرو اور نہ پیچھے مڑ کر دیکھو یہاں تک تم دنیا کی ہوا میں پہنچ جاؤ، ورنہ پھر تم اس کی صورت نہ دیکھ سکو گے اچھا اب ذرا دیر نہ کرو، روانہ ہو جاؤ، اور تم اپنے خموش رستہ میں تنہا نہیں ہو گے۔

آرفیس واپس جا رہا تھا رستہ میں نہ کہیں بولا، نہ ٹھیرا، "ہیڈس" کا دروازہ نزدیک ہو رہا تھا اور اس کی اُمید کا ستارہ آہستہ آہستہ زیادہ درخشاں ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب منزل قریب آگئی تو یکایک اس کے دماغ میں شبہ اور بے صبری کی تاریکی چھانے لگی اس نے فرط شوق میں سر گھمایا اور پیچھے دیکھا کہ وہ ہستی کفن میں لپٹی ہوئی چلی آرہی ہے جس پر وہ اس والہانہ انداز میں وارفتہ تھا، "میری یوریڈایس" کہہ کر وہ چلایا اور اپنی آغوش وا کر دی۔ اس کے بازو سے ٹھنڈے باریک بال مس ہو گئے صرف ایک آہ کی آواز آئی وہ صورت تاریکی میں غائب ہو گئی۔

Marfat.com

اب "یوریڈایس" اس عالم میں میسّر ہونے والی چیز نہ تھی۔ وہ کئی کئی دن بلا کھائے
ے بُت کی طرح پڑا رہتا۔ اب نہ تو اس کی نغمہ سنجیاں ہی باقی تھیں اور نہ تکلّم نوازیاں وہ
رسے جلد فاقہ کر کے مرنا چاہتا تھا کیونکہ یہی ایک صورت اب "یوریڈایس" کے وصل
باقی رہ گئی تھی آخر کار وہ اُٹھا اور انسانی آبادی کی طرف راہ لی وہ چپ چاپ چلا
رہا تھا اس کا ستار اس کے دل کی طرح شکستہ تار تھا۔ اس نے ساری خوشیوں کو تیاگ دیا
عورت پر نظر بھی نہیں ڈالتا حالانکہ اکثر لڑکیاں اس کو موہنے کے لئے مسکراتیں اور کہتیں
وہ اپنی گم شدہ "یوریڈایس" کو بھول جائے اس کے بعد تھریس کے پہاڑی جنگلوں میں
س نے بود و باش اختیار کر لی۔ وحشی جانور اس کے رفقاء تھے ع

خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

آرفیس زندگی کے دن اسی طرح گزار رہا تھا ممکن تھا وہ اپنے ستار پر "یوریڈایس
فراق میں غمناک ترانے گاتا کہ یکایک عورتوں کا ایک گروہ آیا وہ آ کر اس اجنبی کے
منے رقص کرنے لگیں لیکن آرفیس دہشت میں اُٹھ کر بھاگا اور ان کی وحشت زدہ
پر بھی مخاطب نہ ہوا۔ وہ عورتیں بے اعتنائی پر بڑی غضب ناک ہوئیں اور جس طرح
شکاری آہو کا تعاقب کرتا ہے اس کے پیچھے روانہ ہوئیں اور اُس کو پتھر سے مار کر
ے زمین پر گرا دیا اور اس کے ٹکڑے اُڑا دیئے اس کے ستار کو پارہ پارہ کر ڈالا۔
ور ہے کہ اس کا سر جس سے "یوریڈایس" کی آواز نکل رہی تھی جزیرہ لس بس، کے
ل پر بہتا ہوا آیا۔ یہاں اس کو ایک مقبرہ میں دفن کر دیا گیا اب یہ ایک مقدس

Marfat.com

زیارت گاہ ہے۔ یہاں بلبلیں ایسی سُریلی آواز میں ترانہ سنجیاں کرتی ہیں کہ اس کی مثال دوسری جگہ نہیں ملتی۔

اقوام و ملل کے یہ افسانے انسان کی معصومانہ فطرت کے حقیقی ترجمان ہیں۔ قدیم عورت کے تقدس کی نظیر دورِ حاضر کی تعلیم یافتہ عورت میں نہیں مل سکتی۔ آج عورت محبت کی حقیقی لذتوں سے محروم ہے۔ عہدِ قدیم کی عورت جس طرح آج بھی پرستش کی چیز سمجھی جاتی ہے اس کا حقیقی نظارہ اس زمانہ کی عورت کو خواب میں بھی میسر ہونے والی چیز نہیں وہ ہوسناکیوں کا شکار ہے "آہ" اور "واہ" کی ہنگامی شورشوں میں دواں دواں ہے اس کی آنکھیں اس وقت کھلتی ہیں جب وہ منزل سے بہت دور چلی جاتی ہے۔ اب تلافی مافات کی صورت اس کے سوا کچھ باقی نہیں رہتی کہ آسمان کے دور اور زمین کے سخت ہونے پر آنسو بہائے عہدِ حاضر کی عورت شعر کہتی ہے۔ عشقیہ افسانے لکھتی ہے۔ آسمان پر اڑتی ہے۔ دریا میں تیرتی ہے۔ حسن کے میدان مقابلہ میں اترتی ہے۔ الغرض مرد کے دماغ عقل و ہوش کے لئے اپنے اندر ایسے ایسے سامان جذب و کشش پیدا کرتی ہے کہ ناانصافی ہوگی اگر اس کی جدت طرازیوں اور ہنگامہ آرائیوں کی داد نہ دی جائے۔ لیکن کیا عہدِ حاضر کی کوئی تعلیم یافتہ عورت ایسی بھی ہے جو حقیقت میں "دیوی" کے مرتبہ تک پہنچ جائے۔ اور "ڈائنا" کے مندر کی طرح اس کے نام بھی ایک پرستش گاہ تعمیر کی جائے۔ جہاں ہزاروں مرد اور عورتیں اس کی قبر پر محبت

لہ خرافیات واساطیر ملل قدیمہ مرتبہ اے آر ہوپ ہنکرلیف ص ۱۲۷

Marfat.com

عقیدت کے پھول چڑھائیں۔

اہل امن و سکون آپ کس گھر میں پا سکتے ہیں جہاں عورت مقابلہ پردازو شناوری کی ڈگریاں لے کر جلوہ فروش ہو۔ اور اخبار و صحائف میں اپنی عشقیہ افسانہ نگاری اور عریاں غزل سرائی کی اشاعت کرتی ہو۔ یا پھر اس گھر میں جہاں عورت صبح سویرے سے اُٹھ کر رات گئے تک عبادت و تلاوت، بچوں کی پرورش و تربیت۔ خانہ داری کے نظم و نسق۔ مرد کی محبت و اطاعت میں سوگوار رہتی ہو۔ عورت سمجھتی ہے کہ اس کی حقیقی منزلت عوام میں مشہور ہو جانے اور اپنے ذوق شعر و ادب کی داد لینے میں مضمر ہے۔ درآنحالیکہ ایسی عورت نہ کبھی حقیقی عزت کی مستحق سمجھی گئی اور نہ اس کی تعلیم و تہذیب کی وجہ سے لوگوں نے اس کو پوجا۔ دنیا میں ہمیشہ نفسی تربیت اور مقدس کردار پرستش دنیا بش کی چیز سمجھا گیا۔ آج صفیہ و نور جہاں جمیلہ و عزت میلار کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن کیا ہمارے قلوب میں کوئی ارادت مندانہ جوش پیدا ہوتا ہے۔ مگر جب "مریم بصریہ" اور "عفیرۃ العابدہ" کا نام آتا ہے تو ہمارے دل ہلنے لگتے ہیں۔ اور معاً تقدس و بزرگی کے ایک خیالی پیکر کے سامنے ہماری گردن عقیدت جھک جاتی ہے۔ مریم بصریہ شہیدۂ محبت تھیں، کسی مجلس میں "محبت" کے موضوع پر بحث ہو رہی تھی۔ آپ کا دل محبت الٰہی سے روشن تھا آپ کا کلیجہ پھٹ گیا اور اسی مجلس میں جان دی۔ عفیرۃ العابدہ اتنا روئیں کہ بینائی جاتی رہی لوگوں نے کہا کہ نابینائی تو بڑی مصیبت ہے۔ آپ نے فرمایا خدا سے محجوب رہنا اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ ام علی، شیخ احمد بن نصرویہ (متوفی ۲۴۰ھ)

Marfat.com

کی اہلیہ تھیں، میاں بیوی دونوں خدا رسیدہ، بڑے گھرانے کی لڑکی تھیں۔ دولت بے
سے بہت لائی تھیں۔ سب کو خدا کی راہ میں لٹا دیا۔ حضرت ابو حفص فرماتے ہیں۔ عورتوں
کا تذکرہ مجھے ہمیشہ مکروہ معلوم ہوتا تھا مگر جب میں نے "ام علی" کو دیکھا تو میں نے سمجھا
"معرفت" خدا کی دین ہے، جس کو وہ دے۔ ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ فاطمہ
نیشاپوریہ قرآن مجید کے ایسے ایسے معانی بیان کرتیں کہ مجھ کو تعجب آتا تھا ابویزید بسطامی
فرماتے ہیں کہ تصوف کے جس کسی "مقام" کے متعلق میں نے ان سے تذکرہ کیا مجھے معلوم
ہوا کہ وہ پہلے سے اس سے واقف تھیں۔ حضرت فضیل بن عیاض بی بی شوانہ کے پاس
آئے اور عرض کیا کہ میرے لئے اللہ سے دعا کیجئے۔ بی بی نے فرمایا کہ تمہارے اور خدا
کے درمیان کوئی ایسی بات ہے کہ اگر دعا کریں تو قبول ہو جائے۔ حضرت فضیل چیخ
کر گر پڑے اور بیہوش ہو گئے "لبابۃ المتعبدہ" بیت المقدس کی رہنے والی تھیں۔ آپ
فرماتی ہیں کہ خدا سے مجھے شرم آتی ہے کہ وہ مجھے اپنے سوا کسی غیر میں مشغول دیکھے۔[۵]
شاعری کی تاریخ کا پتہ لگائیے۔ آپ کو اس کی تخلیق کی تہ میں عورت ہی کی چشم
ابرو زلف و خال کی کارفرمائیاں نظر آئیں گی موسیقی کے نشو و ارتقاء پر غور کیجئے عورت
اس کی اولین محرک ثابت ہو گی۔ بت تراشی کی ابتدا بھی اس کی قامت رعنا کی
مرہون منت ہے۔ اقوام و ملل کے افسانوں سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ فرائڈ کے
فلسفۂ تجدید سے اس کا ثبوت ملتا ہے

۵۔ نفحات الانس

Marfat.com

اسی صنف کی ایک ہستی نے مجھ سے بھی ادب کی یہ خدمت لی۔ ہر چند وہ اب ہماری آنکھوں سے ہمیشہ کے لیئے اوجھل ہو گئی۔ اس کی معصومانہ ادائیں محض ایک "یاد" ہو کر دل و جگر سے لپٹی ہوئی ہیں آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں لیکن نہیں پاتیں گزرے ہوئے ایام کی وہ رنگینیاں یاد آتی ہیں آہ! وہ پُرسکون اور پُرسرور لمحے، بھولی بسری باتیں بن گئیں۔ جینا بھی مرنے کی طرح کس قدر ناگزیر ہے۔ ہماری حسرت سنجیوں اور محرومیوں نے زندگی کو اسی سطح پر پہنچا دیا ہے۔

گرمیوں کے زمانہ میں دفتر سے تھک کر پسینہ میں شرابور آنا اور کسی کا بے تابانہ پنکھا لے کر دوڑنا اور اس وقت تک اسے ہاتھ سے نہ رکھنا جب تک نسیم کی طراوت بزنویں کی طرح بادکش کی سکون آفرینیاں رخسار و تن سے پسینہ کا آخری قطرہ جذب نہ کر چکی ہوں۔ کسی کا کبھی کبھی غصّہ میں آجانا اور تیور بدل کر باتیں کرنا اور کسی کا یک لخت چُپ سادھ لینا اور ابرو پر شکن تک نہ لانا۔ موٹے کپڑوں اور ٹوٹی ہوئی جھونپڑی میں بسر کرنا اور صبح و شام ایسی رنگین صحبتیں ——— رنگین اور معصوم صحبتیں ——— کہ دولت و امارت ——— کی بڑی سے بڑی قربانیاں بھی اس پر چڑھائی جا سکتی ہیں۔ کاش "پگملین" کی طرح بت تراش ہوتا اور "گلیشیا" کی طرح "انیرہ" کا بت بناتا کاش "آرفیس" کے غنل لحن و غنا کا ماہر ہوتا اور "ہیڈس" سے اپنی محبوبہ کو واپس لاتا۔ جو "یوریڈ ایس" کی طرح بہت جلد مجھ سے جُدا ہو گئیں ؎

تو مرغ خاص بری در وثاق پیر رسنے | چو طبل باز شنیدی بہ لامکاں رفتی

ہاں وہ اس دنیا کی چیز نہ تھیں اس سرزمین معصیت میں دیوتا اور دیویاں بسر کرنا پسند نہیں کرتیں۔ قدرت کا ایک کرشمۂ التفات تھا کہ اس بوریہ نشین کو اہل بابل کے ”انشار دیوی“ جیسی ”ملکہ زحلہ“ سے ہم آغوش کر دیا۔ ماضی کی وہ حقیقت اب افسانہ بن کر رہ گئی ہے۔

سچ ہے، زندگی تعبیر ہے ماضی کے خواب و خیال ہو جانے اور مستقبل سے وابستہ آرزو رہنے سے۔ فقط

Marfat.com